مکاتیب حالی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردو)

مقالہ نگار:

محمد مالک

ایم اے اردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور

۱۹۹۷ء

and Settings\SALEH
KAR\Desktop\Muhamm
Malik PhD
FinalThesis
2012\Logo.jpg not
found.

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جولائی ۲۰۱۱ء

مکاتیب حالی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

مقالہ نگار:

محمد مالک

یہ مقالہ

پی ایچ۔ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف ایڈوانس انٹگریٹڈ سٹڈیز اینڈ ریسرچ

(اردو زبان و ادب)

and Settings\SALEH
KAR\Desktop\Muhamm
Malik PhD
FinalThesis
2012\Logo.jpg not
found.

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جولائی ۲۰۱۱ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف ایڈوانس انگریٹڈ سٹڈیز اینڈ ریسرچ کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **مکاتیب حالی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ**

پیش کار: **محمد مالک** رجسٹریشن نمبر: 218-MPhil/Urdu/2005(Jan)

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان و ادب اردو

ڈاکٹر گوہر نوشاہی ____________________

نگران مقالہ

ڈاکٹر شندرہ منور ____________________

ڈین فیکلٹی آف ایڈوانس انگریٹڈ سٹڈیز اینڈ ریسرچ

میجر جنرل (ر) مسعود حسن ____________________

ریکٹر

____

تاریخ

اقرار نامہ

میں،محمد مالک حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے پی ایچ۔ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

محمد مالک

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز ،اسلام آباد

جولائی،۲۰۱۱ء

تصدیق نامہ

محمد مالک نے اپنا مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو) ''مکاتیبِ حالی تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' میری نگرانی میں لکھا ہے۔ یہ مقالہ تحقیقی اور تنقیدی دونوں حوالوں سے پی ایچ ڈی کے معیار کے مطابق ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ اس مقالے کو جانچ کے لیے بیرونی ممتحین کو بھجوایا جائے۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
تصدیق نامہ	iv
فہرست ابواب	v
مقالے کا دائرۂ کار	vii
Abstract	viii
مقالے کا مقصد	ix
اظہارِ تشکّر	x

باب اول

اردو میں مکتوب نگاری کی روایت عہد حالؔی تک	۱

باب دوم

مکتوبات حالی میں حالؔی کی شخصیت، احوال و آثار، خاندان، اساتذہ اور اولاد کا تذکرہ	۳۶
خاندانِ حالؔی کا شجرہ نسب	۷۳

باب سوم

مکتوبات حالؔی میں معاصرین حالی کا تذکرہ اور ان کے علمی، ادبی اور شعری کارناموں کی تفاصیل	۸۰

باب چہارم

مکتوبات حالی میں افکار حالی اور شعری نظریات ۱۱۵

باب پنجم

نثر حالی کا اسلوب اور حالی کی مکتوب نگاری ۱۴۹

باب ششم

حالی کے مکتوب الیہ ۱۷۸

باب ہفتم

حالی کے انیس نو دریافت اور غیر مدون مکاتیب اور چار غیر مدون تحریریں ۲۴۷

باب ہفشتم

مجموعی جائزہ ۲۹۶

کتابیات ۳۰۶

انٹرویوز (محترمہ صغری خاتون، پڑپوتی مولانا حالی) ۳۱۸

ملاقاتیں ۳۱۸

ٹیلیفونک گفتگو ۳۱۹

اشاریہ ۳۲۰

ضمائم ۳۲۳

مقالے کا دائرۂ کار

زیرِ نظر مقالے میں مولانا الطاف حسین حالؔی کو بحیثیت مکتوب نگار تاریخ ادب کا حصہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ بحیثیت شاعر، نقاد، سوانح نگار اور نثر نگار ان کے مقام و مرتبہ کا تعین ہو چکا ہے۔ اس مقالے میں مولانا کے مکاتیب کے حوالے سے ان کی سوانحی اور علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور وضاحت کی گئی ہے کہ حالی کی تخلیقی اور فکری شخصیت کس طرح مکاتیب میں ظاہر ہوتی ہے۔ مقالے میں عہدِ حالی کے ادبی منظر نامے کی عکاسی کی گئی ہے اور ان کے معاصرین کے تذکرے اور علمی و ادبی کارناموں کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ نثر حالی کا اسلوب اور ان کے شعری نظریات کو بھی مقالے کا موضوع بنایا گیا ہے اور وضاحت کی گئی ہے کہ حالی کی نثر ان کے ہم عصر ادباء سے کس طرح مختلف ہے۔

اس مقالے کی اہم بات یہ ہے کہ اس میں ۱۹ غیر مدون مکتوب جن میں ۲ غیر مطبوعہ بھی ہیں اور ۴ غیر مدون تحریریں شامل ہیں جن کی تلاش و جستجو میرے علمی و تحقیقی سفر کا حاصل ہیں۔ مولانا کے یہ خطوط جہاں مکاتیبِ حالی کی عددی تعداد میں اضافے کا سبب بنیں گے وہاں انھیں نئی دریافت کا درجہ بھی حاصل ہوگا۔ یہ حالی شناسی کے لیے اہم ماخذ ہیں۔

مقالے میں مکاتیب حالی کے مطالب پر تحقیقی و تنقیدی اہمیت کا محاکمہ بھی پیش کیا گیا ہے جو حالی کی شخصیت کے بعض اہم پہلوؤں کی نشاندہی کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے حالی کے شخصی کوائف پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

Abstract

In this dissertation, an attempt is made to (re)present Maulana Altaf Hussain Hali as a letter writer in the history of Urdu Literature since he has already been an established Urdu poet, critic, biographer and prose-writer. In this thesis, an analysis of Maulana's skills of biography and other literary writings is presented and, in this way, it has been emphasized that he is a very significant personality not only due to his literary works but also his letters. In this thesis, the perspective of Hali's literary era is given along with his contemporaries' commentaries and scholarly and literary achievements. Hali's prose style and poetic thoughts have also been discussed in this thesis and it has been explained as how Hali's prose is different from that of his contemporaries. A significant feature of this dissertation is that it includes his eighteen unedited letters including two of them unpublished and four unedited writings. The search and quest for such rare works is one among my endeavours in my maiden voyage of research and knowledge. These letters of Maulana would not only add their quantitative strength but also serve as a new discovery and vital sources of research on Hali. This dissertation also reviews the importance of the meanings, criticism and research on Hali's letters. They point towards some very important aspects of Hali's personality besides illuminating Hali's biographical details.

مقالے کا مقصد

مولانا الطاف حسین حالی اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔سرسید احمد خان کے رفقاء میں جس شخص کی سرسید نے دل کی گہرائیوں سے تعریف کی وہ مولانا الطاف حسین حالی تھے یہاں تک کہ حالی کی ایک تصنیف کوانھوں نے اپنی نجات کا ذریعہ بھی قرار دیا۔حالی نے نظم ونثر میں نام پیدا کیا لیکن دونوں اصناف کو اگر ساتھ ساتھ رکھا جائے تو یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی نثر ان کی شاعری پر فوقیت رکھتی ہے۔حالی اردو کے پہلے فکرِ تازہ اور ذہن جدید رکھنے والے نقاد تھے۔وہ علمی اور ادبی نقطۂ نظر سے بھی اپنے عہد کی ایک زندہ روایت تھے۔

حالی کی نظم ونثر کے متعدد مجموعے اور تالیفات منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں حالی کو تابناک حیثیت سے دیکھا جا سکتا ہے۔ایک پہلو جس کی کمی محسوس کی گئی وہ ان کی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو خود حالی کے زاویہ نظر سے دیکھنے کا عمل تھا۔ظاہر ہے کسی مصنف یا تخلیقی صلاحیت کے حامل شخص کے افکار ونظریات اس کی تحریروں میں چھپے بیٹھے ہوتے ہیں اور ہم ان کی خوشبو سے لکھنے والے کی شخصیت تک پہنچتے ہیں لیکن ایک چیز جو اسے براہِ راست اور بلاواسطہ قاری تک پہنچاتی ہے وہ اس کے خطوط اور مکاتیب ہوتے ہیں۔

حالی کے مکاتیب شائع ہوئے لیکن ان مکاتیب میں فنی، فکری اور تخلیقی حیثیت سے موجود حالی کا سراغ نہیں لگایا گیا۔زیرِ نظر مقالے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ حالی کی شخصیت اور تخلیقی کاوشوں کا سراغ حالی کی اپنی ذاتی تحریروں یعنی مکاتیب سے لگایا جائے۔ان مکاتیب میں حالی نے جس بے تکلفی، خلوص نیت اور دیانتداری سے اپنے آپ کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے وہ حالی کی دوسری تحریروں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ مکاتیبِ حالی کے محرکات، موضوعات اور رفلاسفی کو آسانی سے حالی کی اندرونی اور سوانح حالی کی بیرونی شہادتوں میں پیش کیا جائے۔

اظہارِ تشکّر

زیرِ نظر مقالا جو پانچ سال چھ ماہ کی انتھک محنت، عرق ریزی اور طویل سفر و مشکلات کے بعد مکمل ہوا۔ اللہ کریم کا شکر گزار ہوں جس کی توفیق اور لطف و کرم سے یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ ازاں بعد مقالے کے نگران اور استادِ محترم ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی نوازشات میرے شامل حال رہیں جنھوں نے مواد کی جمع آوری کتب کی فراہمی کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی کتب خانے سے استفادہ کرنے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی جس سے میری بہت سی مشکلات کم ہوئیں۔ دیگر اساتذہ جن میں ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر روبینہ شہناز (صدر شعبہ)، ڈاکٹر عابد سیال شامل ہیں کے تعاون کا ممنون ہوں۔

میرے اس علمی و تحقیقی سفر میں جن احباب کی معاونت میرے شاملِ حال رہی ان میں میرے دوست ڈاکٹر زاہد جاوید چیئر مین شعبہ سوشل ورک پنجاب یونیورسٹی لاہور، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر صدر شعبہ اردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، پروفیسر فرید احمد فیصل آباد، پروفیسر محمد یوسف میاں سرگودھا، ڈاکٹر نثار ترابی راولپنڈی، عثمان غنی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، مظفر اقبال ملتان۔ حالی کے شجرہ نسب کی تیاری کے لیے خاندان حالی سے خواجہ شاہد حسین، محترمہ عذرا افضال ایڈووکیٹ سرگودھا، خواجہ احترام حسین ساہیوال اور عمیر عثمانی اسلام آباد شامل ہیں۔

اس موقع پر ان لائبریرین صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے کتب کی فراہمی میں میری مدد کی۔ ان میں چیف لائبریرین گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، عبدالوحید ڈپٹی لائبریرین پنجاب یونیورسٹی، رانا محمد یعقوب ڈپٹی ڈائریکٹر اسلام آباد پبلک لائبریری، محمد طارق لائبریرین فیض الاسلام لائبریری، ضیاء اللہ کنٹونمنٹ لائبریری سے جناب احمد علی لائبریرین گورنمنٹ کامرس کالج راولپنڈی راجہ خلیق الرحمان۔ لائبریرین دیال سنگھ (لائبریری لاہور) پنجاب پبلک لائبریری لاہور، لائبریرین گورنمنٹ کالج اٹک، لائبریرین گورنمنٹ کالج مری، لائبریرین اقبال میونسپل لائبریری مری، لائبریرین گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد اور رفیق ناز، لائبریرین نیشنل بک

فاؤنڈیشن، اسلام آباد بھی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ان تمام احباب کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے کسی نہ کسی حوالے سے میری مدد کی۔

میں اپنی اہلیہ پروفیسر سلمیٰ، بچوں علیزے فاطمہ، محمد علی سندھو کے لیے دعا گو ہوں جن کو میری مصروفیت کی وجہ سے خانگی دقتیں برداشت کرنا پڑیں۔

آخر میں میں بہت محترم اور بزرگ ہستی اپنی والدہ صاحبہ کا شکریہ ادا کرنا لازمی سمجھتا ہوں جن کی دعاؤں، تربیت اور شفقت و محبت کے طفیل یہ سب ممکن ہوا۔

محمد مالک

جولائی ۲۰۱۱ء

مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) اردو ادب کی وہ شخصیت ہیں جنھوں نے اردو کے نثری وشعری ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ وہ اردو کے پہلے نقاد ہیں جو عالمی سطح پر روشناس ہوئے۔ پہلے سوانح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر اور ادبی مکتوب نگار کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ اردو تحقیق میں بھی ان کا حوالہ بڑا اہم ہے حالی کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں اردو ادب میں تحقیق کی بہترین روایت ہیں۔ حیات سعدی ۱۸۹۰ء یادگار غالب ۱۸۹۶ء حیات جاوید ۱۹۰۱ء اور تنقید میں مقدمہ شعرو شاعری اس سلسلہ کی یادگار کتابیں ہیں۔

مولانا حالی کو بحیثیت نقاد، سوانح نگار اور شاعر اردو ادب میں جو مقام حاصل ہے اس سے سب واقف ہیں۔ لیکن بحیثیت مکتوب نگار نا آشنا ہیں۔ زیر نظر مقالے میں مکتوب نگار کی حیثیت سے تاریخ ادب میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان خطوط کے ذریعے سوانح حالی بزبان حالی اور اس سوانح کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مولانا حالی نے اپنے خودنوشت حالات نواب عمادالملک بہادر کی فرمائش پر لکھے تھے۔ نواب صاحب کے ایک دوست جولندن میں رہتے تھے نے بذریعہ خط ان سے فرمائش کی تھی کہ مولانا حالی کے سوانحی حالات فراہم کیے جائیں۔ چنانچہ نواب عمادالملک نے حالی کے دوست مولوی عبدالحق کی وساطت سے حالی سے گزارش کی کہ وہ اپنے سوانحی حالات لکھ کر ارسال کریں۔ اس سلسلے میں حالی کا وہ خط نہایت اہم ہے جو انھوں نے ۷ مئی ۱۹۰۱ء کو مولوی عبدالحق کو لکھا جو مکتوبات حالی حصہ اول صفحہ ۱۴۱ میں درج ہے جس سے یہ

تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہ سوانحی حالات حالی نے خود لکھے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ’’نواب عمادالملک بہادر کی فرمائش جو بہت دن سے ہو رہی تھی میں نے اس کی تعمیل کر دی ہے اور اپنا مختصر حال اور جو امور انھوں نے استفسار فرمائے تھے بقدرِ ضرورت لکھ کر آج چار روز ہوئے ان کی خدمت میں بھیج چکا ہوں اگر آپ سے کبھی ملاقات ہو تو اس کا ذکر کر دیجیے گا اور یہ بھی پوچھیے گا کہ جو امور آپ دریافت فرمانا چاہتے تھے وہ سب اس تحریر میں بیان ہو گئے ہیں یا نہیں۔‘‘

یہ تحریر ان کے دیوان کے ذاتی نسخہ پر لکھ دی گئی۔ ازاں بعد جب ان کے مقالات انجمن ترقی اردو سے شائع ہوئے تو اس کو تحریر کو ان مقالات میں شامل کر دیا گیا۔ ان خطوط کے ذریعے سے ان کے معاصرین کے سوانحی حالات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کے علمی و ادبی کارناموں کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔

مولانا حالی کے عہد کے ادبی منظر نامے کی عکاسی اس مقالے میں موجود ہے۔ اور ان مکاتیب کی وساطت سے ان کی اصل حیثیت کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کے وہ نظریات جو مقالات حالی میں مبہم ہیں واضح ہو گئے ہیں۔ حالی کے اردو مقالات اور دیگر تصانیف میں ان کی شخصیت اور سوانح اس طرح سامنے نہیں آئے جس طرح مکتوبات میں آتے ہیں۔ ان کے ذریعے ان کی زندگی کے سربستہ راز وا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ خطوط ان کی زندگی میں جھانکنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ یہ معلومات کا بہترین خزانہ ہیں۔ جن میں حالی ایک نئے انداز سے سامنے آتے ہیں۔ حالی کے یہ مکاتیب ان کے افکار و نظریات اور گردوپیش کے حالات کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتے

ہیں اور بہترین تحقیقی ماخذ ہیں۔

مقالے کے آغاز میں خطوط کی اہمیت، انفرادیت اور مشاہیر ادب کی رائے میں ان کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ''عہد حالی تک مکتوب نگاری'' کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اردو کے اہم مکتوب نگاروں جن میں مرزا غالب، سرسید محمد حسین آزاد، نذیر احمد، شبلی، امیر مینائی، محمد علی اودلوی وغیرہ شامل ہیں کے خطوط کی خصوصیت اور ان کی علمی وادبی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ مرزا غالب سے پہلے فارسی کا رنگ اور پرتو اردو مکتوب نگاری میں نظر آتا ہے کو بھی مقالے میں پیش کیا گیا ہے۔ نیز مرزا غالب نے جس طرح خطوں میں نئے اسلوب پیدا کیے اور اپنی ذات کو بے تکلفی کے ساتھ پیش کرنے کے علاوہ مراسلہ کو مکالمہ کا سا انداز عطا کیا کو بھی احاطہ تحریر میں لایا گیا ہے۔ سرسید کے خطوط میں ان کی عام تحریروں کی طرح جو مقصدیت اور مدعا نگاری نظر آتی ہے کو بیان کیا گیا ہے۔

شبلی کے خطوط کی علمیت اور نذیز احمد کے مکاتیب کا ناصحانہ انداز جو موعظہ حسنہ میں نظر آتا ہے کو بھی مقالہ میں جگہ دی گئی ہے۔

حالی کی مکتوب نگاری جو اس مقالہ کا موضوع ہے پر تفصیلی اظہار خیال کے علاوہ ان کے مجموعہ ہائے مکتوبات کی تفصیل وضاحت ان کی اہمیت قدر وقیمت اور خصوصیت اہل علم وادب کے اظہار کے ساتھ کہ وہ کس طرح عام آدمی کے ذوق کی چیز بن جاتے ہیں مقالے میں موجود ہے۔ خطوط غالب اور حالی کے خطوط کا موازنہ جو محترمہ صالح عابد حسین نے کیا ہے کے علاوہ دونوں کے خطوط کا مجموعی تاثر اختصار کے ساتھ درج ہے۔ مرزا کے خطوط میں جو شکوہ پائے روزگار، زمانے کی ناقدری، بڑھاپے کا رونا، بادشاہوں کے دربار تک رسائی، بے تکلفی وغیرہ ہے۔ اس کو اور مولانا حالی کے خطوط میں جو سادگی، قناعت پسندی، روانی وسلاست اور درد دل ہے کو بیان کرنے کے علاوہ مختلف حوالوں سے بحث کی گئی

ہے۔ان مکتوبات کی جمع آوری مطالعہ حالی کے لیے اہم اور نئے در کھولنے کا سبب بنے گی۔

زیرِ نظر مقالے میں حالی کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جو ان کو ہم عصر ادباء اور شعراء سے نمایاں کرتے ہیں۔ وہ نقاد، ادیب اور شاعر ہونے کے باوجود اپنی علمی ادبی اور سماجی زندگی جذباتی نہیں تھے بلکہ حقیقت پسندانہ طرز فکر کے حامل سنجیدہ اور بہترین انسانی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے احوال وآثار، اساتذہ، اولاد کے تذکروں کے علاوہ ان کے معمولات زندگی تعلم شاعری نواب محمد مصطفٰے حان شیفتہ کے ہاں قیام اور ان کے بچوں کی اتالیقی کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ بیان حالی کے مطابق ان کی ولادت وطن تعلیم وتربیت دہلی کے قیام کا زمانہ غالب کی شاگردی پھر مولانا حالی کا لاہور آنا پنجاب بک ڈپو میں ملازمت لاہور میں محمد حسین آزاد کے ساتھ مل کر نئی طرز کے مشاعروں کی بنیاد جس میں طرح مصرع کی بجائے نظم کا عنوان دیا جاتا تھا اور مولانا کی اس زمانے کی نظم نگاری اور نیچرل شاعری پر اظہا خیال بھی اس مقالے میں کیا گیا ہے۔

ان خطوط سے حالی کا اینگلو عربیک سکول دہلی میں ملازمت کی پیشکش اور لاہور سے دہلی روانگی کی تفصیلات کے علاوہ ان کے وہ اشعار جو انہوں نے قیام لاہور کے دوران اکتاہٹ کے عالم میں لکھے تھے کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

حالی کی سادگی اور انسان دوستی جو ان کی ذات کا خاصہ تھی کو ان کی ہم عصر شخصیات اور اہل علم وادب کی رائے کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔جس سے ان کی ذات کا مجموعی تاثر سامنے آتا ہے۔علاوہ ازیں ان مکتوبات کے ذریعے جو ان کی شخصیت ابھرتی ہے کو سامنے لانے کی کاوش کی گئی ہے۔جس سے ان کی مکمل سوانح مرتب کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

تصانیف حالی کی تفصیلات جن میں رسائل، مذہبی اور اخلاقی نوعیت کی کتابیں اور تراجم شامل ہیں کی فہرست پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تنقید، شاعری، نظم ونثر، سوانح نگاری اور مکتوب نگاری کے حوالے سے ان مطبوعات کے زمانہ اشاعت اور مقام اشاعت کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ مولانا حالی مذہبی خیالات وافکار کے حامل شخص تھے۔ جن کی عکاسی ان کی ابتدائی تصانیف مذہبی رسائل وکتب سے بھی ہوتی ہے۔ اور شخصی کوائف سے بھی۔ ان کے بارے میں اس مقالے میں تفصیل دی گئی ہے۔ مولانا کو فارسی، عربی زبان پر بھی دسترس حاصل تھی۔ جس کا اندازہ ان کی تحریروں سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً وہ خطوط جو انھوں نے حضرت شاہ عبدالغنی قدس سرہ کی خدمت میں عربی قصیدہ کے ساتھ مدینہ منورہ بھیجے یہ ان کی عربی دانی کی واضح دلیل ہیں۔ مکاتیب حالی میں سات عربی اور آٹھ فارسی خطوط ہیں جو علمی وادبی نوعیت کے ہیں۔ اس کے علاوہ کلیاتِ نظم حالی میں ان کا فارسی کلام بھی قابلِ توجہ ہے۔

ان کی تصانیف میں وہ رسالہ بھی شامل ہے جو مبادی علم جیولوجی کے نام سے ہے۔ جو فرانسیسی سے عربی میں ترجمہ ہوا تھا اور جس کو مولانا حالی نے اردو زبان میں ترجمہ کیا یہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ جس کا سن اشاعت (۱۸۸۲ء) ہے۔

حالی کے بارے عموماً کہا جاتا ہے کہ وہ منطق سے خالی ہیں۔ ان کے خطوط کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ شاعر اور نثر نگار کے علاوہ ایک دانشور کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ جو تقریبات، مکلیز میں شرکت کے علاوہ وہ مختلف شعرا ادبا علمی اور صحافتی شخصیات کی راہنمائی کے علاوہ ان کو مشورہ اور رائے دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیاں میں بھی شامل رہے ہیں۔ وہ آل انڈیا تعلیمی کانفرنس منعقدہ کراچی ۱۹۰۵ء میں کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ حالی علی گڑھ کالج کے اس وفد میں بھی شامل تھے جو سرسید کے ہمراہ نظام حیدر آباد سے ملاقات کے لیے گیا۔ علی گڑھ کالج کے

قیام کے وقت جب یہ بحث چل رہی تھی کہ یہ کالج کس شہر میں قائم کیا جائے۔ تو اس وقت مولانا حالی نے رائے دی کہ جغرافیائی اور موسمی اعتبار سے علی گڑھ اس کالج کے قیام کے لیے موزوں ترین جگہ ہے۔ خواجہ ضیا الدین دہلوی اور سبحان بخش شکار پوری بھی ان کی رائے کے ساتھ متفق تھے۔ حالی کی نثر ان کے دیگر ہم عصروں سے کئی اعتبار سے مختلف ہے۔ حالی کی نثر کا سر سید شبلی نذیر احمد کی نثر کے ساتھ موازنہ کرنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ حالی ہی وہ ادیب ہیں جن کا نثری اسلوب اگلی نسل کے لیے نمونہ قرار پایا۔ اس لیے کہ جو آسانی اور روانی اس میں تھی وہ سر سید، شبلی، آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد میں نسبتاً کم تھی۔

حالی اپنی شخصیت کے اعتبار سے منکسر المزاج تھے۔ ان کے مکاتیب میں یہ انکسار ایک خاص لطف دیتا ہے۔ مکاتیب میں وہ ایک باوقار اور متین شخص کے طور پر متعارف ہوتے ہیں۔

حالی اردو نیچرل شاعری کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے روایتی اور غیر آفادی شاعری کے برعکس اردو میں نیچرل اور قومی شاعری کی طرف توجہ دی اور نظم نگاری کو فروغ دیا۔ وہ قدیم طرز سخن کے حصار سے نکل کر جدید شاعری کی طرف گامزن ہوئے اور مبالغہ سے پاک سیدھی سادی زبان کو فروغ دیا۔ زیر نظر مقالے میں حالی کے شعری نظریات وافکار کو ان کے خطوط کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اور مکاتیب سے مثالیں دی گئیں ہیں۔ حالی نے معاشرتی اصلاح اور ترقی کے لیے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا۔ وہ تقلید کے قائل نہ تھے۔ وہ ادب میں اپنی الگ پہچان اور فکر رکھتے تھے۔ مقدمہ میں انہوں نے شعر کی ماہیت اور نیچرل شاعری پر اظہار خیال کے علاوہ یہ بتایا کہ وہ کون سی خوبیاں ہیں جو ایک شاعر کو عام آدمی سے ممتاز کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے مغربی ادب سے کئی مثالیں دیں ہیں جن سے ان کے گہرے مشاہدے اور مطالعہ کی عکاسی ہوتی ہے۔ ان کو اصلاحی اور قومی شاعری کے تناظر میں بھی دیکھا گیا ہے۔

اس مقالہ میں خاندانِ حالی کی تفصیل کے علاوہ ان کا شجرہ نسب بھی موجود ہے جو خاندان حالی کے ایک اہم رکن خواجہ شاہد حسین (جو سرگودھا میں مقیم ہیں) کی وساطت سے مرتب کیا گیا۔اس کے علاوہ خاندان حالی کی پاکستان میں نشاندہی کی گئی ہے۔ جواب لاہور، اسلام آباد، سرگودھا، ساہیوال اور کراچی میں مقیم ہے اس کی تفصیل شجرہ مذکورہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔اس سلسلے میں مولانا حالی کی پڑپوتی مسماۃ صغریٰ خاتون (مقیم اسلام آباد) کے ساتھ راقم کی ملاقات خاص اہمیت رکھتی ہے۔اس سے انٹرویو ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

مقالے کا سب سے اہم باب حالی کے غیر مدون/غیر مطبوعہ خطوط اور تحریریں ہیں۔اس مقالہ میں ۱۸ غیر مدون جن میں دو غیر مطبوعہ خطوط بھی ہیں شامل ہیں۔ چار غیر مدون تحریریں مقالہ کا حصہ بنا کر مطالعہ حالی میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ اہم مکاتیب آئندہ کے محقق کے لیے نئے امکانات پیدا کرنے کا سبب بنیں گے۔ان خطوط سے مکاتیب حالی کی عددی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا ہے۔ جن شخصیات کے نام یہ خطوط لکھے گئے ہیں ان میں رضا علی وحشت کلکتوی، سید افتخار عالم مارہروی مولف ''حیات النذیر'' مولوی سید احمد دہلوی مولف ''فرہنگ آصفیہ'' حبیب الرحمٰن خان شروانی، وقار الملک مولوی مشتاق حسین، نواب عماد الملک، سید حسین بلگرامی، مولوی قمر علی اور منشی نجم الدین ہیں۔ ایک خط انجمن پنجاب کے نام ہے۔

غیر مدون تحریروں میں پہلی ان کا وہ مضمون بھی ہے جو انہوں نے مدرسہ طبیہ دہلی کے سالانہ اجلاس ۱۹۰۳ء میں پڑھا تھا۔ یہ طویل مضمون ہے جو فن طبابت اور اس کی اہمیت پر مولانا نے لکھا۔اس میں طب مشرق کی افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مغربی اور مشرقی طب کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔

دوسری تحریر بیگم اختر بانو سہروردیہ والدہ حسین شہید سہروردی کی کتاب ''میلاد النبی سوم بہ کوکب

دری'' پر تقریظ ہے۔ یہ کتاب میلادالنبیؐ کی اہمیت پر لکھی ہے۔ بیگم صاحبہ کے اس کام کو مولانا نے سراہا ہے۔

تیسری تحریر مولانا کی اس تقریظ پر مشتمل ہے۔ جو حکیم محمد شریف کی کتاب ''علاج الامراض'' پر مولانا حالی نے لکھی تھی حکیم محمد شریف حکیموں کے مشہور خاندان ''خاندان شریفی'' کے نامور حکیم تھے جو فن طبابت کے حوالے سے برصغیر میں نامور سمجھا جاتا تھا۔ یہ فارسی زبان میں ہے۔ اور اس میں فن طبابت کی اہمیت بیان کی ہے۔

۱۸۸۲ء میں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، حالی نے مبادی علم جیولوی کے نام سے ایک عربی رسالے کا اردو ترجمہ کیا یہ پہلے رسالہ فرانسیسی سے عربی میں منتقل کیا گیا تھا۔ حالی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا یہ مولانا حالی کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے۔

جن اہم معاصرین حالی کے سوانحی حالات، ان کی اہم تصانیف اور علمی وادبی کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں منشی رحمت اللہ رعد، مالک نامی پریس کانپور، محمد عبدالرزاق کانپوری مولف البرامکہ، مولوی وحیدالدین سلیم، امیر مینائی، داغ دہلوی، سر سید احمد خان، مرزا غالب، مولوی بشیر الدین، مولوی محمد عزیز مرزا، منشی محبوب عالم، عبدالحلیم شرر، مولانا ظفر علی خان، مولوی سید امتیاز علی، مولوی ذکا اللہ، سید سلمان ندی، سید احمد دہلوی، حبیب الرحمٰن شروانی، آغا شاعر دہلوی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور وحشت کلکتوی شامل ہیں۔ ان اشخاص کی علمی وادبی حیثیت پر اظہار خیال کے علاوہ ان کے کارناموں کی تفصیل بھی درج کی گئی ہے۔ آخر میں مقالے میں مذکور شخصیات، کتب اور مقامات کا اشاریہ ہے۔

نتائج تحقیق

میری رائے میں حالی کے مکاتیب کواس زاویہ سے دیکھا جائے کہ ان مکاتیب میں حالی کا عہد نمایاں ہو۔ ان خطوط میں بہت سے نکات پوشیدہ ہیں۔ جن میں سے موضوع پر کام ہونا چاہیے۔ اس طرح یہ مکتوبات نئے امکانات پیدا کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔

باب اول

اردو مکتوب نگاری کی روایت عہدِ حالی تک
اور حالی بحیثیت مکتوب نگار

اردو مکتوب نگاری بھی دیگر اصناف ادب کی طرح فارسی کے زیر اثر اردو میں رائج ہوئی۔ رقعات عنائت علی، انشائے ہنر افروز اور انشائے سرور وغیرہ ان میں فارسی اسلوب کا عکس نظر آتا ہے۔ فارسی مکتوب نگاری کا آغاز ایران سے ہوا اور اس پر عربی کے اثرات نظر آتے ہیں لیکن چونکہ ایک زمانے میں برصغیر میں فارسی سرکاری زبان کے طور پر رائج تھی لہٰذا فارسی مکتوب نگاری کو حکومت کی سرپرستی بھی حاصل رہی۔ اس طرح اس صنف کو پروان چڑھانے میں برصغیر کے مکتوب نگاروں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شروع میں خطوط میں شاہی آداب اور شان و شوکت کو مدنظر رکھا جاتا تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان خطوط میں ادبیت کا رنگ بھی شامل ہو گیا اور مکتوب نگاروں میں اس رجحان کو فروغ ملا کہ ان کے خطوط کو ادبی خطوط کے طور پر بھی تسلیم کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ابوالفضل کے رقعات کو اس کا اولین نمونہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ صوفیانہ مکتوبات بھی اہم تصور کیے جاتے ہیں جن میں حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات شامل ہیں۔ برصغیر میں ذاتی اور سرکاری خطوط فارسی میں ہی لکھے جاتے تھے۔ اردو زبان کی ترقی کے لیے جب کوششیں جاری تھیں تو اس صنف کو بھی اردو میں رائج کیا گیا اور اردو خطوط نگاری کا آغاز ہوا لیکن انداز بیان، عبارت اور اسلوب میں فارسی رنگ کا غلبہ نظر آتا ہے۔

مرزا غالب اردو کے پہلے مکتوب نگار ہیں جنھوں نے پرانی روش کو ترک کر کے مکتوب نگاری میں جدت پیدا کی۔

انسان کے شخصی و ذاتی اظہار کا ذریعہ شاید خطوط سے بہتر کچھ اور نہ ہو۔ خطوط میں ذات کے ابلاغ کے ساتھ ایک اور اہم بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں تکلفات اور بناوٹ کی آمیزش بہت کم ہوتی ہے۔ یہ نہ صرف زبان دانی کا ذریعہ بنتے ہیں بلکہ اہل علم و دانش کے فنی کمالات کا کھوج لگانے میں بھی اہم کردار ادا کرتے

ہیں نیز انسان کے احساسات اور فکر تک رسائی کے لیے مکاتیب نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔

بقول مولوی عبدالحق:

''ادب میں سینکڑوں دلکشیاں ہیں اس کی بے شمار راہیں اور ان گنت گھاتیں ہیں لیکن خطوں میں وہ جادو ہے (بشرطیکہ لکھنا آتا ہو) جو اس کی کسی اور ادا میں نہیں۔''(۱)

خطوط کے ذریعے کسی انسان کی سیرت و کردار کا اندازہ بھی کسی حد تک کیا جا سکتا ہے اور اس کی ذاتی زندگی کے بہت سے بے نقاب گوشے بھی منور ہو جاتے ہیں۔ بعض مکاتیب جو دوستوں اور احباب کو لکھے جاتے ہیں وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ ان میں لکھنے والے کی شخصیت اور طبیعت کا عکس زیادہ واضح اور صاف نظر آتا ہے اس کی سماجی زندگی اور ادبی میلانات بھی سامنے آتے ہیں علاوہ ازیں اس کی وابستگیاں بھی ظاہر ہوتی ہیں بلکہ بسا اوقات مکتوب نگار مکتوبات میں اپنی کمزوریوں اور ناہمواریوں کا ذکر بھی کر جاتا ہے اس سلسلے میں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''خطوط اور مکاتیب ہر شخص کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنے کے لیے نہایت عمدہ اور بڑی حد تک قابل اعتماد سرمایہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکابر و مشاہیر کے خطوط فراہم کرنے کی طرف اربابِ علم و ادب ہمیشہ بہ اہتمام خاص متوجہ رہے اور اس سرمایے کو ادبیات و سیر کا بڑا قیمتی اندوختہ سمجھا جاتا ہے۔''(۲)

اس میں شک نہیں کہ خطوط کے ذریعے اپنے عزیز و اقربا سے دل کی باتیں بڑے بے تکلف انداز میں کی جا سکتی ہیں اور اپنے فکر و احساسات اور جذبات کو ان تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ خطوط کو اس بنا پر بھی امتیاز حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ باتیں جو دیگر اصناف سخن یا ادب میں ملفوف انداز میں کی جاتی ہیں خطوط کے ذریعے کھل کر سامنے لائی جا سکتی ہیں اس سلسلے میں معین الدین احمد انصاری لکھتے ہیں:

''ایک اچھے خط کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ جو خیالات مکتوب نگار کے ذہن میں

پیدا ہوتے ہیں وہ بلا تصنع ان کو بیان کر دیتا ہے۔"(۳)

خطوط کی اہمیت اس لیے بھی واضح ہے کہ مشاہیر ادب کے خطوط میں گذشتہ زمانے کا تاریخی، علمی، ادبی اور سوانحی مواد بھی میسر آتا ہے۔اس کے علاوہ بعض شخصیات کے خطوط نہ صرف ان کی ادبی پہچان بن جاتے ہیں بلکہ ان کے عہد کی علمی و ادبی تحریکوں تک رسائی بھی فراہم کرتے ہیں۔بعض خطوط پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خط لکھنے والے کی زندگی کے واقعات کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔کیونکہ لکھنے والا بڑی بے تکلفی سے لکھتا ہے اور کئی اہم واقعات کو کاغذ پر منتقل کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض مشاہیر ادب کے خطوط انہی خوبیوں کی بنا پر ادب عالیہ میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔

بقول ڈاکٹر سید شاہ علی:

"خطوط کی ایک صنف ایسی ہے جو دنیا میں عام طور پر رائج رہی ہے۔اسے مغرب و مشرق میں یکساں اہمیت حاصل رہی ہے۔"(۴)

بعض ادبی تخلیقات میں مصنف کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے لیکن ادبی خطوط میں مصنف کی ذات اور اس کا عہد نمایاں ہوتا ہے۔عام تحریروں اور تصانیف میں آورد کار فرما ہوتی ہے۔مصنف اپنے اصلی جذبات کو کھلے انداز میں پیش نہیں کر سکتا اس کے جذبات تہہ میں چھپے ہوتے ہیں جبکہ خطوط میں اگر چہ وہ بات صرف مکتوب الیہ سے ہی کرتا ہے لیکن کھل کر کرتا ہے اور احساسات اور فکر کو سامنے رکھ دیتا ہے۔خانگی مکتوبات میں اپنے روزمرہ کے معمولات مصروفیات صحت طبیعت معاشی سماجی اور معاشرتی امور بھی بیان کیے جاتے ہیں۔خطوط میں گفتگو تحریری انداز میں کی جاتی ہے اس لیے اس میں خیالات کے ساتھ جذبات بھی ہوتے ہیں اور مکتوب نگار کے لکھنے کا انداز اس کی تحریر اس کی شخصیت کا اظہار بھی ہوتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو لکھنے کا سلیقہ کہاں تک ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اردو خطوط نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"کسی انسان کی گفتگو اس کی شائستگی کی علامت ہوتی ہے اور یہ سچ بھی ہے مگر اس سے بڑی علامت اس کی شائستگی اور تہذیب کی یہ ہے کہ اس کو خطوط نگاری کا سلیقہ

کہاں تک ہے۔''(۵)

مکتوبات کے ذریعے کی جانے والی گفتگو میں اجنبیت اور غیریت ختم ہو جاتی ہے اسی لیے خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے۔

اردو خطوط نگاری چونکہ فارسی سے اردو میں آئی اس لیے اس میں اس طرح کے القاب و آداب، انداز تکلم اور اسی طرح کی انشا پردازی کا سلیقہ نظر آتا ہے اور اسی طرح کا آغاز و اختتام بھی ان خطوط میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اردو خطوط نگاری کے ابتدائی دور میں مشکل انداز اپنایا گیا لیکن کچھ دیر بعد سادگی کے رجحانات نے جنم لیا جن کے نمونے انشائے سرور وغیرہ میں ملتے ہیں۔

اردو میں خطوط نگاری کا باقاعدہ آغاز ۴۹۔۱۸۴۸ء میں ہوتا ہے۔ اردوئے معلیٰ عود ہندی اس کے اولین مجموعوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اردو خطوط نگاری کی نئی طرز کے موجد مرزا اسد اللہ خان غالب ہیں جنھوں نے اپنے دلکش انداز بیان، طرز تحریر اور بے تکلف مکالمے کے ذریعے اس فن میں کمال حاصل کیا اور اردو نثر کو ایک نئی طرز نگارش سے روشناس کروایا۔ مرزا غالب کے خطوط میں ان کی ذاتی زندگی کا رنگ اور بے تکلفی نظر آتی ہے۔ غالب کے خطوط ان کی زندگی میں ہی شائع ہو گئے تھے ان خطوط میں ان کی ذات، حالات، مسائل، مشکلات، معمولات، ملازمت حتی کہ مئے نوشی اور عشق بازی تک کا ذکر ملتا تھا۔ ان کا انداز مکالمے کا سا ہے۔ وہ ایک کامیاب مکتوب نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ ان خطوں میں ایک طرف جہاں مرزا کے حالاتِ زندگی نظر آتے ہیں دوسری طرف ان کا برجستہ، شوخ ظرافت بھرا اور بے باک انداز بیان جھلکتا نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے بقول: ''ان خطوں میں انھوں نے اپنی روح بھر دی ہے۔''(۶)

مرزا کے خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق کی یہ رائے حقیقت پر مبنی ہے مثلاً مرزا کے اس خط کا اقتباس دیکھیے جس میں ان کے طرز تکلم اور انداز بیان کی خوبیاں اجاگر ہوتی ہیں۔ یہ خط انھوں نے اپنے دوست مرزا حاتم علی مہر کی محبوبہ کے انتقال پر لکھا۔

''ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہو۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر

کی۔ابتدائے شباب ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہم کو زہدوورع منظور نہیں ہم مانع فسق وفجور نہیں۔پیو کھاؤ،مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو۔سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا۔کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔کیسی اشک فشانی،کہاں کی مرثیہ خوانی،آزادی کا شکر بجالاؤ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور قصر ملا اور ایک حور ملی اقامتِ جاودانی ہے اور ایک نیئے بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔اس تصور سے جی گھبراتا ہے،کلیجہ منہ کو آتا ہے،ہائے ہائے وہ حور اجیرن ہو جائے گی طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔وہی زمردیں کاخ اور طوبی کی شاخ چشم بددور وہی ایک حور۔بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔

زنی کن تو اے دوست در ہر بہار

کہ تقویم پارینہ تاید بکار (۷)

درج بالا مکتوب سے مرزا غالب کے نگارش اور بے باک گفتگو کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

غالب نے جب لکھنا شروع کیا تو اس وقت اردو نثر میں دو اسلوب موجود تھے ایک سادہ اور عام فہم اسلوب اور دوسرا مسجع و مقفٰی اسلوب جس میں تشبیہات و استعارات کا استعمال کر کے عام قاری کے لیے پیچیدہ بنا دیا گیا تھا۔فورٹ ولیم کالج کے زیر انتظام جتنا بھی نثری سرمایا لکھا گیا وہ سادہ سلیس اور عام فہم تھا چنانچہ مرزا نے سادہ اسلوب کو اپنایا اور اپنے خطوں میں سادہ اور سلیس اسلوب کو ہی اختیار کیا۔اس کے ساتھ ساتھ اس میں ادبی رنگ اور فنی رچاؤ پیدا کیا جس نے ان کی مکتوب نگاری کو یادگار بنا دیا۔علاوہ ازیں انھوں نے طرز تخاطب بھی سادہ اور عام رکھا۔

مرزا غالب کے طرز تحریر کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو بڑی بے تکلفی کے ساتھ پیش کرتے

ہیں اور اپنے خطوں میں اپنی ذات کی بشری کمزوریوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔وہ مختلف واقعات کا اظہار بھی اس طرح کر جاتے ہیں کہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کو کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔مرزا غالب کی مکتوب نگاری اور طرز نگارش کے حوالے سے غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

> ''ادب میں یہ مقام بلند ہر صاحب تحریر اور ہر اہل قلم کو میسر نہیں آتا۔لفظوں کو جوڑ کر فقرے تیار کر لینا یا پیش نظر مطالب کو الفاظ کا لباس پہنا دینا آسان ہے لیکن لفظوں کی معنویت کے حقائق کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے ان سے موقع اور محل پر کام لینا سہل نہیں۔''(۸)

چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مکتوب نگاری میں مرزا غالب کو نہ صرف اہم مقام حاصل ہے بلکہ جدید مکتوب نگاری میں اولیت کا شرف بھی رکھتے ہیں۔

اردو کے مکتوباتی ادب میں غالب کے بعد اردو مکتوب نگاروں کی تعداد بڑھتی گئی اور مشاہیر ادب کے خطوط کے مجموعے منظر عام پر آنے لگے۔

اردو خطوط نویسی کا رواج اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب انیسویں صدی کے درمیانی عشرے میں فارسی روبہ زوال تھی۔غالب کے بعد واجد علی شاہ اور بیگمات اودھ نے بھی خطوط لکھے۔سرسید کے دور میں مکاتیب کے کئی ایک مجموعے چھپے جن میں سرسید کے علاوہ محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، امیر مینائی، شبلی نعمانی، اکبرالہ آبادی، مہدی آفادی، محمد علی رولوی، محمد علی جوہر، عبدالماجد دریا آبادی، شبلی کے خطوط عطیہ کے نام، سلمان ندوی، نیاز فتح پوری قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ غلام رسول مہر کے خطوط، خطوط ابوالکلام آزاد، خطوطِ ماجدی۔ قاضی عبدالغفار، پروفیسر رشید احمد صدیقی اقبال کے خطوط کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ان خطوط میں ادبی دلکشی کے ساتھ تاریخی اور سوانحی مواد بھی موجود ہے۔محمد علی جوہر کے خطوط نے بھی ادبی اور تاریخی اعتبار سے اپنی جگہ بنالی ہے۔اس کے بعد مکاتیب کا سلسلہ تواتر کے ساتھ جاری رہا۔ان میں سجاد ظہیر کے خطوط ان کی اہلیہ کے نام (نقوش زنداں) صفیہ اختر کے خطوط ان کے شوہر کے نام۔ڈاکٹر محمد الدین تاثیر کے خطوط (گویا دبستان

کھل گیا)۔غلام جیلانی برق کے خطوط، علی سردار جعفری کے خطوط، نظیر صدیقی کے خطوط، مکتوبات سعد الدین، مکاتیب ظفر علی خان قابل ذکر ہیں۔ جبکہ نامور خواتین کے خطوط کا مجموعہ ''مکاتیب جمیل'' کے نام سے ۱۹۵۶ء میں لاہور سے چھپا جن میں تقریباً ۴۸ نامور خواتین کے خطوط شامل ہیں۔صفیہ اختر کے خطوط زیر لب کے عنوان سے ڈاکٹر عبادت بریلوی اور سعادت حسن منٹو کے خطوط بھی چھپ چکے ہیں۔مشاہیر کے خطوط کے نام سے بھی خطوط کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مشفق خواجہ کے خطوط اپنی فنی اور معنوی اہمیت کے پیش نظر اہم اور تعداد میں بکثرت ہیں۔اس کے بعد اب تک مکتوبات کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔چونکہ خطوط بڑے آدمیوں کے ہی شائع ہوتے ہیں لہٰذا ہمیں ان کے موضوعات اور حالات سے بھی آگاہی حاصل کرنی چاہیے۔انگریز مصنف بلائنڈ Blind نے لکھا ہے:

''چونکہ اصولاً بڑے آدمیوں کے خطوط شائع ہونے کی غرض سے نہیں لکھے جاتے وہ ان ذریعوں میں سب سے زیادہ اہم اور مستند ہیں جن سے ان کی زندگیوں اور ماحول کا علم حاصل ہوتا ہے۔''(۹)

بعض مکاتیب جن میں مصنف یا شاعر اپنی کسی تصنیف کا ذکر کرتا ہے وہ خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔مثلاً بعض شاعر و ادیب جب کسی کو مکتوب لکھتے ہیں تو اس میں اپنی کتاب کا ذکر اور پھر اس کے متعلق تفصیل بھی لکھتے ہیں۔وہ دلچسپ بن جاتے ہیں۔مثلاً انگریزی مصنف شیلے Shelly گورڈن کو ایک خط میں لکھتا ہے:

''میری تمام تر صلاحیتوں کے بارے میں اور خصوصاً نظم کے بارے میں انھیں پوری طرح جلوہ گر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو کچھ جناب نے تحریر فرمایا میں پڑھ چکا ہوں میں نے اس پر غور بھی کیا۔آپ نے جن احتیاطوں کا اظہار فرمایا ہے میرے لیے اس سے زیادہ اطمینان بخش اور دلچسپ اور کیا ہو سکتا ہے۔''(۱۰)

بعض انگریزی مکتوب نگاروں نے نہ صرف تاریخی حالات کو اپنے مکتوبات میں قلمبند کیا ہے بلکہ فطری مناظر، عصری معاشرت اور سماجی قدروں کو بھی اپنے خطوط میں جگہ دی ہے۔مشہور مصنف شیلے Shelly کے

ایک خط میں منظر نگاری دیکھیے:

''انگریزوں کے گورستان سیٹس castices کے مینار والے مزار کے نیچے دیواروں کے قریب سرسبز ڈھال ہے جتنے مناظر میرے دیکھنے میں آئے ہیں یہ ان سب سے زیادہ خوبصورت اور پروقار ہے جب ہم پہلی مرتبہ اسے دیکھتے ہیں ...... چمکدار گھاس پر سورج کی روشنی۔خزاں کی اوس کے قطرے مزار کے درختوں سے ہواؤں کی سرگوشیاں آفتاب کی شعاعوں سے تپیدہ زمین اور خصوصاً عورتوں اور بچوں کا خیال۔

......آہ اگر موت یقینی ہو تو ہم کیوں اس خوابِ راحت میں ان کے شریک نہ ہو جائیں۔''(۱۱)

خطوط کے ذریعے جہاں دیگر حالات و واقعات کا علم ہوتا ہے وہاں بعض اہم شخصیات کی سوانح اور سیرت کے واقعات بھی سامنے آتے ہیں۔علاوہ ازیں مکتوبات میں تنقید کے عناصر بھی نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ نصیحت کے خطوط بھی لکھے جاتے ہیں۔الغرض خطوط کی بے شمار جہتیں ہیں۔

بقول معین الدین احمد انصاری:

''بہر حال مکتوب چاہے کسی نوعیت کے ہوں اور کسی مقصد سے لکھے جائیں ان کی اہمیت اور افادیت مسلم ہوتی ہے۔''(۱۲)

عہد سرسید میں جہاں دیگر اصناف ادب کو عروج ملا وہاں خطوط نگاری کو بھی خاص اہمیت حاصل رہی۔اس عہد میں حالی، شبلی، آزاد، نذیر احمد اور خود سرسید نے بھی مکتوب نگاری میں اہم مقام حاصل کیا۔سرسید کے عہد میں جو سادگی اور بے تکلف انداز بیان اپنایا گیا اس کی جھلک اس عہد میں لکھے گئے خطوط میں ملتی ہے۔

سرسید کے خطوط سادگی اور بے تکلفی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔وہ اپنے دل کی بات کو کہنے میں ذرا جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔اور بڑی بے باکی سے کہہ دیتے تھے۔

شمس الرحمن اپنی کتاب ''اردو خطوط'' میں لکھتے ہیں:

''سرسید کی ہمہ گیر شخصیت پیدا نہ ہوتی تو اردو میں سادگی اور بے تکلفی پیدا کرنے کا کام ادھورا رہ جاتا۔ سرسید نے غالب کے اثر کو صرف اپنے تک محدود نہ رکھا بلکہ اسے پھیلانے کے لیے زبان و ادب کے خدام کی ایک اچھی خاصی جماعت پیدا کردی اس تحریک کے علمبردار کی حیثیت سے سرسید کے خط بے تکلفی اور سادگی کا نمونہ ہیں لیکن ان کی مشغولیتوں نے انھیں کبھی اتنی فرصت نہ دی کہ اپنے خطوں کو دلچسپ اور پر لطف بناتے لیکن پھر بھی ان کے خط اس لیے اہم ہیں کہ ان سے سرسید کی شخصیت کے بہت سے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔''(۱۳)

سرسید چونکہ ایک بے باک شخصیت تھے وہ بڑی بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کردیا کرتے تھے۔ دوستی، محبت، شکوہ شکایت، جس چیز کا اظہار وہ کرنا چاہتے تھے کھل کر کردیا کرتے تھے۔ اور دل میں کوئی بات نہ رکھتے تھے۔ اگرچہ سرسید اور نواب وقار الملک کے درمیان کالج کے بارے میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے تھے مگر اس کے باوجود بھی ان کے تعلقات بہت خوشگوار رہے کیونکہ وہ شکوہ و شکایت کے بعد دل صاف کرلیا کرتے تھے۔ وہ نہ صرف دوستوں سے محبت کرتے تھے بلکہ پوری قوم کی محبت کا جذبہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قوم کی حالت سنوارنے کی فکر کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے خطوط میں چھوٹوں سے محبت کا جابجا اظہار بھی ملتا ہے۔ ایک دفعہ مولوی عنایت اللہ جو مولوی ذکا اللہ کے فرزند تھے اور جن سے سرسید کو خاص لگاؤ تھا جب بیمار ہوئے تو سرسید نے جو خط ان کو لکھا اس خط کے حرف حرف سے محبت اور خلوص ٹپکتا نظر آتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

''اپنی والدہ سے میرا بہت بہت سلام کہنا اور یہ پیغام پہنچا دینا کہ ماں سے زیادہ کسی کو عنایت اللہ سے محبت نہیں ہو سکتی۔ مگر مجھ کو بھی عنایت اللہ سے کچھ کم محبت نہیں ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ تم کو صرف محبت ہی محبت ہے اور میری محبت میں

کچھ عقل کا بھی میل ہے۔تمہاری محبت خالص ہے۔میری محبت میں ملاوٹ بھی ہے خیر خدا تم کو صحیح وسلامت رکھے۔"(۱۴)

سرسید کی ذات میں اور ان کی تحریروں میں بناوٹ داخل نہ تھی مولوی عبدالحق سرسید کے خطوط کے حوالے سے لکھتے ہیں:

جس طرح ان کی طبیعت میں تصنع اور تکلف کو دخل نہ تھا اسی طرح ان کی عبارت بھی ہنر نما عیب سے خالی ہے۔وہ بلا تکلف لکھتے چلے جاتے ہیں اور لکھتے وقت جو خیال جس طرح ادا ہو گیا اسی طرح ادا کر دیتے ہیں لیکن اس بے تکلفی اور بے ساختہ پن میں بعض وقت عجیب فقرے ان کے قلم سے نکل جاتے ہیں۔سید صاحب کو بُرا کہنا اس زمانے میں فیشن ہو گیا تھا جس میں اچھے اچھے لوگ مبتلا تھے۔مولوی سراج الدین احمد صاحب نے اپنے اخبار سرمور گزٹ میں کسی ایسی ہی تحریر کا جواب لکھا تو اسے دیکھ کر سرسید نے انھیں تحریر فرمایا کہ اس قسم کے جواب لکھنے کی ضرورت نہیں اگر ہمارے برا کہنے سے ان کا دل خوش ہوتا ہے۔خوش کر لینے دو تم بھی اس برا کہنے سے خوش ہو کیونکہ وہ ہمارے دھوبی ہیں، ہم کو گنا ہوں سے پاک کرتے ہیں۔(۱۵)

اس سلسلے میں ان کے اس خط کا اقتباس ملاحظہ ہو جو انھوں نے وقار الملک کو لکھا:

"پس فرض کیجیے ایک طرف تو میری خود غرضی سید محمود کے مقرر کرنے کی تھی اور ایک طرف مدرسے کی نفس بربادی تھی جو شخص نہایت ایماندار قوم کا بہی خواہ تھا۔ ان دونوں بلاؤں میں کس بلا کو اختیار کرنا قوم کے حق میں بہتر سمجھتا میں کامل یقین کرتا ہوں اور پورے ایمان سے کہتا ہوں کہ تم نے غلطی کی۔قیامت میں خدا کے سامنے رسول کے سامنے کہوں گا کہ اے میرے دادا رسول خدا میں نے بغیر کسی

غرض دینی و دنیاوی کے تیری امت کی بھلائی کی کوشش میں کوئی درجہ باقی نہ رکھا تھا۔جن لوگوں نے اس کو برباد کرنا چاہا منجملہ ان میں ایک نواب انتصار جنگ ہیں۔آپ کہیے گا میں نے نیک نیتی سے کہا تھا خدا یقینی آپ کو معاف کر دے گا۔''(۱۶)

سرسید کے خطوط میں جہاں قومی بھلائی اور ترقی کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے وہاں ہمدردی اور خلوص بھی نظر آتا ہے۔وہ قوم کی راہنمائی اور ترقی کے خواہاں تھے۔انھوں نے جو خطوط انگلستان سے لکھے وہ بہت اہم ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد نہ صرف اردو انشا پردازی میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں بلکہ ایک اچھے اور کامیاب مکتوب نگار کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔اگرچہ ان کے خطوط میں ان کی انشا پردازی اور اسلوب کے جوہر نظر نہیں آتے لیکن اس کے باوجود آزاد کے خطوط ان کی طبیعت اور شخصیت کے آئینہ دار نظر آتے ہیں۔ان خطوں میں ان کی سادگی ان کی قناعت پسندی کے ساتھ ساتھ ان کی اصول پسندی بھی واضع ہوتی ہے۔یہ خطوط نہ صرف طرزِ تحریر کا عمدہ نمونہ پیش کرتے ہیں بلکہ اداروں،سکول و کالج کے طلبا کے لیے بھی بہترین راہنمائے خط نگاری کا نمونہ ثابت ہو سکتے ہیں۔آزاد کے خطوط بڑے جامع پر مغز اور دلنشین ہیں۔اس کے علاوہ ان میں علم کی چاشنی اور سنجیدگی بھی نظر آتی ہے۔جب ڈاکٹر لائٹر نے مولانا آزاد کو رنج دیا اور ان پر لاہور سے باہر جانے کی پابندی بھی لگائی تھی۔آزاد کا لکھنے کا منفرد انداز دیکھیے کتنے اچھوتے انداز میں ڈاکٹر لائٹر کو لکھتے ہیں:

''مجھے اپنے خراب ہونے کا افسوس نہیں کیونکہ جو سنتا ہے افسوس کرتا ہے۔اگر دشمنوں کے ہاتھوں مجھے خاک میں ملا دیں گے تو مجھے افسوس نہیں کیونکہ میرا فخر تنخواہ اور کرسی اور عہدے پر نہیں میں اس خاک پر بیٹھا آپ کو دعائیں دوں گا۔''(۱۷)

مولانا آزاد کے خطوط میں ان کی علمی ادبی سرگرمیوں کی عکاسی ہوتی ہے اور ان کی ذات کے اہم پہلو بھی

نمایاں ہوتے ہیں کیونکہ وہ تقریباً ساری زندگی تخلیقی کاموں میں سرگرم رہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا اسلوب زیادہ تر واعظانہ ہے جو ان کے خطوط کے مجموعے ''موعظہ حسنہ'' میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے زیادہ تر خطوط ان کے فرزند مولوی بشیر الدین کے نام ہیں۔ جنھیں وہ ناصحانہ انداز میں لکھتے ہیں۔ وہ بعض موقعوں پر محبت سے پیش آتے ہیں اور بسا اوقات ناراضگی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ان کا طرز تحریر بھی سادہ ہے لیکن اس سادگی میں ایک واعظ کا سا انداز ملتا ہے۔ وہ اپنے لڑکے کو نصیحتیں کرتے ہوئے تعلیم اور مقاصد کے حصول پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ نذیر احمد کی تحریروں کا عمومی رنگ اصلاحی ہے اس لیے یہی اسلوب ان کے مکاتیب میں بھی نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے احوال مصروفیات مشاغل بھی ان خطوں میں عیاں ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں:

''بشیر اگر تم پڑھنا نہیں چاہتے یا پڑھنا اگر تمہاری قسمت میں نہیں تو مجھ کو تم سے لڑنا منظور نہیں۔ تم جانو تمہارا کام۔ لیکن اے خدا مجھ کو اس مصیبت کے جھیلنے کو زندہ مت رکھیو کہ ایک اللہ آمین کا بیٹا اور وہ بھی جاہل یا کٹھ ملا۔''(۱۸)

اردو کے مکتوباتی ادب میں خطوط شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔ شبلی کے خطوط میں تازگی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ علمیت اور ادبیت بھی نظر آتی ہے۔ ان کے مکالموں میں غالب کے انداز کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ بلا روک ٹوک اور تنقید کی پروا کیے بغیر لکھتے ہیں ان کے جملے سادہ اور بامعنی ہوتے ہیں۔ شبلی کے خطوط میں ان کی نثر کی تمام خوبیاں نظر آتی ہیں۔ مکاتیب شبلی میں طنز اور تنقید کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ خطوط علمی اور اصلاحی پہلو بھی رکھتے ہیں اور جذباتیت سے بھی مزین نظر آتے ہیں۔ ان کے وہ خطوط جو انھوں نے فیضی بیگمات کے نام لکھے زیادہ دلچسپ اور بے تکلف ہیں۔ ان خطوط سے ان کی روشن خیالی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ شبلی کی اردو خطوط نگاری کا آغاز علی گڑھ کے زمانے سے ہوتا ہے جب وہ علی گڑھ کالج میں تھے مولانا شبلی کی وفات کے بعد ان کے شاگرد عزیز سلمان ندوی نے ان کے خطوط کو دو جلدوں میں ''مکاتیب شبلی'' کے نام سے شائع کیا یہ خطوط تقریباً ۵۰ مختلف شخصیات کے نام لکھے گئے ہیں۔ جن میں ان کے عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کے نام

شامل ہیں۔ان خطوط میں علمی، مذہبی، اصلاحی مسائل پر اظہار خیال کے علاوہ حیات شبلی کے کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ ایک اور مجموعہ خطوطِ شبلی کے نام سے محمد امین زبیری نے ۱۹۳۵ء میں شائع کیا اس مجموعے میں صرف دو خواتین عطیہ بیگم فیضی اور زہرا بیگم فیضی کے نام ۸۲ خطوط ہیں۔ یہ خطوط شبلی کی شخصیت کے مطالعہ کے لیے نہایت اہم سمجھے جاتے ہیں۔شبلی کے وہ خطوط جو انھوں نے عطیہ فیضی اور زہرا فیضی کے نام لکھے ہیں ان میں بے تکلف گفتگو کی گئی ہے۔سید سلمان ندوی مولانا کے خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تمام مکاتیب کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوگا کہ مولانا ہر شخص سے اس کے مذاق اور تعلقات کے مطابق گفتگو کرتے تھے۔شاگردوں کے خطوط میں علمی و اصلاحی مشورے نظر آئیں گے۔مولوی حبیب الرحمٰن خاں کے خطوط میں زیادہ تر فارسی شاعری، نوادر کتب اور ندوہ کے متعلق باتیں ہیں۔پروفیسر عبدالقادر سے ادب و تاریخ فارسی کے مباحث پر گفتگو ہے۔مولانا حمید الدین صاحب سے تفسیر اور سیرت پر مکالمات ہیں مسٹر عبدالماجد سے ''مغربیات'' کی باتیں ہیں۔مسٹر مہدی حسن صاحب مصنف ''دائرہ ادبیہ'' کے خطوط میں محاسن ادبی اور ''لطافت شعری'' پر گلفشانیاں ہیں۔''(۱۹)

علامہ شبلی ایک وسیع المطالعہ علمی اور ادبی شخصیت تھے ان کی نثر میں علمی نکات ادبی اصلاحات مذہبی خیالات وافر مقدار میں نظر آتے ہیں اور یہی چیزیں ان کے مکاتیب میں بھی کارفرما ہیں۔

سر سید احمد خان کو لکھتے ہیں:

> سیدی و مولائی!
>
> ''یہ تیسرا خط ہے جو استنبول سے لکھ رہا ہوں۔آپ کو اور بزرگان وطن کو میرے خطوط کا انتظار نہ کرنا چاہیے یعنی سکوت کی حالت میں قیاس بلکہ یقین کر لیجیے کہ میں بخیریت ہوں۔باقی حالات سفر، اس کی نسبت میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہاں

سے کچھ نہ لکھوں گا۔

قلمی کتابیں یہاں نہیں ملیں۔مصر میں کبھی کبھی ہاتھ آ جاتی ہیں۔اس لیے صرف مطبوع کتابیں خریدی جاسکتی ہیں لیکن ان کی تعداد بھی معتد بہ ہے۔ یہاں امام غزالی کی تمام کتابیں اور رسالے موجود ہیں۔مکاتبات کا نسخہ بھی ہے۔ بوعلی سینا کی اس قدر تصنیفات ہیں کہ کہیں نہ ہوں گی۔ارسطو وغیرہ کی کتابوں کے اصلی ترجمے نہایت قدیم خط میں موجود ہیں لیکن کیا حاصل! کتابت کی شرح لعہ جز کسی حال میں کم نہیں۔معتزلہ کی کتابیں البتہ ناپید ہیں۔عبدالقادر پر جان کی تفسیر ہے۔ مگر اس میں کوئی نئی بات نہیں۔شبلی (۴۰)

مہدی افادی کا شمار اردو کے صاحب طرز انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔ان کی زبان سلیس نہ ہونے کے باوجود بھی اپنے انداز میں رنگینی اور رومانویت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔مہدی افادی چونکہ میر ناصر علی دہلوی سے متاثر تھے جن کی نثر میں ایک خاص قسم کی چاشنی پائی جاتی ہے۔وہ اپنی نثر میں اشعار کا استعمال بھی برمحل اور برجستہ کرتے تھے۔ان کا شعری ذوق بہت اچھا تھا۔وہ اشعار کو بڑی خوبی کے ساتھ اپنی نثر کا حصہ بناتے ہیں۔انھوں نے عورت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ بقول مالک رام:

''مہدی کے نزدیک عورت پیدا ہی اس لیے ہوئی ہے کہ دنیا کے حسن و لطافت میں اضافہ کرے۔''(۴۱)

افادات مہدی اور مکاتیب مہدی اردو ادب کی یادگار کتابیں ہیں۔مکاتیب مہدی میں لطافت بھی ہے خوش نمائی بھی ان خطوط میں زندگی رواں دواں نظر آتی ہے۔ان کی رنگینی اور زندہ دلی میں متانت اور سنجیدگی نظر آتی ہے۔مہدی اپنی پہلی بیوی جو جوانی میں فوت ہوگئی تھی۔میر ناصر علی کو اس کی خبر کچھ اس طرح دیتے ہیں:

''پیارے جناب! میں ادھر ہفتہ عشرہ آپ کی طرف سے کچھ غافل رہا لیکن اس کی وجہ نہایت دلچسپ ہے۔آپ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ دنیا میں کسی کو چاہنا

غضب ہے لیکن اس سے زیادہ قیامت یہ ہے کہ کہیں سے آواز آئے کہ "تو مجھ پہ مرتا ہے تو میں بھی تجھ پر جان دیتی ہوں۔" پہلے پہل آنکھیں کھولیں مدت ہوئی ایک رفیق زندگی مل گیا تھا تو خواب طفلی و آرزوے شباب پہلو میں تھی۔ زندگی کا بہترین حصہ اس کی پرستش میں گزرا۔ لیکن اس نے ترک رفاقت کی آج تک داغ دل میں موجود ہے۔

یہ سینے میں تا زندگانی رہے گا
تیرا داغ دل میں نشانی رہے گا (۲۲)

المختصر مہدی کے خطوط میں ندرت ہے۔تازگی ہے اور لطافت ہے جو ان کے اسلوب کو انفرادیت بخشتی ہے اور انھیں صاحب طرز نثر نگار بنا دیتی ہے۔

امیر مینائی کے خطوط جو انھوں نے اپنے شاگردوں، دوستوں اور عزیزوں کو لکھے کو ان کے شاگرد احسن اللہ خاں ثاقب نے مرتب کر کے شائع کیے۔ یہ خطوط ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئے۔ یہ مکاتیب اردو کے مکاتیبی ادب کا بہترین سرمایا سمجھے جاتے ہیں اور ان خطوط میں جہاں امیر مینائی کے خاندان، شاگردوں کی راہنمائی معاصرین سے تعلقات، تصانیف کا ذکر ملتا ہے وہاں امیر اللغات لکھتے وقت جو پریشانیاں اور مسائل پیش آئے ان احوال کا تذکرہ بھی درج ہے۔امیر مینائی کے خطوط کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں قواعد، زبان اور فن عروض پر روشنی پڑتی ہے۔امیر کے خطوط میں ان کی علمیت کے ساتھ ساتھ بہترین انشا پردازی کے نمونے بھی ملتے ہیں کیونکہ وہ نہ صرف شاعری میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں بلکہ لغت نویسی اور تذکرہ نگاری کے حوالے سے بھی اہم شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔خطوط کے نمونے ملاحظہ ہوں:

"میں ہاتھ کے مرتعش ہونے سے اب اپنے ہاتھ سے کم لکھتا ہوں۔دست وقلم کے قابو میں نہ ہونے سے لکھنے میں دیر بھی ہوتی ہے اور خط بھی بدنما ہوتا ہے جی بھی گھبراتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جلیل و آس سلمہا اللہ سے لکھوا دیا کرتا ہوں۔کلام بھی

انھیں لوگوں سے سنتا ہوں اور جو کچھ بتاتا ہوں یہی لوگ لکھ دیتے ہیں۔''(۲۳)

بقول امتیاز علی خان عرشی:

''اگر وہ شاعری کی طرف نہ آتے اور دینی اور روحانی کاموں ہی طرف متوجہ رہتے تو شاعری میں ان کے شاگردوں سے کہیں زیادہ تعداد مریدوں، معتقدوں کی ہوتی۔''(۲۴)

المختصر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مکاتیب امیر نہ صرف ہمارے ادب اور مکتوباتی کا ادب نمونہ ہیں بلکہ معلومات افزا بھی ہیں۔

غالب کے بعد اردو کے مکتوباتی ادب میں جن مکتوب نگاروں کو خاص پذیرائی ملی ان میں مولانا الطاف حسین حالی قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالی عہد سرسید کے اہم مکتوب نگار ہیں۔ان کے خطوط کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔مولانا حالی کے خطوط میں ان کی شخصیت کا سادہ پن اور خلوص نظر آتا ہے۔ان کی زبان میں معنوی اور ادبی حسن موجود ہے۔حالؔی کے خطوط میں ان کی نرم گفتگو کا لہجہ بھی جھلکتا نظر آتا ہے۔اور خوش مزاجی بھی واضح ہوتی ہے اس کے ساتھ ساتھ مقصدیت بھی ہے۔

البتہ ان کے بعض خطوط میں جزباتی پہلو قدرے کم ہے اور جوش کی کمی بھی بسا اوقات نظر آتی ہے۔جن خطوط میں یہ چیزیں ظاہر ہوتی ہیں وہاں ادبیت کے مقابلے میں مقصدیت نمایاں ہو جاتی ہے۔نجی اور خاندانی خطوط میں بیماریوں،عوارض کا بھی بکثرت ذکر کر جاتے ہیں چونکہ خطوط ابلاغ کا ذریعہ ہوتے ہیں۔وہ سادہ واضع اور غیر مبہم طرزِ تحریر اپناتے ہیں۔ان کے خطوط قاری پر اپنا مقصد واضع کر دیتے ہیں۔مولانا حالی کی مکتوب نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''حالؔی کے خطوں میں خوش مزاجی اور مدعا نگاری کا پرلطف آمیزہ موجود ہے ان میں شخصی وقار کم ہے۔مکتوب الیہ کا لحاظ زیادہ نمایاں ہے۔حالؔی کے خط ان کی

ذات سے زیادہ ان کے مکتوب الیہ کے ذہنی کوائف پر روشنی ڈالتے ہیں۔ صاف بیانی قطعیت سادگی کے ساتھ آمیز ہو کر ان کے خطوں کو معنی دار بنا دیتے ہیں۔ ان کے یہاں خودنمائی نہیں......

ان کے خطوں میں حقیقت کی پرخلوص سادہ بیانی ہے۔ انھوں نے خطوط کو فن کا تماشا بنایا ہے نہ سخن کا پردہ یعنی ان کے خطوط نہ فن ہیں نہ سخن محض خط ہیں جو اپنا اصلی فرض (مدعا کا ابلاغ) نہایت اچھی طرح سے سرانجام دیتے ہیں۔"(۴۵)

ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے سے یہ بات واضع ہوتی ہے کہ حالؔی کے خطوں میں مدعا نگاری اور خوش مزاجی کے ساتھ ساتھ مکتوب الیہ کی ذات کا لحاظ بھی زیادہ اہم ہے۔ علاوہ ازیں ان کے خطوں میں خودنمائی کا عنصر موجود نہیں بلکہ ان کی خاکساری کی جھلک نظر آتی ہے جو ان کی طبیعت کا خاصہ ہے کیونکہ وہ ایک دردِ دل رکھنے والے مخلص انسان تھے اور یہ چیز ان کی تحریروں میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کا ذاتی اخلاص ان خطوط میں جابجا نظر آتا ہے۔ مولانا حالؔی نے پہلا خط ۸ فروری ۱۸۷۹ء کو مولوی محمد یعقوب مجددی کے نام لکھا جو مکتوباتِ حالی حصہ اول میں موجود ہے۔ مکتوبات حالی کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔ مکتوبات حالی حصہ اول و دوم ۱۹۲۵ء میں پانی پت سے جبکہ تیسرا مجموعہ مکاتیب حالی کے نام سے ہے جن کے مرتب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ہیں اور یہ اردو مرکز لاہور سے ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ یہ خطوط جو انھوں نے اپنے عزیزوں دوستوں اور مختلف علمی و ادبی شخصیات کو لکھے ہیں۔ ان خطوط میں علمی ادبی اور عصری معلومات کے علاوہ کتب و جرائد کا تذکرہ بھی ملتا ہے اور اس عہد کی ادبی تحریکوں تک رسائی بھی حاصل ہوتی ہے جو خطوط انھوں نے اپنے عزیز و اقارب کو لکھے وہ زیادہ تر قیام لاہور کے وقت کے ہیں جب وہ پنجاب گورنمنٹ پریس اور ایچی سن کالج میں ملازمت کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر خطوط ان کے دونوں صاحب زادوں کے نام ہیں۔ اس کے علاوہ پانی پت، علی گڑھ اور دہلی میں قیام کے زمانے کے خط بھی شامل ہیں۔ ان خطوط میں زیادہ تر ذاتی، خاندانی اور نجی باتوں کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ مولانا حالؔی کے معمولات زندگی اور ان کی اپنی اولاد سے محبت بھی واضع طور پر نظر آتی ہے۔ مثلاً اپنے فرزند خواجہ سجاد حسین کو لکھے

گئے خط کا اقتباس دیکھیے:

''تم کو یہاں سے روانہ ہوئے آج پانچواں روز ہے۔ ہر روز انتظار کیا جاتا ہے مگر ابھی تک نہ تم نے اپنی خیریت لکھی اور نہ نانو خاں نے کچھ لکھا جس نے کہا تھا کہ میں ایک خط گجرات سے اور دوسرا راولپنڈی سے فوراً روانہ کروں گا۔ طبیعت کو ہر وقت خلجان رہتا ہے چاہیے کہ اپنی خیر و عافیت سے جلدی مطلع کرو۔''(۲۶)

اس مجموعہ مکتوبات میں مولانا کی خاندانی زندگی کے حالات و واقعات وغیرہ ملتے ہیں۔ مکاتیب حالیؔ جو ۱۹۵۰ء میں اردو مرکز لاہو سے چھپا یہ نہایت اہم اور عمدہ مجموعہ مکاتیب ہے۔ اس میں اردو کے علاوہ فارسی اور عربی مکاتیب بھی شامل ہیں اور آخر میں عربی مکاتیب کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ یہ تمام مکاتیب ایسے ہیں جن کی علمی و ادبی حقیقت مسلمہ ہے اور مولانا کے اخلاق و عادات وغیرہ کی عکاسی کرتے ہیں۔ بقول شیخ محمد اسماعیل پانی پتی:

''اکثر خط اس مجموعہ میں ایسے بھی ہیں جن میں بعض علمی و ادبی یا تاریخی نکات آپ نے بیان فرمائے ہیں۔ لوگوں کو ان کی ادبی غلطیاں بتائی ہیں اور متنازعہ فیہ علمی مسائل کو بیان کیا ہے اور ان اصحاب کو مشورہ سخن دیا ہے جو فنِ شعر میں آپ کے شاگرد تھے۔''(۲۷)

یہ مکاتیب اہم علمی و ادبی شخصیات کو لکھے گئے ہیں علاوہ ازیں مختلف روزناموں اور جرائد کے مدیروں کو لکھے گئے خطوط بھی اس میں شامل ہیں۔

ان مکاتیب کا مطالعہ ہمارے علمی تناظر کو وسیع کرتا ہے اور مولانا حالی کے سوانحی حالات تک رسائی میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی ناقدانہ حیثیت کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ یہ خطوط معاصر ادبی تحریکوں اور رسائل و جرائد تک رسائی بہم پہنچانے کا سبب بھی بنتے ہیں۔ مولانا حالی چونکہ اپنے عہد کی اہم علمی و ادبی شخصیت تھے اسی لیے اس عہد کے تمام اہم مشاہیر ادب کے ساتھ ان کی خط و کتابت تھی لیکن ایک اہم بات جس طرف قاری کی توجہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ حالیؔ کے قریبی دوست، استاد اور مرشد مرزا غالب اور سرسید کے نام

خطوط موجود نہیں۔شاید اسی لیے محترمہ صالح عابد حسین حیرانگی سے لکھتی ہیں:

''یقین غالب ہے کہ ان بزرگوں سے حالؔی کی جو خط و کتابت ہوئی وہ کئی لحاظ سے بہت زیادہ اہم اور قابلِ قدر رہو گی۔غالبؔ سے ادبی اور شعری نکات پر اکثر تبادلہ خیالات ہوا کرتا تھا اور سرسید سے تو ہر مسئلے پر بات چیت اور خط و کتابت ہوتی تھی لیکن افسوس کہ ان بزرگوں کے نام خطوط ضائع ہو گئے اور ادب کے شائقین کے ہاتھوں نہ پہنچ سکے۔''(۲۸)

محترمہ صالح عابد حسین کی رائے کے مطابق ہو سکتا ہے بعض خطوط ضائع ہو گئے ہوں۔ کیونکہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے وقت جو تباہی و بربادی ہوئی اس سے مولانا کا وطن بھی نہ بچ سکا اور خواجہ سجاد حسین اور گھر کے دیگر افراد کے گھروں کی بربادی کے وقت مولانا کا علمی و ادبی ذخیرہ اور قلمی خطوط و دیگر تحریریں بھی ضائع ہو گئیں ہوں البتہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حالؔی شیفتہ کے ہاں جب مقیم تھے تو اس وقت غالب اور شیفتہ کی خط و کتابت تھی اور شیفتہ کے خطوں میں اپنے احوال لکھ بھیجتے ہوں یا ان کو اکثر غالب کے ہاں حاضری کا موقع مل جایا کرتا ہو۔اور خط لکھنے کی نوبت کم آتی ہے اس ضمن میں شجاعت علی سندیلوی لکھتے ہیں:

''جس زمانے میں حالؔی نواب مصطفٰے خان شیفتہ کے ساتھ جہانگیر آباد میں رہا کرتے تھے اور وہاں نواب صاحب کے بچوں کی اتالیقی کا کام بھی ان کے سپرد تھا۔ دونوں غالب کے دوست شاگرد عقیدت مند اور دلدادہ تھے اور جہانگیر آباد سے اپنا کلام بہ نظر اصلاح غالب کے پاس روانہ کرتے اور اکثر خود دہلی جا کر ان سے ملتے تھے۔حالی کی جوانی کا زمانہ تھا اور اس وقت طبیعت پر مذہبی تعلیم اور شرعی ماحول کا رنگ بہت گاڑھا چڑھا ہوا تھا۔''(۲۹)

البتہ مکاتیب حالی مرتب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی میں ایک فارسی خط مرزا غالب کے نام لکھا ہوا ملتا ہے۔ جہاں تک سرسید کا تعلق ہے تو سرسید کے لکھے ہوئے آٹھ خطوط مولانا حالی کے نام ملتے ہیں جو مکتوبات سرسید جلد

اول میں شامل ہیں سرسید اور مولانا حالؔی کا رشتہ عزت واحترام کا تھا دونوں ایک دوسرے سے عقیدت رکھتے تھے خصوصاً سرسید ان کے علم وفضل اور دیانتداری کا دل سے احترام کرتے تھے۔مولانا حالی بھی سرسید کے تعلیمی، سماجی اور رفاعی کاموں سے بہت متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا حالی نے چھ سال کی محنت تحقیق اور جستجو سے سرسید کی سوانح حیات لکھی اور اس کتاب کو لکھنے میں انھیں بہت ساری مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا اس سلسلے میں مولانا حالؔی نے بعض معمولی واقعات کو بھی نظر انداز کرنے سے گریز کیا۔سرسید نے مولانا حالؔی کو جوخطوط لکھے ہیں ان میں وہ مولانا کو نہایت عزت واحترام سے مخاطب کرتے تھے۔مثلاً لکھتے ہیں:

"جناب مولانا مخدوم ومکرمِ من، مولانا حالؔی!

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ جو ہمدردی آپ نے میرے ساتھ اس روپے کے غبن ہونے میں فرمائی ہے اس کا میں دل سے شکر گزار ہوں مگر لاکھ روپے سے زیادہ غبن معلوم ہوتا ہے۔اس کا جس قدر مجھ کو رنج وصدمہ ہے وہ بیان نہیں ہوسکتا۔ ہر چند میں دل کو سمجھاتا ہوں کہ جو (کچھ) ہونا تھا وہ ہوگیا مگر ایک نیچرل امر ہے دل کو بے اختیار رنج وفکر میں پڑنا۔چند روز تک تو میری حالت ایسی خراب تھی کہ مجھے کسی بیماری شدید کے لاحق ہونے کا اندیشہ رہا۔تین روز تک مطلق کھانا کھایا نہیں گیا اور طبیعت کی عجیب کیفیت تھی مگر اب اس حالت سے بہت افاقہ ہے اگر میرا ذاتی روپیہ ہوتا تو مجھے کچھ بھی پرواہ نہ ہوتی۔آپ کے کلماتِ تشفی آمیز سے بہت تقویت ہوتی ہے مگر جب تعدادِ کثیر روپے کا خیال آجاتا ہے تو دوستوں کی تشفی سب بھول جاتی ہے۔خدا رحم کرے۔

والسلام!

خاکسار سید احمد

علی گڑھ، ۲۔اکتوبر ۱۸۹۵ء[۳۰]

مذکورہ بالا خط سے جہاں ایک طرف علی گڑھ کالج میں غبن کے ذکر پر سرسید غمگین اور پریشان ہیں تو دوسری طرف مولانا کی تشفی اور ہمدردی کا ذکر بھی کرتے ہیں۔خط میں قوم کے ساتھ جو سچی لگن اور درد سرسید کے دل میں تھا اس کا اظہار اس خط سے ہوتا ہے۔ مکاتیب حالی میں فارسی اور عربی خطوط بھی شامل ہیں اور یہ تمام خطوط ادبی نوعیت کے ہیں۔جن میں مولانا بڑی سیدھی اور سچی باتیں کرتے ہیں اور عام فہم انداز اپناتے ہیں۔ فارسی کے آٹھ خطوط ہیں جن کی نوعیت ادبی ہے اور ان کی حیثیت واضح ہے یہ خطوط مکاتیبی ادب میں اہم ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی کے نام ایک فارسی خط کا اقتباس ملاحظہ ہو۔جس میں انھوں نے مولانا کے مجموعہ شعر ''دستہ گل'' سے متاثر ہونے کا ذکر کیا ہے۔

مولانا و مُخکاتا!

''بوئے گل رسید و بایں بیتِ حافظ مترنم ساخت

بوئے خوشِ تو ہر کہ زباد صبا شنید

از یار آشنا خبر آشنا شنید

زبوئے گلِ بالشت بہ دستہ گل متاثر تر شدہ ام۔ ہما نا کال را رنگِ حال دادہ آید یا

خود حال را در لباسِ قال جلوہ گر ساختہ آیدے۔''(۳۱)

ان خطوط سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس زمانے میں اہلِ علم و دانش نہ صرف عربی، فارسی پر دسترس رکھتے تھے بلکہ اپنی روزمرہ زندگی میں بھی عربی فارسی کو بطور زبان استعمال کرتے تھے۔مثلاً عربی خطوط میں جو خط مولانا حالی نے شاہ عبدالغنی کی خدمت میں لکھا وہ بلیغ اور خوبصورت طرزِ تحریر سے مزین ہے۔مولانا حالؔی نے ایک عربی قصیدہ حضرت کی خدمت میں پیش کیا اس سلسلے میں عربی خط کے ترجمے کا اقتباس کچھ اس طرح سے ہے جو کہ ''مکاتیب حالی'' کے صفحہ ۱۵۳ پر درج ہے:

''حضرت میں امید کرتا ہوں آپ میرے اس برے بھلے کلام کو قبولیت کی نظر سے دیکھیں گے اس سے اس کے نقص اور عیب دور ہو جائیں گے آپ تو ان لوگوں میں

سے ہیں جو کسی بری چیز کے آگے سے گزرتے ہیں تو شرافت اور سنجیدگی سے گزر جاتے ہیں۔"(۳۲)

دوسرے خط کا اقتباس کچھ اس طرح سے ہے جو مولانا حالؔی نے اس قصیدے کی قبولیت کے جواب میں لکھا:

"یا مولائی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔خدا کا شکر ہے کہ آپ نے اس قصیدے کو قبول فرمایا۔آپ کی دعاؤں سے ان مقاصد میں کامیاب ہوا ہوں جن میں کامیاب ہونے کی امید نہیں تھی۔آپ نے مجھے بڑی زبردست بخشش عطا فرمائی ہے۔"(۳۳)

مولانا حالؔی کے خطوط کی زبان سادہ سلیس اور عام فہم ہے اوران کا طرز تخاطب بڑا مخلصانہ اور محبانہ ہے اس کے ساتھ ساتھ ان کے لہجے کی مٹھاس اور شخصیت کی نرمی ان خطوں میں ظاہر ہوتی ہے اور یہ چیزیں مولانا حالی کی شخصیت میں رچی بسی ہوئی تھیں۔اس لیے ان کے تخاطب اور لب ولہجہ میں اپنائیت اور محبت ہے جو ان کے طرز ادا میں جابجا نظر آتا ہے۔حالؔی کے طرز تحریر کے ضمن میں حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

"زبان ومحاورہ کی صحت طرز بیان کی بے تکلفی اور لب ولہجہ کی نرمی اور لوچ نمایاں ہے ان کے ہاں سرسید کا جوش، آزاد کی رنگینی، نذیر احمد کا زور وشور اور ظرافت نہیں ہے لیکن قوت بیان اور صفاحت وروانی بہتر سے بہتر ہے۔"(۳۴)

مولانا حالی جس شخصیت کو خط لکھتے ہیں وہ اس میں اپنی مقصدیت اور سادگی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ خصوصاً وہ خطوط جو مولانا نے اپنے ہم عصر ادباء اور شعرا کو لکھے ہیں ان میں ادبی چاشنی کے ساتھ ساتھ علم دوستی اور ادب دوستی نمایاں نظر آتی ہے۔یہ خطوط اپنے اندر بڑی علمی وادبی وسعت رکھتے ہیں۔نیز ان خطوں کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مولانا کے ادبی خیالات ونظریات کیسے تھے۔ان میں بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن میں

مولانا سے مشورہ سخن کیا گیا ہے جس کے جواب میں مولانا نے خطوط لکھے۔ان خطوں میں بعض علمی ادبی و تحقیقی کتب کا ذکر بھی ملتا ہے جو اس دور کے علمی و ادبی منظر نامے کو اجاگر کرتا ہے یہ خطوط مولانا کے دوستوں، شاعروں، ادیبوں کے تذکرے کے ساتھ ان کے حلقہ احباب کے متعلق معلومات فراہم کرنے کا سبب بنتے ہیں اور ان کی ذاتی اور نجی زندگی کے اندر جھانکنے کا ذریعہ ہیں۔ بقول محترمہ صالح عابد حسین:

''یہ خط اپنی بے پناہ سادگی اور بے تکلف انداز بیان کے باوجود بڑے بڑے نقطے اپنے اندر پوشیدہ رکھتے ہیں۔''(۳۵)

ان خطوط کے مطالعے سے ایک طرف مولانا حالی کی ذاتی زندگی کے بہت سارے حالات منظر عام پر آتے ہیں تو دوسری طرف ان کی انکسارانہ طبیعت اور سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ جو ابھی تک عام لوگوں اور اہل ادب کی نظر سے پوشیدہ ہے۔حالی کے طرز نگارش اور اندازِ بیان پر بعض لوگوں نے اعتراضات بھی کیے ہیں کہ ان کے خطوط کے مطالعہ سے قاری کے دل میں جوش پیدا نہیں ہوتا ہے یا ان میں جوش کی کمی ہے علاوہ ازیں مولانا حالؔی کا ٹھنڈا اور دھیما لہجہ بھی بسا اوقات قاری کو کھٹکتا ہے ان کے برعکس آزاد اور شبلی کے خطوط میں جوش ملتا ہے اور غالب کے خطوط ان کی بے تکلفی اور بذلہ سنجی کے ساتھ ساتھ ان کے شوخ طبیعت بھی نمایاں نظر آتی ہے لیکن یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مولانا کو الفاظ کے برمحل اور سلیقے سے استعمال کرنے کا ہنر آتا ہے۔وہ سادہ بیانی میں بھی ایسا طرز تحریر اپناتے ہیں کہ بیان میں جان آ جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پڑھنے والے پر مقصد بھی واضع ہو جاتا ہے۔مولانا حالؔی کی خطوط نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''لیکن اس سے انکار نہ ہوگا کہ حالؔی کے خطوں کے مطالعہ سے قلبی کشادگی اور وسعت کی ایک فضا ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔''(۳۶)

ان خطوط کا مطالعہ سے ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے حقیقت پر مبنی محسوس ہوتی ہے کیونکہ یہ خطوط نہ صرف اعلیٰ ظرفی کا نمونہ ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ذہنی و قلبی آسودگی کا ذریعہ بھی محسوس ہوتے ہیں۔

ان خطوط میں مولانا حالی کا مکتوب الیہ کو مخاطب کرنے کا انداز پرخلوص اور سیدھا ہے۔ وہ اپنے

معاصرین کو لکھتے وقت مخدومی، مکرمی، مخدوم ومکرم جناب والا، جناب من، مائی ڈیئر، شفیق ومکرم، محترم، والا جناب وغیرہ جیسے القاب سے مخاطب کرتے ہیں جبکہ چھوٹوں اور عزیز و اقربا کو مخاطب کرتے ہوئے برخوردار، طول عمرہ، سعادت آثار وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مکتوبات حالی حصہ دوم جن میں زیادہ تر خطوط انھوں نے اپنے صاحب زادوں کو لکھے ہیں۔ ان میں برخوردار، سعادت آثار، طال عمرہ، برخوردار سعادت اطوار وغیرہ جیسے القاب استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اپنے صاحب زادے کو لکھتے ہیں:

> ''برخوردار سعادت اطوار طالعمرہ، بعد دعا کے مدعا یہ ہے کہ میں ۲۰ جولائی سے کنڈا گھاٹ سے پانی پت آ گیا ہوں۔ پہاڑ پر زیادہ ٹھہرنا اس لیے تھا کہ میدان میں گرمی غیر معمولی طور پر نہایت سخت پڑ رہی تھی۔ مگر جب یہاں بھی بارش ہونے لگی اور لوئیں چلنی موقوف ہوگئیں میں پہاڑ سے اتر آیا۔''(۳۷)

مولانا حالی بچیوں اور لڑکیوں کو نور چشمی، عزیزی، برخوردارنی جیسے الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں۔ ان القاب و آداب سے مولانا حالؔی کی عقیدت اور خلوص و محبت وغیرہ کا اظہار نمایاں ہوتا ہے۔ آخر میں یا خط کے اختتام پر زیادہ تر خاکسار، نیازمند، راقم دعا گو سچا دوست وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور آخر میں تاریخ اور مقام لکھتے ہیں بعض خطوں کے شروع میں بھی انھوں نے تاریخ اور جگہ کا نام لکھا ہے۔ نفس مضمون یا خط کی عبارت میں وہ چھوٹے جملے استعمال کرتے ہیں اور مقصد کو زیادہ واقع اور عام فہم بنانے کی کوششیں کرتے ہیں۔ مولانا حالؔی کی تحریروں میں ان کا لب و لہجہ نرم اور محبت سے بھرا نظر آتا ہے۔ ان خطوط کے طرز تحریر اور طرز ادا پر تبصرہ کرتے ہوئے صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں:

> ''صاحبِ علم و فضل حضرات کو خط لکھتے وقت بھی ان کے ہاں عربی فارسی کی آمیزش اور مشکل اور دقیق انداز بیان نہیں ہوتا۔ پھر کہیں کہیں کوئی مشکل لفظ یا علمی انداز کی جھلک نظر آ جاتی ہے لیکن جب اپنے سے چھوٹوں خصوصاً عورتوں اور بچوں کو خط لکھتے ہیں اس وقت تو ایسی سہل، رواں اور دلنشین زبان ہوتی ہے جیسے کوئی بڑے

پیار سے ان کی عقل اور معلومات کے مطابق ان سے باتیں کر رہا ہو۔''(۳۸)

مولانا حالی کے لکھے ہوئے خطوط کے چند اقتباس ملاحظہ فرمائیں ایک خط میں مولوی عبدالرزاق کانپوری کو لکھتے ہیں:

''جناب مولوی صاحب مخدوم ومکرم۔تسلیم!

شفقت نامہ پہنچا جس کا شکریہ دل سے ادا کرتا ہوں۔الحمد اللہ کہ آپ کی مساعی جمیلہ زمانے کی ناقدری پر غالب آئیں مگر حق یہ ہے کہ زمانے کو ناقدردان ٹھہرانا محض ہٹ دھرمی ہے بلکہ درحقیقت قابل قدر اشیا ہی کا قحط ہے۔ورنہ قدردانوں کی کمی نہیں۔

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد
اے خواجہ درد نیست وگرنہ علاج ہست'' (۳۹)

ایک اور خط میں آغا شاعر دہلوی کو لکھتے ہیں:

''آغا صاحب!

میری بینائی نے مجھے جواب دے دیا ہے جو کچھ لکھواتا پڑھواتا ہوں وہ بھی دوسروں کی مدد سے دوسرے میں ایک دیہاتی،قصباتی آدمی اور آپ دہلی کے رہنے والے دریافت فرماتے ہیں مجھ سے آپ خود اہلِ زبان ہیں۔بیني و بین اللہ۔

خاکسار

الطاف حسین حالؔی

از پانی پت''(۴۰)

علامہ شبلی نعمانی کو لکھے گئے خط کا اقتباس:

''مولانا!

''دستہ گل'' پہنچا میں نے اس مجموعے کا نام تو احسن اللہ ثاقب خاں سے جو ابھی میرے ہاں مہمان رہ کر گئے ہیں سنا تھا اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ لائبریری پانی پت میں میں نے اسے منگوانے کے لیے لائبریرین سے کہہ دیا تھا مگر اب تک دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا اب جو آپ نے عنایت فرمایا تو اول سے آخر تک اس کو دیکھا۔ کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح عمری مولانا روم جیسے مقدس کتابیں لکھی ہیں۔غزلیں کاہے کو ہیں شرابِ دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی و بیباکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔''(۴۱)

مولانا ظفر علی خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں جو انھوں نے ۱۱ مارچ ۱۹۰۵ء کو پانی پت سے لکھا۔

''عزیزی!

اس وقت حسنِ اتفاق سے تھوڑی دیر کے لیے مکروہات خانگی سے نجات ملی تھی۔ جنوری کا دکن ریویو جو سامنے رکھا ہوا تھا جس کو تفصیلی نظر سے اب تک نہ دیکھا تھا سرے ہی پر آپ کی نظم جو ''رودِ موسیٰ'' پر لکھی گئی تھی نظر پڑی۔اول سے آخر تک بہت غور اور بڑے شوق کے ساتھ پڑھی۔میرا حال اب یہ ہو گیا ہے پرانی طرز کی نظمیں تو (الا ماشا اللہ) اس لیے دیکھنے کو جی نہیں چاہتا کہ ان میں کوئی نئی بات دیکھنے کو نہیں آتی اور نئی طرز کی نظموں میں گو مضامین نئے نئے ہوتے ہیں مگر وہ چیز جس کو شاعری کی جان کہنا چاہیے اور جس کو ''جادو'' کے سوا اور کسی لفظ کے ساتھ تعبیر نہیں کیا جا سکتا کہیں نظر نہیں آتی۔

لیکن اس نظم کو دیکھ کر میں متغیر ہوگیا۔ مرثیہ دیکھ کر بھی مجھے ایسا ہی تحیر ہوا تھا۔ لیکن اس وقت آپ کے دل کو لگی ہوئی تھی اور ایسا کلام جو دل کے جوش پر مبنی ہوتا ہے خوا ہی نخواہی موثر اور دلکش ہوتا ہے کہیں ردِ موسیٰ پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے بہ یہ محض زور طبع اور شاعری کی خدا داد قابلیت سے لکھا ہے۔ اگر آپ جیسے دو چار آدمی ملک میں پیدا ہو جائیں تو کچھ امید ہے کہ نئی شاعری چل نکلے۔''(۴۲)

منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر رسالہ ''زمانہ'' کانپور کو جو آپ کو مسلسل ''زمانہ'' ارسال فرمایا کرتے تھے کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''جناب منشی صاحب مخدوم و مکرم

عنایت نامہ پہنچا۔ مجھ سے زیادہ کوئی ناشکرا اور نا منفعل نہ ہوگا کہ ایک عرصے سے آپ کے بے نظیر رسالہ کے مطالعہ سے مستفید ہوتا ہوں مگر باوجود اس کے آج تک نہ رسالے کی رسید لکھی اور نہ شکریہ کا ایک حرف لکھا مگر حال یہ ہے کہ میں تقریباً ایک سال سے ایسی پریشانیوں میں الجھا ہوا ہوں کہ لکھنا پڑھنا بالکل موقوف ہوگیا ہے اور جمعیت خاطر اور اطمینان نے کلیتہً جواب دے دیا ہے میں نہیں چاہتا کہ پہلے ہی خط میں ان پریشانیوں کی تفصیل سے آپ کو بے لطف کروں لہٰذا اس موقع پر صرف یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے حکم کی تعمیل اس وقت ناممکن ہے لیکن اگر زندگی باقی ہے تو میں ضرور اپنی شرمندگی رفع کرنے میں کوشش کروں گا اور جیسا برا بھلا لکھنا مجھے آتا ہے ''زمانہ'' کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ امید ہے آپ میرے اس عذر کو حیلہ یا بہانہ پر محمول نہ فرمائیں گے۔''(۴۳)

مولانا محمد حسین آزاد کو لکھے گئے ایک خط کا اقتباس دیکھیے جس میں مرزا غالب کے اشعار کے مطالب و

معنی کا ذکر کیا گیا ہے اور وضاحت لکھی گئی ہے۔

مرزا کا شعر:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک (۴۴)

لکھتے ہیں:

سر ہونے کے معنی جہاں تک میں نے سمجھے ہیں کھلنے کے ہیں واللہ اعلم عند اللہ شاید شاعر کی یہ مراد ہے کہ وصل کی طیاری کے وقت جو معشوقہ کی زلفیں سر گوندھنے کے لیے کھلتی میں دیکھے وہ وقت کب آیا ہے ظاہراً اس وقت تک عمر ختم ہو جائے گی۔'' (۴۵)

مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی کو ایک خط میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

''جناب من! لفظ ہاتھ میں بلا شبہ ہائے مخلوط ہے لیکن رات اور بات کا قافیہ بھی شعرا نے باندھا ہے۔ قافیہ کی ضرورت ایسی خفیف فروگزاشتوں کو جائز کر دیتی ہے۔ مرزا غالب کبھی اور کسی کی جگہ کبھو اور کسو کو غیر فصیح سمجھتے تھے لیکن ان کے اردو دیوان میں قافیہ کی جگہ کسو اور کبھو باندھا ہوا ہے۔ میں بھی ہمیشہ ہاتھ کو ہائے مخلوط کے ساتھ لکھتا ہوں مگر قافیہ میں ہات باندھنا جائز سمجھتا ہوں۔

زیادہ نیاز۔'' (۴۶)

مندرجہ بالا اقتباسات سے مولانا کے طرز تحریر اور انداز تکلم کا اندازہ ہے اور ان کی علمی و ادبی حیثیت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ان خطوط سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مولانا حالی ایک نہایت اہم علمی و ادبی شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں اور وہ اردو ادب کے ایک اہم راہنما ثابت ہوتے ہیں۔

مولانا شبلی کو لکھے گئے ایک خط کا منفرد طرز تحریر ملاحظہ ہو:

''اس قدر مدت کے بعد عنایت نامہ کے ورود نے میری آنکھوں کے ساتھ وہی

کام کیا جو پیراہنِ یوسف نے چشم یعقوب سے کیا تھا۔

میری کوتاہ قلمی سے اگر آپ یہ سمجھتے ہوں تو کچھ تعجب نہیں کہ میں آپ کے حقوقِ

صحبت بھول گیا ہوں۔مگر مولانا! یہ تغافل اسی قسم کا ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے۔

تغافلے کہ کم از صد نگاہِ حسرت نیست

میں اپنے حالات کی تفصیل لکھ کر آپ کو ملول نہیں کرنا چاہتا۔''(۴۷)

درج بالا خط ادبی رچاؤ سے بھرپور اور طرزِ تحریر کے حوالے سے منفرد ہے۔

مدعا نویسی اور سادگی چونکہ عہد سرسید کی خاص خوبی سمجھی جاتی تھی چنانچہ مولانا حالی نے بھی ان مقاصد کو پیش نظر رکھا۔ان کی نثر کی طرح ان کے مکتوبات میں بھی یہ چیزیں کارفرما نظر آتی ہیں۔ یہاں ایک اور اہم بات جو عیاں ہوتی ہے وہ یہ کہ اگرچہ وہ سرسید دور کے مقصدی رویوں کے ساتھ چلے لیکن ان کی مقصدیت اور سادگی میں بھی ایک وقار نظر آتا ہے جو قاری کو چُبھتا نہیں بلکہ اسے محظوظ کرنے کا سبب بنتا ہے اور اس پر علم و ادب شناسی کا در وا کرتا ہے۔

مولانا حالی کے خطوط کا ایک اور اہم اور نمایاں وصف یہ ہے کہ حالی مرزا غالب کی طرح حالات کا شکوہ نہیں کرتے۔بقول شاعر:

اک دنیا بھی ہو دشمن تو کچھ غم نہیں کرتے

بے مہری عالم کا گلہ ہم نہیں کرتے

بلکہ ایک قناعت پسند صوفی منش شخص کی طرح نظر آتے ہیں جبکہ خطوط غالب میں یہ چیز کم نظر آتی ہے۔

حالی کے مکتوبات کی اس چیز کو اجاگر کرتے ہوئے صالح عابد حسین نے صحیح لکھا ہے:

''غالبؔ اور حالیؔ کے خطوط ایک ساتھ پڑھیے تو آپ کو ان میں وہی فرق نظر آئے

گا جو ان کی شخصیت، سیرت اور شاعری میں ہے۔ایک میں شوخی ہے بے باکی

ہے، ندرت بیان اور حسنِ ادا ہے لیکن ایک کے ساتھ شکوہ ہائے روز گار ہیں مشکلوں کا گلہ ہے۔ بڑھاپے اور ناداری کا رونا ہے اور ناقدری کا صدمہ ہے اور رئیسوں اور امیروں کے درباروں سے توسط اور کچھ حصول کی کوششوں کے اذکار ہیں دوسرے کے یہاں ادبی خوبیاں اور فنی لطافتیں پیدا کرنے کی کوشش کہیں نہیں بڑی سیدھی سادی بے تکلف اور سچی باتیں ہیں جو مکتوب نگار کے دل سے نکلتی ہیں اور قاری کے دل میں اتر جاتی ہیں۔"(۴۸)

حالی کے تمام خطوط کو دیکھ لیجیے ان میں کہیں بھی آپ کو ناقدری زمانہ کا شکوہ یا بڑھاپے اور غم روزگار کا رونا نظر نہیں آئے گا بلکہ ان میں ادبیت کے ساتھ ساتھ ایک امید اور شگفتگی نظر آئے گی جو ان کے خطوط کو عمدگی عطا کرتی ہے۔اس کے ساتھ دردمندی، اخلاص اور قومی درد بھی جا بجا بکھرا ہوا نظر آئے گا یہ حالی کے خطوط اور ان کی مکتوباتی نثر کی بڑی نمایاں اور اہم صفت ہے جو ان کو منفرد کرتی ہے۔وہ اپنی ذات کو نمایاں کرنے کی بجائے قومی درد اور ہمدردی کو اجاگر کرتے ہیں۔ حالؔی کی اس صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر حمید احمد خان نے ارمغان حالی میں لکھا ہے:

"مولانا حالؔی کی ذاتی دردمندی اور اخلاص تو قدرۃً یہاں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح ان تمام مضامین میں جو انھوں نے خاص طور پر بغرض اشاعت لکھے۔ مزید لطف اس جگہ یہ ہے کہ ان متفرق خطوں میں بھی تعمیرِ قوم کے متعلق حالؔی کا مفطر بانہ جذبہ جا بجا چھلکا پڑتا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ اس معاملے میں ان کے خانگی خط بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ حالؔی کے خطوں کا مطالعہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ حالی نے جس سیدھی اور بے تکلف زبان میں اپنے ذاتی خط لکھے۔وہی انھوں نے اپنی علمی اور رفاہی تحریروں میں استعمال کی۔"(۴۹)

مولانا حالؔی اپنی تحریروں میں ادبی مصلحتوں کا شکار نہیں ہوتے وہ سچی اور بے لاگ بات جوان کے دل

میں ہوتی ہے کر جاتے ہیں۔ان کا مخاطب بھی کوئی خاص طبقہ یا گروہ نہیں بلکہ وہ ہر طبقے امیر،غریب، چھوٹے بڑے سب کے لیے لکھتے ہیں اور یہ تمام ان کے مخاطب ہیں شاید اسی لیے وہ عام فہم اور سادہ بیانی کے قائل ہیں۔ ان کے ہاں اگر چہ عربی فارسی ہندی یہاں تک کہ انگریزی الفاظ بھی ملتے ہیں۔ جو وہ اپنی تحریروں میں استعمال کرتے ہیں لیکن مجموعی عبارت سلاست روانی اور سادگی ہی سے مزین ہوتی ہے۔مولانا حالؔی کی تحریروں کے متعلق یہ بھی ایک اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کی بعض جگہوں پر سپاٹ ہو جاتی ہے۔اور ان کی نثر کا مجموعی رنگ پھیکا پڑنے لگتا ہے۔لیکن انھوں نے اس زمانے کے حالات و واقعات کے پیش نظر اعلیٰ اور بلند مقاصد کی خاطر مرصع نگاری اور رنگینی کو ترک کر کے سادہ بیانی اور سلاست و روانی کی طرف توجہ دی وگرنہ ہر طرح کی نثر لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔اس ضمن میں ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں:

> ''بیان کی سادگی اور صفائی زبان کی نرمی و گھلاوٹ حالی کا حصہ ہے۔اردو زبان کے پودے کو علمیت بگھارنے والے اس ڈھب پر لا رہے تھے کہ اپنی زمین چھوڑ کر عربی، فارسی کے تناور درخت کے طفیلی بن جائے۔حالؔی کا یہ احسان بھی کچھ کم نہیں کہ انھوں نے اسے جڑ سے مضبوط کر کے اپنے بل پر چڑھنے اور پنپنے کے قابل کر دیا۔''(۵۰)

مولانا حالؔی نے نظم و نثر دونوں میں اپنی انفرادیت قائم رکھی اور اسی بنا پر وہ سرسید کے تمام رفقاء میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔انھوں نے اردو زبان کی وسعت و ترقی میں جو نمایاں کارہائے سرانجام دیے ہیں انھیں اردو ادب کا کوئی قاری کوئی طالب علم فراموش نہیں کر سکتا۔

حوالہ جات

۱۔ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر، مقدمہ مکتوبات حالی، حصہ اول، حالی پریس پانی پت، ۱۹۲۵ء، ص۱۴

۲۔ غلام رسول مہر، مولانا، نقوش مکاتیب نمبر، حصہ اول، مرتب محمد طفیل، ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۵۷ء، ص۱۴

۳۔ معین الدین احمد، انصاری، شبلی مکاتیب کی روشنی میں، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۵ء، ص۶

۴۔ شاہ علی، سید، ڈاکٹر، اردو میں سوانح نگاری، گلڈ پبلشنگ ہاؤس کراچی، حیدر آباد، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص۲۱

۵۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، اردو خط نگاری، مشمولہ نقوش مکاتیب نمبر، حصہ اول، ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۵۷ء، ص۱۷

۶۔ افتخار احمد صدیقی، مقدمہ موعظہ حسنہ، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء، ص۴

۷۔ غالب، اسداللہ خان، اردو معلیٰ، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل، جلد دوم، حصہ اول، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۹ء، ص۴۹۹

۸۔ غلام رسول مہر، مقدمہ خطوط غالب، مشمولہ تنقید غالب کے سو سال، مرتبہ گروپ کیپٹن فیاض محمود، مطبوعہ مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء، ص۲۹۵

۹۔ ساغر نظامی (مرتب)، روح مکاتیب، حصہ اول، مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ، ۱۹۴۱ء، ص۱۷

۱۰۔ ایضاً، ص۲۱

۱۱۔ ایضاً، ص۱۹

۱۲۔ معین الدین احمد، انصاری، شبلی مکاتیب کی روشنی میں، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۶۵ء، ص۹

۱۳۔ شمس الرحمٰن بی اے، اردو خطوط، کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی، ۱۹۴۷ء، ص۵۲

۱۴۔ سرسید احمد خان، مکتوبات سرسید، مرتب شیخ اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۴ء، ص۳۴۹

۱۵۔ شمس الرحمٰن بی اے، اردو خطوط، ص۶۱

۱۶۔ سرسید احمد خان، مکتوبات سرسید، مرتب شیخ اسماعیل پانی پتی، جلد دوم، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۵ء، ص۳۱۶

۱۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، محمد حسین، آزاد خطوط کے آئینے میں، مشمولہ آزاد صدی مقالات، مرتبین ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورنٹیل کالج، ۲۰۱۰ء، ص ۳۲۷

۱۸۔ نذیر احمد ڈپٹی، موعظہ حسنہ، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۱۳۸، ۱۳۹

۱۹۔ شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی، مرتبہ سید سلمان ندوی، مطبوعہ معارف اعظم گڑھ، باہتمام مسعود علی ندوی، ۱۹۲۸ء، ص ۱۰، ۹

۲۰ شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی، حصہ اول، مرتبہ مولانا سید سلمان ندوی، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ص ۸۹

۲۱۔ مالک رام، اردو کے منفرد مکتوب نگار، نقوش مکاتیب نمبر، ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۴۵

۲۲۔ مہدی حسن آفادی، مکاتیب مہدی، مرتبہ مہدی بیگم، آسی پبلشرز گورکھپور، جون ۱۹۳۸ء، ص ۱۵۱

۲۳۔ الذبیر، سہ ماہی، شمارہ نمبر ۲، اردو اکیڈمی بہاول پور، ۲۰۰۲ء،

۲۴۔ جاوید اقبال سید، مکتوبات امیر کا دستیاب ذخیرہ، اردو اکیڈمی بہاولپور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۶

۲۵۔ عبداللہ سید، ڈاکٹر، اردو خط نگاری، نقوش مکاتیب نمبر، ص ۳۰، ۳۱

۲۶۔ حالی الطاف حسین، مکتوبات حالی، حصہ دوم، مرتبہ خواجہ سجاد حسین، حالی پریس پانی پت، ۱۹۲۵ء، ص ۲۸۹

۲۷۔ حالی الطاف حسین، مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، اردو مرکز گنپت روڈ لاہور، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۰ء، ص ۱۰، ۹

۲۸۔ صالحہ عابد حسین، یادگار حالی، ارسلان بکس علامہ اقبال روڈ میر پور، آزاد کشمیر، سن ندارد، ص ۲۲۷

۲۹۔ شجاعت علی سندیلوی، مطالعہ حالی، سرفراز قومی پریس، نادان محل روڈ لکھنؤ، ۱۹۵۶ء، ص ۱۸۲

۳۰۔ سرسید احمد خان، مکتوبات سرسید، جلد اول، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلسِ ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۵۲۔۵۱

۳۱۔ حالی، الطاف حسین، مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ص ۱۲۸

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۳۳۔ ایضاً،ص ۱۵۷

۳۴۔ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخ اردو، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، حیدرآباد، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۶۳۸

۳۵۔ صالحہ عابد حسین، یادگار حالی، ص ۲۴۶

۳۶۔ عبداللہ سید، ڈاکٹر، اردو خط نگاری، ص ۳۰

۳۷۔ حالی، الطاف حسین، مکتوبات حالی، حصہ دوم، مرتبہ خواجہ سجاد حسین، ص ۴۰۳

۳۸۔ صالحہ عابد حسین، یادگار حالی، ص ۲۴۸

۳۹۔ حالی الطاف حسین، مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ص ۱۰۷

۴۰۔ ایضاً، ص ۸۷

۴۱۔ ایضاً، ص ۴۲

۴۲۔ ایضاً، ص ۶۱

۴۳۔ ایضاً، ص ۶۶

۴۴ غالب اسداللہ خان، دیوان غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، کراچی، سن ندارد، ص ۱۱۱

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۷

۴۶۔ حالی الطاف حسین، مکاتیبِ حالی، مرتب اسماعیل پانی پتی، ص ۶

۴۷۔ مکاتیبِ حالی، مرتب اسماعیل پانی پتی، ص ۳۸

۴۸۔ صالحہ عابد حسین، یادگار حالی، ص ۲۴۶

۴۹۔ حمید احمد خان، پروفیسر، ارمغانِ حالی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۱۲۲

۵۰۔ عابد حسین، ڈاکٹر، عرض مرتب، مقالہ مشمولہ مسدس حالی، صدی ایڈیشن، مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، بزم اقبال لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۵

باب دوم

مکتوباتِ حالؔی میں حالؔی کی شخصیت

خاندان، ولادت، تعلیم، اساتذہ اور احوال و آثار

حیاتِ حالؔی سنین کے آئینے میں

۱۔ ۱۸۳۷ء بمطابق ۱۲۵۳ھ ولادت بمقام پانی پت

۲۔ ۱۸۴۲ء تا ۵۴ پانی پت میں ابتدائی تعلیم کا زمانہ

۳۔ ۱۸۵۴ء میر باقر علی کی بیٹی اسلام النساء سے شادی

۴۔ ۱۸۵۴۔۵۵ء دہلی میں بے قاعدہ تعلیم کا زمانہ

۵۔ ۱۸۵۵ء دہلی سے پانی پت واپسی

۶۔ ۱۸۵۶ء ضلع حصار میں کلکٹر کے دفتر میں ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز

۷۔ ۱۸۵۷ء جنگ آزادی کا آغاز

۸۔ ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۳ء بے روزگاری کا زمانہ

۹۔ ۱۸۶۳ء نواب محمد مصطفٰے خاں شیفتہ سے ملاقات اور ان کے صاحب زادے نقش بند خاں کے اتالیق مقرر

۱۰۔ ۱۸۶۸ء شیفتہ کی وفات

۱۱۔ ۱۸۶۹ء غالب کی وفات

۱۲۔ ۱۸۷۰ء پنجاب بک ڈپو لاہور میں ملازمت

۱۳۔ ۱۸۷۰ء محکمہ تعلیم پنجاب کے میگزین ''اتالیق پنجاب'' کے نائب مدیر مقرر

۱۴۔ ۱۸۷۴ء انجمنِ پنجاب کا پہلا مشاعرہ جس میں نظم ''برسات'' پڑھی/ نیچرل شاعری کا آغاز

۱۵۔ ۱۸۷۴ء مجالس النساء لکھی

۱۶۔ ۱۸۷۵ء اینگلو عربک سکول دہلی میں مدرس

۱۷۔ ۱۸۷۶ء حالی کے والد خواجہ ایزد بخش کا انتقال

۱۸۔ ۱۸۷۷ء علی گڑھ کالج کا قیام

۱۹۔ ۱۸۷۹ء علی گڑھ کالج میں پہلی دفعہ آمد

۲۰۔ ۱۸۷۹ء مسدس حالی

۲۱۔ ۱۸۸۶ء خواجہ امداد حسین (برادرِ حالی) کی وفات

۲۲۔ ۱۸۸۷ء دوبارہ لاہور آمد

۲۳۔ ۵ جون ۱۸۸۷ء اینگلو عربک (اینچی سن) کالج سے دلی واپسی

۲۴۔ ۱۸۸۸ء نواب سر آسماں جاہ سے ملاقات ۷۵ روپے وظیفہ مقرر

۲۵۔ ۱۸۹۱ء ملازمت سے استعفیٰ

۲۶۔ ۱۸۹۲ء سرسید کے ساتھ وفد میں شمولیت اور حیدر آباد دکن روانگی

۲۷۔ ۱۸۹۲ء وظیفہ ۷۵ سے ۱۰۰ روپے مقرر

۲۸۔ ۱۹۰۰ء۔۱۸۹۵ء حیات جاوید کی تصنیف کا زمانہ

۲۹۔ ۱۸۹۸ء۔۱۸۹۵ء یادگارِ غالب کا زمانہ تصنیف

۳۰۔ ۱۸۹۳ء نامی پریس کانپور سے دیوان حالی کی اشاعت

۳۱۔ ۱۸۹۸ء سرسید کی وفات

۳۲۔ ۱۹۰۰ء حالی کی اہلیہ اسلام النساء کی وفات

۳۳۔ ۱۹۰۴ء شمس العلماء کا خطاب

۳۴۔ ۱۹۰۵ء میں میر محبوب علی خاں کی دعوت پر جشنِ چہل سالہ میں شرکت

۳۵۔ ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۶ء قیامِ دکن

۳۶۔ ۱۹۰۶ء پانی پت واپسی

۳۷۔ ۱۹۰۷ء آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کراچی میں شرکت

۳۸۔ ۱۹۰۷ء آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر منتخب

۳۹۔ ۱۹۱۳ء مسلسل بیمار (بیماری کا زمانہ)

۴۰۔ ۱۹۱۴ء فالج کا حملہ قوتِ گویائی ختم ہوگئی

۴۱۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۱۴ء صاحب فراش ہو گئے

۴۲۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء رات دو بجے انتقال

۴۳۔ ۷۷ برس عمر

حالی سنین کے آئینے میں کی تیاری کے سلسلے میں درج ذیل کتابوں اور تحریروں سے استفادہ کیا گیا:

۱۔ یادگارِ حالی، صالحہ عابد حسین

۲۔ تذکرہ حالی، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

۳۔ حالی بحیثیت شاعر، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

۴۔ ارمغانِ حالی، حمید احمد خان

۵۔ حالی کی اردو نثر نگاری، ڈاکٹر عبدالقیوم

۶۔ مطالعہ حالی، ڈاکٹر وحید قریشی

۷۔ بیانِ حالی، خودنوشت مولانا حالؔی

۸۔ مکتوبات حالؔی، حصہ اول، دوم، مرتبہ خواجہ سجاد حسین

۹۔ مکاتیب حالؔی، مرتب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

۱۰۔ حالی کا سیاسی شعور، معین احسن جذبی

۱۱۔ کلیات نثر حالی جلد اول و دوم، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

۱۲۔ کلیات نظم حالی، جلد اول و دوم، مقدمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

۱۳۔ مثنویات حالی، مقدمہ مرتضیٰ حسین فاضل

پانی پت ضلع کرنال کا مشہور تاریخی قصبہ ہے جو دہلی سے ۵۳ میل کے فاصلے پر واقع ہے اور کئی حوالوں سے شہرت رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''ہندوستان کے مشہور سپہ سالار اور فاتح راجہ ارجن نے اس کی بنیاد رکھی۔''(۱) یہاں غوث علی شاہ قلندر کا مزارِ مبارک ہے۔ پانی پت کی مشہور لڑائیاں بھی یہیں لڑی گئیں اور اردو کے مایہ ناز نقاد، سوانح نگار، شاعر، مکتوب نگار اور ادبی نثر نگار خواجہ الطاف حسین حالؔی کا مسکن و مدفن بھی ہے۔

انسان اپنے کام اور شخصیت کے اعتبار سے پہچانا جاتا ہے اور انہی دو حوالوں سے زندہ رہتا ہے۔ اس کی تصانیف اور تالیفات اسے ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیتی ہیں۔ مولانا حالؔی اردو ادب کی ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت ہیں جو نہ صرف اپنے کام بلکہ اپنی ذات اور کردار کے حوالے سے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''مجھے بہت سے نامور لوگوں کے ساتھ ملنے اور بعض کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن میں نے خلوص و صداقت، ہمدردی و رواداری میں حالؔی کا ہم پایہ نہ پایا۔ وہ ہماری اسلامی تہذیب و شرافت کا سچا نمونہ تھے۔''(۲)

مولانا الطاف حسین حالؔی ۱۸۳۷ء بمطابق ۱۲۵۳ھ پانی پت ضلع کرنال میں خواجہ ایزد بخش انصاری کے گھر پیدا ہوئے لیکن مالک رام نے اپنی کتاب ''تلازمہ غالب'' میں ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۳۶ء لکھی ہے چنانچہ لکھتے ہیں: ''مولانا حالؔی ۱۸۳۶ء، ۱۲۵۳ھ میں پانی پت کے ''محلہ انصار'' میں پیدا ہوئے۔''(۳)

مولانا حالؔی خود اپنی پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ بمطابق ۱۸۳۷ء میں بہ مقام قصبہ پانی پت جو شاہجہان آباد (دہلی) سے جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلے پر ایک قدیم بستی ہے،

واقع ہوئی۔"(۴)

مولانا اپنے سلسلہ نسب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس قصبہ میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے، آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ غیاث الدین بلبن تختِ دہلی پر متمکن تھا۔ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیرِ ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علومِ متعارضہ میں اپنے تمام معاصرین سے ممتاز تھے، ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے، جن کا سلسلہ نسب ۲۶ واسطوں سے حضرت ابوایوب انصاریؓ تک اور ۸ا واسطوں سے شیخ الاسلام تک اور ۱۰ واسطوں سے ملک محمود شاہ انجو ملقب بہ آق خواجہ تک (جو غزنوی دور میں فارس و کرماں و عراق و عجم کا فرماں روا تھا) پہنچتا ہے۔"(۵)

جبکہ ڈاکٹر خلیق انجم محمد شاہ انجو ملقب بہ آق خواجہ کے بارے میں حالی سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"محمود شاہ انجو کے بارے میں حالی کی اطلاع صحیح نہیں ہے۔ وہ غزنوی دور سے تعلق نہیں رکھتا اس کے بیٹے کا نام ابواسحاق انجو ہے۔ وہ حافظ کا ممدوح تھا ۷۵۸ھ میں امیر مبازرالدین سے مغلوب اور اس کے حکم سے قتل ہوا۔ ابواسحاق کے باپ کا نام شرف الدین محمود انجو تھا پہلے وہ امیر چوپان کا ملازم تھا پھر اس نے ایران کے جنوبی علاقے کو مسخر کر کے خود وہاں کا والی ہو گیا اس کا یہ خاندان انجو خاندان کہلاتا ہے اور اس خاندان کے حسبِ ذیل حکمران ہوئے۔

محمود شاہ پھر اس کے چار بیٹے جلال الدین، مسعود شاہ، غیاث الدین کے خسرو جمال الدین، ابواسحاق ابواسحاق اس کا آخرف فرمانبروا تھا جو مبازرالدین کے

ہاتھوں ۱۷۵۸ء میں مغلوب ہوا اور اس پر ہنجو خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔'' (۶)

غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۷ء) اہل علم و حکمت شعراء اور بزرگانِ دین کی بہت قدر کرتا تھا۔ وہ نہایت متقی، پرہیزگار اور صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا۔ علماء اور فضلا کی محفلوں میں شوق سے حاضر ہوتا تھا۔ دستر خواں میں اہل علم و فضل کے ساتھ کھانا کھانا پسند کرتا تھا۔ چنانچہ حالؔی کے جدِ اعلیٰ خواجہ ملک علی جب ہندوستان میں وارد ہوئے اور پانی پت میں سکونت اختیار کی تو بلبن نے پانی پت میں چند دیہات بطور مدد معاش ان کے لیے وقف کیے اور قاضی شریعت، خطابتِ عیدین و دینی معاملات کی صدارت تولیت مزاراتِ دینی اور بازار کی قیمتوں کی نگرانی جیسے عہدے عطا کیے۔

مولانا حالؔی نے ابتدائی تعلیم پانی پت میں قاری ممتاز علی کے مکتب سے حاصل کی۔ قاری صاحب درس و تدریس سے دلچسپی رکھتے تھے اور عربی فارسی میں دسترس حاصل تھی۔ حالؔی نے ان کے مدرسے سے قرآن پاک حفظ کیا اور کئی ایک کتابیں پڑھیں، بعد ازاں سید جعفر علی سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ یہیں سے فارسی ادب کا ذوق پیدا ہوا۔ ان کی صحبت سے فارسی زبان و ادب میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ شاعری کے فطری رجحان کو جلا ملی۔

عربی زبان کی تعلیم حاجی ابراہیم انصاری (جو پانی پت کے رہنے والے تھے اور جنھوں نے لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی اور امامت کی سند لے کر آئے تھے) سے حالی نے نحو اور عربی گرائمر پڑھی۔ مولانا حالؔی کی طبیعت میں شروع سے ہی حصول علم کا جذبہ موجود تھا یہی وجہ ہے کہ وہ تحصیل علم کے لیے بے چین و بے قرار رہتے۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں انھوں نے فارسی عربی میں اچھی طرح لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا اور علم و ادب کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ انھوں نے نذیر حسین محدث، فیض الحسن سہارنپوری اور امیر احمد سے بھی علمی فیض حاصل کیا۔

مولانا حالی کے والد خواجہ ایزد بخش انصاری ''جو کہ سرکار انگریزی کے سررشتہ پرمٹ میں معمولی ملازم تھے۔ ۱۸۴۵ء میں بہ عمر چالیس سال آپ کا انتقال ہو گیا۔''(۷) ان کی والدہ کا تعلق پانی پت کے مشہور سید خاندان سے تھا اور سیدہ آمنۃ الرسول نام تھا۔ گویا حالی والد کی طرف سے انصاری اور والدہ کی طرف سے سادات گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جن کا سلسلہ نسب شیخ اسماعیل پانی پتی نے کلیات نثر کے صفحہ ۱۰ اور ۲۰ پر دیا

ہے۔حالی کی پیدائش کے بعد ان کی والدہ کا دماغی توازن بگڑ گیا اور وہ جلد ہی دارفانی سے رخصت ہو گئیں۔یوں حالی ماں کی شفقت و محبت سے محروم ہو گئے۔اس کے کچھ عرصہ بعد جب وہ ۹ برس کے تھے تو ان کے والد کا بھی انتقال ہو گیا اور وہ اپنے بڑے بہن بھائیوں کی تربیت میں آ گئے۔حالی خود لکھتے ہیں:

''میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا میرے والد نے سنِ کہولت میں انتقال کیا جبکہ میں ۹ برس کا تھا۔اس لیے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔''(۸)

والدین سے محرومی اور معاشی ناہمواری نے حالی کی زندگی میں گہرے اثرات مرتب کیے۔ان کی زندگی کا ابتدائی حصہ غربت و تنگ دستی میں گزرا لیکن اس زمانے میں بھی انھوں نے حصولِ تعلیم پر توجہ مرکوز رکھی اور کسب معاش میں بھی لگے رہے۔مرتضیٰ حسین فاضل نے اس معاشی ناہمواری کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''خواجہ ایزد بخش انصاری پانی پت کے پریشان حال گھر سے تعلق رکھتے تھے ان کے آخری حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ بقول حالی سررشتہ پرمٹ اور بقول حامد حسن قادری محکمہ نمک میں ملازم تھے۔ان کی اہلیہ پانی پت ہی کے ایک سید خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور وہ دونوں شیعہ تھے۔''(۹)

مولانا حالی کو باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ ملا اور نہ ہی وہ تعلیمی تسلسل کو قائم رکھ سکے۔علاوہ ازیں حالؔی کے بہن بھائیوں نے جن کی وہ بے حد عزت کرتے تھے اور والدین کی جگہ سمجھتے تھے نے شادی پر مجبور کیا۔ چنانچہ حالی نے بہن بھائیوں کے فیصلے کے آگے سرِتسلیم خم کیا۔وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ بڑے بھائی کا نام خواجہ امداد حسین تھا جو شاعر بھی تھے اور مظہر تخلص کرتے تھے۔اس کے علاوہ دو بہنیں تھیں بڑی بہن کا نام امت الحسین اور دوسری بہن کا نام وجیہہ النساء تھا۔بڑی بہن کے شوہر کا نام حکیم خواجہ محمد علی تھا جبکہ وجیہہ النساء سید محمد حسین کے عقد میں تھیں۔بقول شیخ اسماعیل پانی پتی:

''وجیہہ النساء کی لڑکی ام الحسن صاحبہ خواجہ غلام الحسن صاحب (سابق انسپکٹر

> تعلیمات صوبہ گلبرگہ و مترجم فلسفۂ تعلیم سربرٹ سپنسر)اور آنریبل خواجہ غلام الثقلین
> صاحب (ایڈیٹر عصر جدید) کی والدہ اور خواجہ غلام السیدین صاحب (سابق
> پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی دادی تھیں۔"(۱۰)

حالی کی شادی میر باقر علی کی بیٹی اسلام النساء سے ۱۸۵۴ء میں کر دی گئی۔اگر چہ شادی کے بعد حالی کو اچھا ماحول مل گیا اور گھر والے بھی مطمئن ہو گئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ بھی ان کے کندھوں پر آن پڑھا۔وہ چاہتے تھے کہ نوکری کر کے گھر والوں کی معاونت کریں۔مولانا حآلی کی شادی کے وقت عمر ۱۷ سال تھی۔حالی کی بیوی خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔حآلی نے اس چیز کو غنیمت جانا کہ بیوی کا بوجھ ان پر نہیں،لیکن یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا حالی سسرال والوں کا احسان بھی نہیں لینا چاہتے تھے۔مولانا حآلی نے ایک روز جب ان کی بیوی میکے میں تھی چپکے سے رات کو اپنا سامان اٹھایا اور دلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ دلی پہنچ کر حالی مشرقی علوم کی مشہور درس گاہ مدرسہ حسین بخش میں داخل ہوئے جس کا ذکر اپنی خودنوشت سوانح حیات میں کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> "اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے سب کی یہ
> خواہش تھی کہ نوکری تلاش کروں مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ
> حال۔میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں
> رہ کر کچھ صرف ونحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو
> وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے پڑھیں۔"(۱۱)

حالی کے قیام دلی کے وقت دلی کالج بہت مشہور اور اہم درس گاہ تھی اور انگریزی تعلیم کا مرکز بھی۔مگر حالی نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہاں انگریزی تعلیم کے حصول کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔انگریزی تعلیم ذریعہ روزگار تھی۔علاوہ ازیں حالی جس مدرسہ میں پڑھتے تھے وہاں دلی کالج کے طلباء کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔یہی وجہ ہے ہے مولانا حالی کا یہاں انگریزی تعلیم کا پہلو کمزور رہ گیا اور وہ انگریزی تعلیم سے نابلد رہے۔

اگر چہ اس زمانے میں دلی کالج میں مولوی ذکاءاللہ، محمد حسین آزاد، نذیر احمد وغیرہ زیرِ تعلیم تھے مگر حالی نے نہ تو کالج میں جا کر کبھی ان کو دیکھا اور نہ ہی ان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مولوی عبدالرزاق کانپوری نہ جانے کس بنا پر اپنی کتاب ''یادِ ایام'' میں لکھتے ہیں:

''خواجہ حالی، محمد حسین آزاد، ذکاءاللہ اور کریم بخش کالج میں ہم درس تھے۔ چنانچہ غدر سے چار سال قبل یہ چاروں دوست فارغ التحصیل ہو کر مصروف ملازمت ہوئے۔''(۱۲)

حالی اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھتے ہیں:

''اگر چہ اس وقت دلی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشو ونما پائی تھی وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان پر منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم خاص کر پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہ آتا تھا اور اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے، نہ یہ کہ اس سے علم حاصل ہوتا تھا بلکہ بر خلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علماء جہلے کہتے تھے۔''(۱۳)

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مدارس سے فارغ التحصیل حالی کی شخصیت میں علمی و ادبی حسن کا امتزاج نظر آتا ہے جو ان کو اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں سے ممتاز کرتا ہے اور جس نے آگے چل کر اردو ادب کو کوئی حوالوں سے متاثر کیا اور آج بھی طویل عرصہ گزرنے کے باوجود ان کے تنقیدی، سوانحی اور علمی نظریات بطور حوالہ پیش کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے کئی ایک نئی ادبی تحریکات کا آغاز کیا۔ اردو ادب کے جدید دور کا آغاز بھی ان کے مرہون منت ہے۔ دلی میں قیام کے دوران انھوں نے مولوی نوازش علی کے علاوہ مولوی فیض الحسن سہارنپوری مولوی امیر احمد اور شمس العلماء مولوی نذیر احمد سے بھی مختلف علوم پڑے اور یہ بھی مولانا کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔

مولانا حالی جب دلی میں مقیم تھے اور تحصیل علم کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے

اس زمانے میں مولانا نے شعر گوئی شروع کر دی تھی۔مولانا کی دلی میں موجودگی کی خبر ان کے خاندان میں پہنچی تو مولانا کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین اور دیگر افراد کے ہمراہ دلی آئے اور مولانا حالؔی کو ساتھ جانے پر اصرار کیا۔ اگر چہ مولانا حالؔی نے تعلیمی سلسلے کو منقطع نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن اپنے بھائی کی بات سے انکار نہ کر سکے اور ان کے ہمراہ پانی پت چلے آئے یہ ۱۸۵۵ء کا زمانہ تھا۔حالؔی خود لکھتے ہیں:

''میں نے دلی میں شرح مسلم، ملا حسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چارو ناچار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔دلی سے آ کر برس ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔''(۱۴)

۱۸۵۶ء میں حالی کی عملی زندگی کا با قاعدہ آغاز ہوتا ہے جب انھیں ضلع حصار میں کلکٹر کے دفتر میں معمولی نوکری مل گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران واپس پانی پت آ گئے اور تقریباً چار برس کا عرصہ بے کاری کے عالم میں گزارا البتہ اس دوران بھی انھوں نے حصول تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور پانی پت میں اس زمانے کے مشہور علماء مولوی محبت اللہ مولوی عبدالرحمان اور مولوی قلندر علی مرحومین سے حدیث، تفسیر، منطق اور فلسفہ پڑھا اور اپنی تعلیمی استعداد کو بڑھاتے رہے۔علاوہ ازیں انھوں نے عربی نظم ونثر میں بھی استعداد پیدا کر لی تھی۔

قیام دلی کے دوران وہ مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے وہ ان کے فارسی اور اردو کلام سے نہ صرف مستفید ہوتے تھے بلکہ ان کے معانی و مطالب بھی براہ راست ان سے پوچھا کرتے تھے۔

بقول خلیل الرحمٰن داؤدی:

''حالی ان کے اردو اور فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتے تھے اور مرزا غالب کے چند فارسی قصیدے بھی اپنے دیوان سے مولانا حالی کو درساً پڑھائے تھے اسی زمانے میں مولانا حالی نے دلی کے

مشاعروں میں شرکت بھی کی تھی اور مرزا غالب سے داد بھی لی تھی۔"(۱۵)

یہیں سے مرزا غالب سے تعلقات اور شاگردی کا آغاز ہوتا ہے۔جس زمانے میں وہ مرزا غالب کے ہاں شرف بازیابی کے لیے جایا کرتے تھے کے متعلق خودنوشت میں لکھتے ہیں:

"ان کی عادت تھی کہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ:

اگر چہ میں کسی کو فکر شعر کی اصلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔"(۱۶)

اس زمانے میں انھیں زیادہ لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ ہی اس دور کی شعری تصانیف نظر آتی ہیں لیکن مرزا غالب کی یہ رائے آگے چل کر سچ ثابت ہوئی کیونکہ قدرت نے ان کے قلم کو تاثیر عطا کی اور ان کے ذہن و قلب میں وسعت بخشی۔مولانا حالی نے اردو نظم و نثر کے جس موضوع پر ہاتھ ڈالا وہ اسے بلندیوں تک لے گئے اس طرح انھوں نے نہ صرف تنقید، سوانح نگاری اور شاعری میں اپنے فن کے جوہر دکھائے بلکہ اردو مکتوب نگاری میں بھی اپنی پہچان بنا لی۔انھوں نے اردو زبان کو وسعت دی اور نثری سرمائے میں اضافے کرنے کے ساتھ ساتھ شعری تخلیقات کے ذریعے بھی اردو کے دامن کو مالا مال کیا۔حالی کی حیثیت اردو ادب میں کئی حوالوں سے ممتاز ہے۔انھوں نے غزلیات، قطعیات، رباعیات، نظمیں اور قصیدے بھی لکھے۔انھوں نے اردو مرثیہ نگاری کو ایک نئی جہت دی۔حکیم محمود خان اور مرزا غالب کا مرثیہ لکھ کر اردو مرثیہ میں بھی اپنی شناخت قائم کی۔مسدس حالی جیسی شہرہ آفاق نظم اردو شاعری میں شاید ہی نظر آئے۔حالی نے اس میں جو ادبی حسن اور اثر آفرینی کی کیفیت داخل کی ہے، تقریباً ایک سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزرنے کے باوجود بھی اس کی حیثیت کم نہیں ہوئی ہے اور اسی طرح پر اثر ہے جس طرح اپنے ابتدائی زمانے میں تھی۔مسدس شاعر کی پہچان بن چکی ہے بلکہ بعض حوالوں سے آج پہلے سے بھی زیادہ اہم ہوگئی ہے۔بقول مولوی عبدالحق:

''مسدس حالی زندہ جاوید کتابوں میں سے ہے اس کی درد بھری آواز دلوں کی تڑپاتی رہے گی اور اس کے دردمندانہ اقوال دلوں میں گھر کیے بغیر نہ رہیں گے۔ ادب کے رسیا اس ادبیت سے گر سیکھیں گے اور اخلاق کے بندے اس میں وہ بے بہا جواہر پائیں گے جن سے دوسری دکانیں خالی ہیں۔''(۱۷)

۱۸۵۷ء کے بعد پورے ہندوستان میں افراتفری کا عالم تھا اور حالات نہایت مخدوش تھے فکر معاش اور فکرِ جان و مال کا اندیشہ ہر جگہ موجود تھا۔ حالی بھی ضلع حصار سے نوکری چھوڑ کر پانی پت آ چکے تھے۔ بے کاری کا عالم تھا۔ چنانچہ حالی کو بھی ان حالات نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ حالی کے لیے یہ بڑی خوش قسمتی کی بات تھی کہ ان کی ملاقات نواب مصطفیٰ خاں تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے ہوئی۔ نواب صاحب شعر و سخن کا بہت عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے۔ حالی نے سات آٹھ سال نہ صرف ان کی مصاحبت میں گزارے بلکہ ان کے بچوں کے اتالیق بھی مقرر رہوئے۔ اس ضمن میں مالک رام دہلوی اپنی کتاب تلامذہ غالب میں لکھتے ہیں:

''غدر کے بعد حسنِ اتفاق سے وہ واقعہ پیش آیا جس نے انھیں مولوی الطاف حسین سے حالی بنا دیا۔ ۱۸۶۳ء میں وہ نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ کے مصاحب اور ان کے منجھلے صاحبزادے نقش بند خاں مہجور کے اتالیق ہو کر جہانگیر آباد ضلع بلند شہر چلے گئے۔ شیفتہ جہاں جیدِ عالم تھے۔ وہاں اردو اور فارسی کی نظم و نثر کا بھی نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے اور جہاں تک نقدِ سخن کا تعلق ہے اپنے زمانے سے یقیناً بہت آگے تھے۔ حالی کو خوش قسمتی سے ایسے یگانہ روزگار شخص کی مصاحبت میسر آ گئی شیفتہ اردو اور فارسی میں مومن اور غالب کے شاگرد تھے اور اس عہد کے جملہ اصحابِ کمال ان کے احباب میں سے تھے۔ چنانچہ حالی کو بھی ان کی معیت میں مفتی صدر الدین خان آزردہ، مرزا اسد اللہ خان غالب، نواب ضیاء الدین احمد خاں

نیر رخشاں، حکیم احسن اللہ خاں اور دوسرے ارباب علم وفن سے ملنے کا موقع ملا۔'' (۱۸)

حالؔی کے وہاں جانے سے ان کی شعر وسخن کے ذوق میں اور زیادہ اضافہ ہوا انھیں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں ان کی صحبت میں لکھنے کا موقع ملا اور حالؔی بھی اپنا کلام نواب شیفتہ کے کلام کے ساتھ جہانگیر آباد سے مرزا غالب کے ہاں دلی بھیجا کرتے تھے۔ مولانا حالؔی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق وواقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی بات کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ ومحاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔'' (۱۹)

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا

شیفتہ کا ۱۱ جولائی ۱۸۶۹ء کو انتقال ہوا تو حالی کو دوبارہ فکر معاش لاحق ہوا، چنانچہ وہ ۱۸۷۰ء میں لاہور آ گئے اور پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں حالی کا کام انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت کی اصلاح یا تصحیح کا تھا۔ مولانا حالی نے تقریباً چار برس گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازمت کی۔ یہاں سے انھیں انگریزی لٹریچر سے باقاعدہ شناسائی ہوئی اور وہ انگریزی ادب کی بہت سی کتابوں سے متعارف ہوئے اور لامحالہ اس کام کی وجہ سے انھیں انگریزی ادب کے ساتھ مناسبت بھی پیدا ہوتی گئی۔ لاہور ہی میں حالی کی ملاقات محمد حسین آزاد سے ہوئی۔ جنھوں نے کرنل ہالرائڈ، ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ساتھ مل کر نئی طرز کے مشاعروں کی بنیاد رکھی تھی۔ ۱۸۷۴ء میں پہلا مشاعرہ لاہور میں ہوا جو اردو شاعری میں بالکل نیا اور منفرد تجربہ تھا۔ ان مشاعروں میں طرح مصرع کی بجائے شعراء کو عنوان دیا جاتا تھا۔ حالؔی نے ان مشاعروں میں حصہ لیا اور مختلف عنوانات پر نظمیں لکھیں۔ وہ اپنی خودنوشت سوانح حیات میں لکھتے ہیں:

''میں نے اس زمانے میں چار مثنویاں، ایک برسات پر دوسری امید پر تیسری

انصاف پر اور چوتھی حبِ وطن پر لکھیں۔"(۲۰)

۱۸۷۰ء میں جب حالی لاہور میں مقیم تھے اور گورنمنٹ پنجاب بک ڈپو لاہور میں ملازمت کرتے تھے اسی دوران وہ سر رشتہ تعلیمات پنجاب کے اردو میگزین اتالیق پنجاب کے نائب مدیر بھی رہے۔اس وقت میجر فلر ڈائریکٹر تعلیمات تھے لیکن مولانا حالی کو جلد ہی لاہور سے دلی جانا پڑا۔ایک تو مولانا کو دہلی کے اینگلو عربیک اسکول کی مدرسی مل گئی علاوہ ازیں مولانا کو نہ صرف دلی کی یاد آئی بلکہ وہاں کی محفلیں، مجلسیں اور دوستوں کی یادیں بھی ستاتی تھیں اس کے علاوہ لاہور سے جانے کی ایک اور وجہ بھی ڈاکٹر وحید قریشی نے آزاد کے حوالے سے لکھی ہے وہ یہ کہ: "محکمے میں وہابیوں کا زور ہو گیا تھا۔"(۲۱)

مولانا حالی کے اپنے اشعار سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اب لاہور میں وہ بیگانگی محسوس کرتے تھے اور پرانی صحبتوں اور محفلوں کو یاد کیا کرتے تھے۔ملاحظہ ہو:

دلاتی ہے صبا کس کو چمن یاد
نہ میں بلبل ، نہ میرا گھر چمن ہے
کروں تجھ سے بیاں کچھ دردِ غربت
مگر جوشِ سخن مہرِ دہن ہے
رہا لاہور میں آ کر سو جانے
یہی دنیا ، یہی دارالمحن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام
کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے
مجھے تنہا نہ سمجھیں اہلِ لاہور
تصور میں میرے اک انجمن ہے
میری خلوت میں ہے ہنگامہ بزم

خموشی میں میری ذوق سخن ہے
بتاؤں تم کو ہوں کس باغ کا پھول
جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے
بتاؤں تم کو ہوں کس مصر کی بو
جہاں غربت وطن پہ خندہ زن ہے
نہ لینے دے گا جنت میں بھی آرام
یہی گر جذبۂ حب وطن ہے
بھلا حالی اور الفت سے ہو خالی
یہ سب تم صاحبوں کا حسنِ ظن ہے (۲۲)

قیام لاہور کے دوران ہی مولانا نے ملازمت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی شروع کر دیا تھا اور انھوں نے کچھ کتابیں بھی لکھیں جن میں طبقات الارض، مبادی علم جیالوجی ۱۸۸۳ء، اصول فارسی وغیرہ اہم ہیں۔ تریاق مسموم بھی ان کی قیام لاہور ہی کی تصنیف ہے۔ یکم جون ۱۸۸۷ء کو لاہور سے اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"برخوردار الحمد اللہ کہ تصدق حسین سکنڈ ڈویژن میں چوتھے نمبر پر پاس ہو گئے ہیں۔ تم کو اور ہم سب کو مبارک ہو۔ اپنی خیریت سے جلد جلد مطلع کرتے رہو۔ مجھے آٹھ سات روز پیچش رہی۔ اب کئی دن سے ڈاڑھ میں درد ہے مگر روز بروز کم ہوتا جاتا ہے۔ میرا یہاں رہنے کا ارادہ نہیں۔ اگر جناب ڈائریکٹر صاحب بہادر اور جناب جنرل صاحب بہادر نے بخوشی اجازت دے دی تو میں جلد واپس چلا جاؤں گا۔ مفصل حالات سے پھر اطلاع دوں گا۔ محمود خاں کو یعنی نانو خاں کو دعا کہنا اور اس کو آرام سے رکھنا یہ لکھو کہ تمہارا ضلع کا دورہ کب تک ختم ہو جائے گا۔

زیادہ دعا۔

الطاف حسین از لاہور ایچی سن کالج

۵ مئی ۱۸۸۷ء'' (۲۳)

۱۸۷۵ء میں حالی اینگلو عربک کالج دہلی چلے گئے اور مدرس عربی مقرر ہوئے۔ دہلی سے مولانا حالی ایک مرتبہ پھر لاہور آئے اور ایچی سن کالج میں ملازمت اختیار کی کیونکہ مکتوبات حالی حصہ دوم میں آٹھ خطوط ایچی سن کالج سے لکھے گئے ہیں جن کی تواریخ۔ درج ذیل ہیں:

''۶ مارچ ۱۸۸۷ء، ۷ مارچ ۱۸۸۷ء، ۱۵ مارچ ۱۸۸۷ء، ۱۸ اپریل ۱۸۸۷ء، ۲۱ اپریل ۱۸۸۷ء، ۵ مئی ۱۸۸۷ء، ۱۱ مئی ۱۸۸۷ء اور ۱۶ مئی ۱۸۸۷ء۔ (۲۴)

یہ خطوط خواجہ سجاد حسین کے نام ہیں اور مکتوبات حالی حصہ دوم کے صفحہ نمبر ۹۵ تا ۱۰۱ پر درج ہیں۔ ایک اور خط دیکھیے جو ۱۱ مئی ۱۸۸۷ء کو ایچی سن کالج سے لکھا گیا ہے اور خواجہ سجاد حسین کے نام ہے۔ لکھتے ہیں:

''برخوردار۔ محمود خان کے خط سے معلوم ہوا کہ تم دورے سے واپس آ گئے ہو۔ تعجب ہے کہ اب تک تمام ضلع کا دور ختم نہیں ہوا۔ گرمی بہت سخت پڑنے لگی ہے۔ امید ہے کہ رات کو چلنا ہوتا ہوگا۔ مفصل لکھو کہ کب تک دونوں تحصیلیں جو باقی رہتی ہیں دیکھ لوگے۔ یہاں کے حالات پھر کسی وقت مفصل لکھوں گا۔ تم یہ لکھو کہ اب کب تک فیروز پور میں ٹھہرو گے اور گرمی کا اس طرف کیا حال ہے۔ پانی پت، پھیبھوند، شاہجہان پور، تتاوی وغیرہ میں خیریت ہے۔ نانو خاں سے کہہ دو کہ ابھی چند روز اور صبر کرے پھر رخصت مل جائے گی۔ زیادہ دعا۔

الطاف حسین از لاہور ایچی سن کالج

تمہارا کارڈ بھی پہنچ گیا ہے جواب مفصل آج میں لکھوں گا۔

۱۱ مئی ۱۸۸۷ء''(۲۵)

درج بالا خطوط سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مولانا حالی دوبارہ لاہور آئے تھے اور ایچی سن کالج میں ملازمت اختیار کی تھی اور ۵ جون ۱۸۸۷ء کو واپس دہلی چلے گئے تھے اس سلسلے میں ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں: ''۵ جون ۱۸۸۷ء حالی واپس دہلی پہنچ گئے۔''(۲۶)

ڈاکٹر وحید قریشی کی یہ رائے حقیقت پر مبنی ہے کیونکہ یکم جون ۱۸۸۷ء کو لاہور سے اپنے فرزند اکبر خواجہ سجاد حسین کو لکھا گیا خط ملاحظہ فرمائیں:

''برخوردار۔ میری اسامی کا انتظام ہوگیا ہے غالباً ۵ یا ٦ جون تک انشا اللہ تعالیٰ دہلی کو روانہ ہو جاؤں گا اس وقت فیروز پور میں آنا اور وہاں تمہارے انتظار میں ٹھہرنا دِقت سے خالی نہ ہوگا۔ اس لیے انشا اللہ العزیز آپ سے ملنے کو عنقریب وطن سے پھر آؤں گا۔ میرا ارادہ ہے کہ اگر نصف تنخواہ پر مہینے کی رخصت ملنے کی امید ہوئی تو میں اب دہلی میں پہنچتے ہی درخواست دے دوں گا۔ چھ مہینے تک ذرا دم لوں گا۔ اِدھر اُدھر پھروں گا۔ انشا اللہ تم سے پھر ملونگا۔ نانو خاں کا کارڈ کل میرے پاس پہنچا۔ میری طرف سے اس کو دعا کہنا اس کو چاہیے کہ پانی پت میں برابر خط بھیجتا رہے۔

الطاف حسین از لاہور

یکم جون ۱۸۸۷ء''(۲۷)

مولانا حالؔی لاہور سے دلی پہنچے تو سکون محسوس کرنے لگے۔ یہیں سے ہی ان کی یادگار ادبی و علمی زندگی کا آغاز ہوتا ہے جب انھوں نے شاعری کے پرانے اور فرسودہ مضامین کو ترک کرکے تعمیری ادب کی طرف توجہ کی۔ وہ قوم کی اصلاح شعر و ادب میں نئے رجحانات داخلے کرنے کی طرف مائل ہوئے۔ وہ عشقیہ مضامین کو ترک کر

کےقوم کے درد اور اس کی زبوں حالی کی طرف متوجہ ہوئے ۔اس دوران سرسید سے ملاقات ہوئی اور حالی نہ صرف سرسید کی ذات، ان کی سیرت سے متاثر ہوئے بلکہ ان کے سماجی، تعلیمی اور ادبی کاموں میں رفیق خاص بن گئے اور اپنی باقی زندگی اسی فلاحی اور عوامی مقصد کے لیے صرف کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ حالی نے علمی و ادبی میدان میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے وہ آگے چل کر قوم کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے ۔حالی نے علم و ادب کی ایک نئی دوکان کھولی اور نایاب مال اس میں رکھ کر بے خبر لوگوں کو پکارتے رہے:

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حآلی نے دوکان سب سے الگ (۴۸)

۱۸۸۸ء میں ان کی ملاقات علی گڑھ میں نواب سر آسمان جاہ بہادر مدار المہام سرکاری عالی نظام سے سرسید کی وساطت سے ہوئی ۔ حالی اس وقت اینگلو عربیک اسکول دہلی میں عربی کے مدرس تھے اور علی گڑھ آئے ہوئے تھے ۔نواب سر آسمان جاہ سے سرسید نے حالی کا تعارف کرایا۔نواب صاحب علم دوست اور اہل علم کے قدر دان تھے ۔حآلی سے مل کر خوش ہوئے اور ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر امداد مصنفین کے ضمن میں ۷۵ روپے ماہوار وظیفہ حالی کے لیے مقرر کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حالی سرسید کے زیادہ قریب تھے ۔

سرسید اور حالی کی محبت دونوں کے خطوط تصانیف اور اشعار سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔سرسید کے اس خط کا اقتباس ملاحظہ ہو جو انھوں نے شملہ سے مولانا حالی کو لکھا جس کے ایک ایک جملے سے محبت و عقیدت عیاں ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''جناب مولانا، مخدوم و مکرم من!

شملہ میں میرے لیے اس سے بڑھ کر کون سی نعمت ہو سکتی ہے کہ چند روز آپ کی صحبت رہے ۔میرا رمضان سچ مچ عید ہو جائے گا۔آپ بلا تامل تشریف لائیے ۔ مکان، دل آنکھیں سب حاضر ہیں ۔موسم یہاں کا اچھا ہے۔

خاکسار سید احمد

شملہ پارک ہوٹل

۱۶۔اگست ۱۸۷۹ء[۴۹]

چونکہ مولانا حالی ایک علمی و ادبی اور تحقیقی شخصیت تھے۔ملازمت ان کے مزاج سے مناسبت نہ رکھتی تھی لیکن انھوں نے خاندانی حالات اور گزر اوقات کے لیے ملازمت کی۔ چنانچہ نواب حیدر آباد کے وظیفے کو انھوں نے غنیمت سمجھا اور اینگلو عربیک اسکول دہلی کی ملازمت چھوڑ دی۔لیکن فی الحال قیام دلی میں ہی رہا۔اگر چہ وظیفہ کی رقم اتنی ہی تھی جتنی حالی کو اسکول سے تنخواہ ملتی تھی لیکن ان جیسے قناعت پسند شخص کے لیے یہ رقم بہت تھی۔

مولانا حالی اب دلی میں تنہائی محسوس کرنے لگے کیونکہ ان کے پرانے دوستوں میں اب دلی میں کوئی بھی رہا تھا اور نہ ہی وہ محفلیں تھی اور نہ ہی شعروسخن کے چرچے۔وہ گذشتہ محفلوں اور دوستوں کو یاد کر کے افسردہ ہو جایا کرتے تھے۔جس کا اظہار ان کے ان اشعار سے ہوتا ہے:

کوچ سب کر گئے دلی سے تیرے قدر شناس
قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز
تذکرہ دلّی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
ڈھونڈتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
غالبؔ و شیفتہؔ و نیرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ

اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

مومنؔ و علویؔ و صہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد

شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

داغؔ و مجروحؔ کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں

نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر

اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانہ ہرگز (۴۰)

مولانا حالی جلد ہی دلی کو الوداع کہہ کر اپنے آبائی وطن پانی پت چلے آئے اور مستقل سکونت اختیار کر لی لیکن اب وہ اپنے پرانے مکان محلہ انصار میں نہیں رہنا چاہتے تھے کیونکہ ایک تو یہ شہر کے درمیان تھا دوسرے یہاں مولانا کی بھابھی رہتی تھی اور اکثر اوقات ان کے بچے بھی وہاں آ کر رہا کرتے تھے۔ مولانا حالی نے اپنے بڑے بیٹے خواجہ سجاد حسین جو (محکمہ تعلیم پنجاب میں ملازم تھے) سے مشاورت کے بعد محلہ سادات جہاں مولانا کا سسرال رہتا تھا اور یہ محلہ ریلوے اسٹیشن کے پاس تھا وہاں ایک مکان بنوایا جس کے بالائی منزل پر مولانا حالی ان کے ملازم نانو خاں اور عطا اللہ رہتے تھے۔ جبکہ نیچے والے حصے میں ان کی بیوی، بیٹی اور چھوٹا نواسہ رہتے تھے۔ مولانا حالی صبح و شام کھانے کے وقت نیچے آتے تھے، یہ مکان ۱۸۹۶ء میں مکمل ہوا۔ حالی اب مکمل طور پر علمی و ادبی کاموں میں مصروف ہو چکے تھے۔ وہ علمی و ادبی محفلوں، کانفرنسوں اور تقریبات میں شرکت کرتے تھے۔ علی گڑھ دہلی وغیرہ کبھی کبھار جانا ہوتا تھا۔ ۱۸۹۲ء میں سرسید کی قیادت میں ایم اے او کالج علی گڑھ کا ایک وفد جس میں مولانا حالی بھی شامل تھے حیدر آباد گیا۔ اس دوران حالی کا وظیفہ ۷۵ سے بڑھا کر ۱۰۰ روپے کر دیا گیا وہ ترجمہ حالیؔ میں لکھتے ہیں:

"۱۳۰۹ھ میں جب کہ میں سرسید مرحوم کے ہمراہ بہ شمول دیگر ممبران ڈپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علی گڑھ حیدر آباد گیا تھا، اس وظیفے میں ۲۵ روپے ماہوار کا

اضافہ کر کے سو روپے سالانہ حال کا وظیفہ میرے لیے مقرر کر دیا جواب تک مجھ کو ماہ
بہ ماہ سرکار عالی سے ملتا ہے اور اسی وقت سے میں نے اینگلو عربک اسکول کا قطع
تعلق کر لیا ہے۔''(۳۱)

حالی کے بیان سے یہ بات واضع ہوتی ہے کہ ۱۳۰۸ھ بمطابق ۱۸۹۱ء کے بعد حالی نے ملازمت ترک کر دی تھی اور اس کے بعد کہیں دوبارہ ملازمت نہیں کی البتہ مختلف امور کے سلسلے میں ان کا علی گڑھ اور دہلی آنا جانا رہتا تھا۔

پانی پت میں جب حالی ''حیات جاوید'' لکھ رہے تھے تو ان کی اہلیہ اسلام النساء ہیضہ کے مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئیں۔ یہ ۱۹۰۰ء کا واقعہ ہے۔ اسلام السناء بڑی خدمت گار، ہمدرد اور فیاض خاتون تھیں۔ انھوں نے مولانا حالی کے گھر کو بڑے سلیقے اور قرینے سے سنبھالا ہوا تھا۔ وہ کبھی بھی مولانا حالی کے کاموں میں نہ تو مداخلت کرتی تھیں اور نہ ہی رکاوٹ ڈالتی تھیں۔ مولانا حالی بھی ان کی بہت قدر کرتے تھے اور اگر وہ کبھی غصہ میں آ جاتی تو حالی تحمل کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ حالی اپنے نجی خطوط میں ان کا جابجا ذکر کرتے تھے۔ ان کی وفات پر اپنے صاحب زادے خواجہ سجاد حسین کو جو خط انھوں نے لکھا اس کا اقتباس درج ذیل ہے:

''برخوردار سعادت آثار۔ طال عمرہ بعد دعا کے واضع ہو کہ یہاں پندرہ بیس روز
سے ہیضہ کی وبا پھیلی ہوئی ہے اور روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ پرسوں
تمہارا والدہ کو دس بجے رات کے اس کا اثر ہوا اور کل نو بجے رات کے انتقال ہو
گیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ اگر چہ اس حادثہ ناگہانی سے جو صدمہ سب عزیزوں
اور متعلقوں اور ہمسائیوں اور راہ چلتوں کو ہوا ہے اس کا بیان کرنا مشکل ہے اور
میں سمجھتا ہوں کہ ان کی اولاد کو سب سے زیادہ صدمہ ہوا ہے اور ہو گا۔ مگر میری
جان والدین کا اولاد کے سامنے گزر جانا والدین کی خوش نصیبی ہے اور اولاد کا قدیم
ورثہ ہے۔ خدا کا شکر ہے تمہاری والدہ کی جیسی زندگی اور عمدہ موت ہوئی ہے اس

کی ہر شخص کو تمنا ہونی چاہیے۔انھوں نے سعادت مند اولاد چھوڑی ہے اور ان کو بفضل تعالیٰ اچھی حالت میں چھوڑا ہے۔ایک زمانہ کو اپنا مداح وثنا خواں وشکر گذرا چھوڑا ہے۔وہ اپنی حقیقی اور اصلی نیکیوں کی تمام عشیرہ میں عمدہ مثال تھیں۔انھوں نے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی خدمت گزاری سے مخدومیت کا درجہ حاصل کیا تھا اور اخیر وقت میں جب تک ان کو ہوش رہا برابر خدا کی یاد ان کے ورد زبان رہی۔

جس شخص کی ایسی عمدہ زندگی اور ایسی عمدہ موت ہو اس سے زیادہ اور کون خوش نصیب ہو سکتا ہے اور اس کی اولاد کے لیے اس سے زیادہ کیا فخر کی بات ہو سکتی ہے۔یہیں ان تمام باتوں پر نظر کر کے امید ہے کہ تم صبر اختیار کرو گے۔اس حادثہ سے بھائی فیاض حسین کو تمہاری بہن کو خاص کر بہت رنج ہوا ہے۔ماموں صاحب کو فوراً تعزیت کا خط لکھو اور اس میں ایسی باتیں درج کرو جو ان کو صبر پر آمادہ کریں جن سے ان کو یقین ہو کہ ان کی بہن سے بھائی کے لیے ایک عمدہ اور قائم مقام چھوڑے ہیں اور ایک خط اپنی بہن اور بھتیجی اور بھانجی کی تشفی کے لیے بھی لکھو کہ یہ سب حد سے زیادہ بے قرار ہیں۔زیادہ سوائے دعا کے اور صبر وشکر کی تاکید کے اور کیا لکھوں۔

الطاف حسین عفی عنہ ۲۴۔اگست ۱۹۰۰ء (۳۲)

مولانا حالی کی علمی وادبی خدمات کی قدر و منزلت اور اہمیت کے عوض حکومت وقت نے ۱۹۰۴ء میں انھیں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا یہ اعزاز مولانا کو بغیر کسی تحریک یا کوشش کے دیا گیا۔ملک بھر سے سینکڑوں کی تعداد میں مولانا کو مبارک باد کے خطوط موصول ہوئے۔انجمن اسلامیہ پنجاب لاہور کی طرف سے جو مبارک باد کا خط مولانا حالی کو لکھا گیا وہ ملاحظہ ہو:

’’جناب حضرت شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی صاحب دادعنا تکم اسلام

مسنون وتمنائے ملاقات بہت آیات کے بعد ملتمس ہوں کہ انجمن اسلامیہ پنجاب کے ایک اہم جلسہ ۳ جولائی ۱۹۰۴ء کو منعقد ہوا اور اس جلسے میں اتفاق رائے یہ رزولیوشن پاس ہوا کہ جو خطاب ''شمس العلماء'' گورنمنٹ عالیہ کی طرف سے بتقریب حضور قیصرِ ہند عطا ہوا ہے میں اس کی مبارک باد جناب کی خدمت میں انجمن کی طرف سے عرض کروں۔ انجمن کو جناب کے اس اعزاز کے حاصل کرنے پر، جس کے آپ پورے طور پر مستحق ہیں، نہایت خوشی حاصل ہوئی ہے۔

یہ انجمن گورنمنٹ کی از حد مشکور (شکر گزار) ہے کہ اس نے جناب کو اس خطاب سے ممتاز فرمایا۔

یہ انجمن گورنمنٹ کی اس عنایت کا صدق دل سے شکر ادا کرتی ہے اور یہ تہنیت نامہ آپ کی خدمت سراپا برکت میں پیش کرتی ہے۔ دعا ہے کہ خدائے پاک ذات بابرکات آں حضرت کو تا دیر قوم کے سر پہ سایہ گستر رکھے۔

امیں! والسلام

خان بہادر محمد برکت علی خاں

آنریری جنرل سیکرٹری انجمن اسلامیہ پنجاب لاہور

۳۔ جولائی ۱۹۰۴ء (۴۳)

مولانا شبلی نعمانی نے جو مبارک باد کا خط لکھا اگر چہ وہ نہایت مختصر ہے لیکن اس سے بہتر انداز میں محبت و عقیدت کا اظہار ممکن نہیں۔ لکھتے ہیں:

''مولانا آپ کو تو نہیں لیکن خطاب شمس العلماء کو مبارک باد دیتا ہوں اب جا کر اس خطاب کو عزت حاصل ہوئی۔'' (۴۴)

مولانا حالؔی کی خاکساری اور منکسر المزاجی کا یہ عالم تھا کہ وہ اس اعزاز پر خوشی محسوس کرنے کے بجائے

اس کومصیبت خیال کرتے تھے جس کا اظہار ان کے اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین کو لکھا اور جو مکتوبات حالی حصہ دوم صفحہ ۶۰ ۔ ۳۶۱ میں موجود ہے ۔ لکھتے ہیں:

''اگر چہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایسا اعزاز ہے کہ جس کی ہمارے ہم چشم آرزو کرتے ہیں مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے تم جانتے ہو کہ میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہ ملتا اور ایسے موقع سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتا تھا۔ مگر اب جب کوئی حاکم پانی پت آوے گا یا جب کوئی نیا ڈپٹی کمشنر کرنال میں بدل کر آوے گا لامحالہ وہاں جانا پڑے گا۔ (۴۵)

بھلا میں کہاں اور یہ درد سر کہاں''

درج بالا خط سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ مولانا حالی خوشامد کو ہرگز پسند نہ کرتے تھے اور وہ انسان کو بحیثیت انسان دیکھتے تھے انھوں نے اپنی تصنیفات میں اس چیز کو پیش کیا ہے وہ نہ تو متعصب تھے اور نہ ہی متعصّبانہ سوچ رکھتے تھے۔

۱۹۰۵ء میں حالی میر محبوب علی خاں نظام دکن کی دعوت پر حیدر آباد گئے اور جشن چہل سالہ تقریب کی روداد مرتب کی وہ حیدر آباد میں دسمبر ۱۹۰۵ء تا جون ۱۹۰۶ء تک مقیم رہے۔ دکن میں ہر سال سرسید کی برسی بھی منائی جاتی تھی۔ جس میں لوگ شامل ہو کر سرسید کی زندگی اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالتے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا۔ حالی چونکہ ان دنوں حیدر آباد دکن میں سرکاری طور پر مقیم تھے لہٰذا انھوں نے وہاں سرسید کی برسی کی تقریب میں بھی شرکت کی اور حاضرین کی خواہش پر سرسید کے حوالے سے ایک تقریر بھی کی جو منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر ''زمانہ'' کانپور کی درخواست پر اپریل ۱۹۰۶ء کو شائع ہوئی اس وقت سرسید کو دنیا سے رخصت ہوئے آٹھ سال گزر چکے تھے۔ حالی نے کہا!

''کیا خدا کی قدرت ہے جس شخص کو چند روز پہلے کافر ملحد کہا جاتا تھا اب ملک کے اطراف و جوانب میں ہر سال اس کی برسی کی جاتی ہے اور اس کے احسانات جو

> اس نے قوم پر کیے یاد کیے جاتے ہیں اور امید ہے جس قدر زمانہ گزرتا جائے گا
> اس کی قدر روز بروز زیادہ ہوتی جائے گی۔‘‘(۳۶)

قیام حیدر آباد دکن کے زمانے میں مولانا حالی نے صغرا ہمایوں مرزا جو مولانا کے پاس نظام کلب میں ملاقات کے لیے حاضر ہوئیں اور اپنے ناول ’مشیرِ نسواں‘‘ کا مسودہ اظہار رائے کے لیے مولانا کی خدمت میں پیش کیا جس پر حالی نے اظہار یہ لکھا۔صغرا بیگم دکن میں ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئیں ان کے والد کا نام ڈاکٹر صفدر علی مرزا تھا جو اپنے زمانے میں دکن کے مشہور آدمی تھے۔صغرا بیگم کی شادی بیرسٹر سید ہمایوں مرزا کے ساتھ ہوئی جو پٹنہ کے رہنے والے تھے۔شادی کے بعد انھوں نے اپنا نام صغرا ہمایوں مرزا رکھ لیا تھا۔انھیں شاعری کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا۔شاعری میں حیاؔ تخلص کرتی تھیں اور جلیل کی شاگرد تھیں۔انھوں نے لاہور سے ’’زیب النساء‘‘ اور حیدر آباد دکن سے النساء کے نام سے رسائل جاری کیے۔علاوہ ازیں عورتوں کی تعلیم کے لیے مدرسہ صفدریہ قائم کیا جس کے لیے انھوں نے اپنی جائیداد کا ایک حصہ وقف کیا تھا۔۱۹۵۹ء میں فوت ہوئیں۔شیخ محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں:

> ’’جب بعد میں صغرا ہمایوں مرزا نے اسے شائع کیا تو اس کے ساتھ ہی مولانا کی
> رائے کو کتاب کے صفحہ ۲۰۰ اور ۲۰۱ میں نقل کیا۔‘‘(۳۷)

صغرا ہمایوں مرزا تقریباً ۱۵ کتابوں کی مصنفہ تھیں وہ حیدر آباد کی پہلی خاتون تھی جنھوں نے عورتوں کے مسائل اور ان کی ترقی کے لیے کوششیں کی۔

اس کے علاوہ مولانا حالی نے قیام دکن کے دوران ’’سیاق دکن‘‘،نواب عزیز جنگ کی کتاب ’’فلسفۂ تعلیم‘‘ ترجمہ مولوی خواجہ عبدالحسنین پر بھی اظہار خیال لکھا۔

جون ۱۹۰۶ء میں مولانا دکن سے پانی پت آ گئے اور پھر یہیں مقیم رہے۔البتہ اس دوران ۱۹۰۷ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ کراچی میں شرکت کے لیے کراچی گئے۔اس سفر میں ان کے ساتھ خواجہ غلام الثقلین،نواب وقار الملک،میجر سید حسن،خواجہ غلام السطین سمیت ۱۷ آدمی تھے۔مولانا حالی کی عمر اس وقت

۱۷ سال تھی۔وہاں کانفرنس میں مولانا حالی کو صدر منتخب کرلیا گیا۔اس کانفرنس میں مولانا نے جو خطبہ پڑھا وہ بڑا اثر آفرین اور معنی خیز تھا۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''مسلمانوں کی ترقی کے لیے محض یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ تعلیم کے ہر شعبے میں دستگاہ حاصل کریں۔''(۳۸)

مولانا حالی کی کسی بڑی تقریب یا کانفرنس میں شاید یہ آخری شرکت تھی مولانا کی صحت بتدریج گرتی گئی اور زندگی کے آخری چند سال انھوں نے مختلف قسم کی تکالیف میں گزارے جس کا ذکر انھوں نے اپنے بعض خطوط میں کیا ہے جو گاہ بگاہ وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو لکھتے رہے۔

۲۔فروری ۱۹۱۱ء کو نواب وقار الملک کو لکھتے ہیں:

''والا جناب! تسلیم اگرچہ قویٰ نے بالکل جواب دے دیا ہے اور طرح طرح کے عوارض لاحق ہو رہے ہیں مگر دلی تمنا ہے کہ اس مبارک تجویز میں جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے ہو رہی ہے میں اس اخیر زمانہ میں شرکت کی عزت حاصل کروں۔''(۳۹)

مولانا حالی ۱۹۱۳ء میں مسلسل بیمار رہنے کی وجہ سے لاغر ہو چکے تھے۔ان کی صحت دن بدن خراب ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ بعض دوستوں کے خطوں کا جواب دینے سے بھی قاصر ہو گئے اور دوسروں سے خط لکھواتے تھے۔ان کے اعصاب کمزور ہو چکے تھے اور متعدد امراض لاحق ہو چکے تھے۔ان کی دماغی صلاحیتیں بھی کم ہوتی جا رہی تھیں۔

۱۵۔فروری ۱۹۱۳ء کو مولوی عبدالرزاق کانپوری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''قطع نظر اس کے کہ قوائے جسمانی روز بروز مضمحل ہوتے چلے جاتے ہیں دماغ بھی معطل بلکہ مختل ہو گیا ہے۔خطوں کا جواب مستثنیٰ حالتوں کے سوا ہمیشہ دوسروں سے لکھواتا ہوں جو کچھ لکھا پڑھا تھا سب فراموش ہو گیا۔میری موجودہ حالت پر

مرزا غالب مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے ۔

دیگراز خویشم خبر نبود تکلف بر طرف
ایں قدر رانم کہ غالب نام یارے داشتم

بجائے غالب کے حالی پڑھنا چاہیے۔"(۴۰)

البتہ آخری ایامِ زندگی میں بھی وہ قوم کی تڑپ دل میں لیے ہوئے تھے جس کا ذکر خواجہ عبدالولی کے نام ایک خط میں کیا ہے۔

"ٹرکی کی خبریں جو آج کل آ رہی ہیں انھوں نے بالکل کمر توڑ دی ہے ایران اور مراکو کی تو فاتح خیر پڑھ چکے اب ٹرکی کی بھی بظاہر خیر معلوم نہیں ہوتی ۔"(۴۱)

۱۹۱۴ء کے آخر میں ان پر فالج کا حملہ ہوا جس سے ان کی قوت گویائی ختم ہوگئی۔ ۲۸ دسمبر سے وہ صاحب فراش ہو گئے تھے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو رات دو بجے رحلت کی اور دوسرے دن غوث علی شاہ قلندر کے صحن کے حوض کے کنارے دفن ہوئے ۔

بقول لدمیلا واسیلیوا:

"حالی کی معمولی طول و عرض کی پتھر کی بنی ہوئی تربت اسلام سے نسبت رکھنے والے ہرے رنگ کی مخملی چادر سے جس پر آیاتِ قرآنی کڑھی ہوئی ڈھکی رہتی ہے روزانہ غروب آفتاب سے لے کر صبح سویرے تک اور بھیگے موسم میں بھی چوک سے چند ہی قدم کے فاصلے پر واقع مسجد کے کارکن چادر کو ٹھیک ٹھاک کرتے ہیں (علاقے کے تمام مقدس مقامات کی نگرانی ان کے فرائضِ منصبی میں شامل ہے) سائبان نما ذیلی عمارت کے عرض میں واقع شہتیر پر ایک تختی جڑی ہوئی ہے جس کے بالائی حصے پر حالی کی مشہور مسدس "مدو جزر اسلام" کا ایک شعر خوش خط درج ہے:

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انسان کے انسان

اس کے نیچے ۷۸۶ (یعنی فقرے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے اظہار) کے بعد یہ عبارت خوش نما حروف میں درج ہے:

''یہاں شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی آسودۂ خاک ہیں''(۴۲)

ملک بھر کے تمام اہم اخبارات و رسائل نے مولانا کی شخصیت پر مضامین شائع کیے۔ شعراء نے قطعات تاریخ لکھے۔ سن عیسوی کے مطابق مولانا کی عمر ۷۷ برس تھی۔

محمد ہادی عزیز کا قطعہ تاریخ یہ تھا:

شبلی و حالی آن سپہر علوم
آہ رفتند و شد جہاں خالی
سالِ ایں واقعات گفت عزیز
غم شبلی بماتم حالؔی (۴۳)

حفیظ جالندھری نے اس انداز سے خراج عقیدت پیش کیا:

جگا کر خاکیوں کو گنبدِ افلاک کے نیچے
وہ حالؔی سو گیا اپنی وطن کی خاک کے نیچے (۴۴)

علامہ اقبال نے ان کی وفات پر اس طرح اظہار خیال کیا:

خاموش ہو گئے ہیں چمنستاں کے رازدار
سرمایۂ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہل گلستان
حالی بھی ہو گیا سوئے فردوسِ رہ نورد (۴۵)

۱۸۶۷ء کے لگ بھگ حالیؔ تصنیف و تالیف کے میدان میں داخل ہوئے۔مولانا حالیؔ نے ''تریاق مسموم'' کے نام سے اردو نثر میں پہلی کتاب لکھی۔یہ کتاب پادری عمادالدین کے اسلام دشمن نظریات کے رد میں لکھی گئی۔پادری عمادالدین مولانا حالی کے وطن کا رہنے والا تھا اور اس نے جو''تحقیق الایمان'' نامی کتاب لکھی اس کے جواب میں مولانا نے ''تریاق مسموم'' تصنیف کی۔اس کتاب کا انداز بیان اور حالی کا لہجہ تند اور تیز ہے اس سلسلے میں پروفیسر حمید احمد خان ''ارمغانِ حالیؔ'' میں لکھتے ہیں:

''اس باطنی کیفیت کا پہلا نشان دنیا کو اس وقت ملا جب ۱۸۶۷ء کے قریب حالی باوصف اپنے حلم و انکسار کے ایک جنگجویانہ ادا کے ساتھ میدان تصنیف میں داخل ہوئے۔''تریاق مسموم'' جو نثر میں حالی کی پہلی قابلِ ذکر تصنیف ہے پادری عماد الدین کے اسلام دشمن ہفوات کے رد میں لکھی گئی۔''(۴۶)

جبکہ خلیل الرحمٰن داؤدی نے تصانیف حالی کے ضمن میں لکھا ہے مولانا کی اولین تصنیف تو وہی رسالہ کہا جائے گا جو انھوں نے اپنے دہلی کے قیام ۵۵۔۱۸۵۴ء میں بزبانِ عربی لکھا تھا۔اس سلسلے میں ایک منطقی مسئلہ نواب سید محمد صدیق خاں بہادر کی تائید میں موضوع بحث تھا۔مولانا حالی کی عمر اس وقت ۱۸ سال کے قریب تھی اور وہ مدرسہ حسین بخش میں زیر تعلیم تھے۔اس رسالہ کو پڑھ کر ان کے استاد کو رنج ہوا کیونکہ وہ کٹر حنفی بزرگ تھے اور رسالہ ایک وہابی شخص کی تائید میں لکھا گیا تھا۔بہر حال اسے چاک کر دیا گیا اور آج اس کا کہیں پتہ نہیں۔''(۴۷)

مولانا حالی کی لکھی ہوئی کتابیں اردو ادب کا لازوال سرمایہ ہیں۔مولانا نے بچپن سے ہی تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا تھا اور زندگی کے آخری ایام تک وہ علمی و ادبی خدمات سرانجام دیتے رہے۔انھوں نے مختلف موضوعات پر کئی کتب لکھیں۔جن میں مذہب، تاریخ، تنقید، سوانح، مکتوبات، علم الارض کے موضوعات شامل ہیں۔جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

مولودشریف

۹۸ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ مولانا حالی نے ۱۸۶۴ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیاں لکھا اور ۱۹۳۲ء میں حالی پریس پانی پت سے شائع ہوا۔مولانا کے لکھے ہوئے ایک ایک لفظ اور جملے سے حضور نبی اکرمؐ سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔آغاز حمد سے ہوتا ہے۔حمد کے بعد حضور اکرمؐ کا ذکر کرتے ہیں بعد میں امت مسلمان کا ذکر ملتا ہے۔اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر جب وہ دیدار کے طالب تھے۔معجزات، والدہ ماجدہ اور حمل کے دوران روشنی کا ذکر، ولادت کا ذکر، قیصر وکسریٰ کا ذکر، رحمتوں کا نزول وغیرہ شامل ہیں۔آخر میں اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

اگر نصیب ہو یثرب میں جا کے شربتِ مرگ
پیوں نہ آب بقا عمر جاوداں کے لیے

زمین پہ ٹھہرا ہے ماوائے شاہ عرش نشین
رہی نہ اب کوئی فوقیت آسمان کے لیے

نبیؐ کا نام ہو وردِ زباں رہے جب تک
سخن زباں کے لیے اور زبان دہاں کے لیے

حریف نعت پیغمبر نہیں سخن حالیؔ
کہاں سے لائیے اعجاز اس بیان کے لیے (۴۸)

تریاق مسموم

بقول ڈاکٹر عبدالقیوم:

''دوسری تصنیف ''تریاق مسموم'' ہے جو پادری (مرتد) عماد الدین کی کتاب ''تحقیق الایمان'' کے جواب میں ۱۸۶۷ء میں لکھی گئی۔''(۴۹)

کتاب کے پہلے باب میں آنحضرت کی نبوت کا ذکر ہے جبکہ دوسرے باب میں عیسائیوں کے بعض اعتراضات اور دعوؤں کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ کتاب دہلی سے شائع ہونے والے رسالہ خیر المواعظ میں قسط وار شائع ہوئی۔

مبادی علم جیولوجی (جس میں طبقات ارضی کی ساخت کا بیان ہے)

یہ ۱۳۸ صفحات پر مشتمل کتاب ہے۔ یہ فرانسیسی زبان میں لکھی گئی کتاب کے عربی ترجمے سے اردو میں منتقل کی گئی۔ جو پنجاب یونیورسٹی میں ۱۸۶۸ء میں پہلی مرتبہ چھپی اس کے بعد دوسری مرتبہ رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی کی اجازت سے انجمن پنجاب لاہور سے نظام الدین پرنٹرز کے اہتمام سے چھپی۔ ۱۸۸۳ء میں چھپی۔ ٹائٹل پر درج ذیل ہے۔

مبادی علم جیولوجی (جس میں طبقات ارضی کی ساخت کا بیان ہے) جس کو مولوی الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی مدرس اول زبانہائے مشرقیہ اینگلو عربک سکول دہلی نے ایک رسالہ عربی سے فرانسیسی ترجمہ کیا گیا تھا۔ اردو میں ترجمہ کیا۔

۱۸۸۳ء منظوری جناب صاحب رجسٹرار یونیورسٹی مطبع انجمن پنجاب میں نظام الدین پرنٹر کی اہتمام میں چھپی۔

خلیل الرحمٰن داؤدی کے مطابق ۱۸۶۸ء میں لکھی گئی پادری عماد الدین کی ''تاریخ محمدی'' پر منصفانہ رائے ۱۸۷۲ء۔

ڈاکٹر عبدالقیوم کے بقول:

''۱۸٦۸ء میں ''تریاق مسموم'' پادری عمادالدین کی کتاب ''تحقیق الایمان'' کے جواب میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۸۷۰ء میں پھر اس پادری نے آنحضرت کی لائف کے متعلق ''تاریخ محمدی'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس کے جواب میں مولانا نے رائے لکھی۔''(۵۰)

۲۵۹ قلمی صفحات پر مشتمل ہے۔ غیر مطبوعہ ہے اس کے کچھ حصے ۱۹۵۳ء کے نقوش میں چھپے۔ (۵۱)

ڈاکٹر عبدالقیوم کے مطابق یہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔

مجالس النساء

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ مولانا نے قیام لاہور کے دوران لکھی اس کی تالیف کا زمانہ ۱۸۷۴ء ہے یہ لاہور سے طبع ہوئی۔ یہ ایک اصلاحی کتاب ہے جو زنانہ مدارس میں مڈل کی سطح تک پڑھائی جاتی تھی اس کی طباعت پر کرنل ہالرائیڈ ڈائریکٹر تعلیمات پنجاب نے حالی کے لیے انعام کی سفارش کی تھی۔ جس پر لارڈ نارتھ بروک نے ایجوکیشنل دربار دہلی میں مولانا کو چار سو روپے انعام دیا۔ اس کتاب کا انداز بیان سادہ ہے اور یہ مدارس کے نصاب میں بھی شامل رہی ہے۔

مجالس النساء کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں:

''لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصے کے پیرائے میں موسوم بہ مجالس النساء لکھی تھی جس پر کرنل ہالرائیڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپے کا انعام دلوایا تھا۔ اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔''(۵۲)

ڈاکٹر عبدالقیوم کے مطابق ''مجالس النساء'' کا پہلا حصہ ۱۸۷۴ء میں مطبع محمدی لاہور سے چھپا لیکن اب یہ نسخہ نایاب ہے جبکہ حالی پریس پانی پت سے چھپے نسخے مل جاتے ہیں۔

مجالس النساء کا دوسرا حصہ حالی پریس پانی پت سے چھپا۔

شواہد الالہام

یہ رسالہ ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ الہام اور وحی کی ضرورت پر مولانا حالی نے عقلی دلائل پیش کیے ہیں۔ یہ بڑے مدلل انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس کا زمانہ تصنیف ۱۸۸۵ء ہے یہ خالص مذہبی رنگ میں لکھا گا رسالہ ہے اس میں ادبیت برائے نام ہے۔ یہ غیر مطبوعہ ہے۔

سوانح حکیم ناصر خسرو

یہ فارسی زبان میں لکھی گئی سوانح عمری ہے جس میں حکیم ناصر خسرو کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ اس پر ۳۲ صفحات کا ایک مقدمہ بھی لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۲ء میں مطبع خیر خواہ ہند دہلی سے شائع ہوئی۔

حیاتِ سعدی

مولانا حالی کی نہایت اہم تصنیف ہے اس میں شیخ سعدی کی زندگی اور ان کے کاموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا حالی نے کتاب میں نظم ونثر پر تنقیدی حوالے سے بھی لکھا ہے یہ تحقیقی نوعیت کی کتاب ہے۔ جسے لکھنے میں مولانا حالی کو بہت محنت کرنا پڑی۔ مالک رام اپنی کتاب "Hali" میں لکھتے ہیں:

> "In 1888, Hali Published the first of his biographical trio, Hayat-i-Sadi, a crital biography of well known Poet Philosopher Muslih-ud-Din of Shiraz."(۵۳)

اب تک اس اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں بقول خلیل الرحمٰن داؤدی: ''زمانہ تالیف ۱۸۸۴ء بمطابق ۱۳۰۱ء ہے لیکن اس کی اشاعت اول ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔''(۵۴)

حیات سعدی کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۷ء کا پنجاب یونیورسٹی میں ہے جبکہ مجتبائی پریس لاہور سے ۱۸۸۸ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا اس کے بعد اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

تذکرۂ رحمانیہ

یہ سوانح مولانا عبدالرحمٰن پانی پتی ہے جو مولانا حالی کے استاد تھے۔ مولانا حآلی کو اپنے استاد سے جو محبت وعقیدت تھی اس کا ذکر بھی اس کتاب میں ملتا ہے۔ یہ تذکرہ ۱۸۹۶ء میں ان کی وفات کے بعد راولپنڈی سے چھپا۔ علاوہ ازیں نقوش ۱۹۵۳ء میں بھی شائع ہوئی۔

مقدمہ دیوان حالی

یہ کتاب مولانا حالی کے اصل دیوان جو سب سے پہلے مطبع انصاری دہلی سے چھپا کے ساتھ لکھا ہوا مقدمہ ہے۔ دیوان حالی ۱۸۹۳ء میں مطبع انصاری دہلی سے چھپا۔ اس مقدمہ کی اہمیت کے پیش نظر کتابی صورت میں بھی بعد میں شائع ہوا۔ علاوہ ازیں ۱۸۹۳ء میں نامی پریس کانپور سے بھی چھپا۔

یادگارِ غالب

مولانا حالی نے اپنے استاد اور مشہور شاعر اور مکتوب نگار کی زندگی اور ان کے کارناموں پر مشتمل ان کی سوانح عمری لکھی حآلی نے مرزا کے فارسی کلام پر تبصرہ بھی لکھا اور نظم و نثر دونوں پر اظہار خیال اور ریویو بھی لکھا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار نامی پریس کانپور سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔

یادگار غالب مرزا غالب کی زندگی پر لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ: ''کہا جا سکتا ہے کہ سوانح عمری کے لحاظ سے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔''(۵۵)

یادگار غالب کے اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

حیات جاوید

سرسید احمد خان کی سوانح عمری ہے جس میں حالی نے سرسید احمد خاں کی زندگی ان کے حالات اور کاموں کی تفصیل دی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی اور اس کے بھی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں سرسید کے افکار ان کے خیالات ان کی مشکلات اور کشمکش کے اذکار ہیں۔ اس کے علاوہ سرسید کی قومی ہمدردی اور تعلیمی سرگرمیوں کے احوال بھی درج ہیں۔ یہ پہلی مرتبہ نامی پریس کانپور سے ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔

مضامین حالی

مولانا حالی کے مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۸۷۵ء سے ۱۹۰۱ء تک مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ان میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جو مولانا نے ''معارف'' علی گڑھ تہذیب و لاخلاق علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ وغیرہ میں لکھے۔ یہ کتاب پنجاب نیشنل ایجنسی پانی پت میں ۱۹۰۲ء میں چھپی اور اس کے مرتب مولانا وحید الدین سلیم تھے۔ ان مضامین میں اعلی درجے کی نثر لکھی گئی ہے۔ مولانا کے لکھے ہوئے مضمون ''زبان گویا'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اے زبان تو دیکھنے میں ایک پارہ گوشت کے کے سوا کچھ نہیں مگر تیری طاقت نمونۂ قدرت الٰہی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو رائیگاں نہ کر اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ تو اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امیں ہے اور روح کی ایلچی، دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔''(۵۶)

مکتوبات حالی

مولانا حالی کے فرزند خواجہ سجاد حسین نے حالی کے مکتوبات کو جمع کر کے دو جلدوں میں حالی پریس پانی پت سے ۱۹۲۵ء میں شائع کیا۔ جلد اول میں زیادہ تر وہ خطوط ہیں جو انھوں نے اپنے ہم عصر شعراء و ادباء کو لکھے

جبکہ جلد دوم میں نجی خطوط ہیں جو مولانا نے اپنے صاحب زادوں خواجہ سجاد حسین اور خواجہ اخلاق حسین کو لکھے۔

مقالات حالی

یہ مولانا کے مقالات کا مجموعہ ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع ہوئے۔

مکاتیب حالؔی

مولانا حالی کا نہایت اہم مجموعہ مکاتیب ہے جس میں اردو کے ساتھ فارسی و عربی مکاتیب بھی شامل ہیں۔ ان مکاتیب کو شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے مرتب کیا ہے اور یہ ۱۹۵۰ء میں اردو مرکز گنپت روڈ لاہور اور اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے شائع ہوئے۔

کلیاتِ نثر حالی (جلد اول و دوم)

کلیات نثر حالی جلد اول و دوم شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے مرتب کیے اور مجلس ترقی ادب لاہور سے نومبر ۱۹۶۸ء میں طبع ہوئے۔

کلیاتِ نظمِ حالی (جلد اول و دوم)

کلیات نظم حالی جلد اول و دوم کو ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے جولائی ۱۹۶۸ء میں مرتب کر کے مجلس ترقی ادب سے شائع کیا ہے۔

دیوانِ حالی

مولانا حالی کے شعر تخلیقات کا مجموعہ ہے جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ایک ایڈیشن عشرت پبلشنگ ہاؤس ہسپتال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

شجرۂ نسب مولانا الطاف حسین حالی

والد = خواجہ ایزد بخش — والدہ = سیدہ امتہ الرسول

خواجہ الطاف حسین حالی (۲ بیٹے)

خواجہ اخلاق حسین (۲ بیٹے + دو بیٹیاں)

(۱) خواجہ اخلاق حسین — (۲) خواجہ اکرام حسین — (۳) مسماۃ مشتاق فاطمہ — (۴) مسماۃ صدیقہ

خواجہ سجاد حسین (۲ بیٹیاں)

مسماۃ منظورا — مسماۃ مسرورا

(۱) خواجہ اخلاق حسین (۲ بیٹے + ۵ بیٹیاں)

خواجہ ظہیر حسین (ساہیوال فوت شد) — خواجہ مظاہر حسین (ساہیوال فوت شد)

مسماۃ ذکیہ خاتون (انڈیا: فوت شد) — مسماۃ جمیلہ خاتون (لاہور: ایضاً) — مسماۃ سمیعہ خاتون (لاہور: لاولد) — مسماۃ صغریٰ خاتون (اسلام آباد: ۴ بیٹے) — مسماۃ عطیہ خاتون (لاہور: لاولد)

خواجہ ظہیر حسین (۳ بیٹے + ۴ بیٹیاں)

خواجہ سجاد حسین (انجینئر کراچی) — خواجہ الطاف حسین (زیر تعلیم ساہیوال) — خواجہ انعام حسین (زیر تعلیم ساہیوال)

مسماۃ آسیہ خاتون (سرگودھا) — مسماۃ ذکیہ خاتون (کینیڈا) — مسماۃ ناجیہ خاتون (اسلام آباد) — مسماۃ سعدیہ خاتون (اسلام آباد) — مسماۃ عاتقہ خاتون (راولپنڈی)

خواجہ مظاہر حسین (۲ بیٹے + ۱ بچی)

خواجہ اکرام حسین (کراچی: NIFT) — خواجہ احترام حسین (زیر تعلیم ساہیوال) — مسماۃ حنا خواجہ (ساہیوال)

(۲) خواجہ اکرام حسین (۲ بیٹے)

خواجہ انعام حسین (لاہور: فوت شد)(۱ بچی)

مسماۃ فاطمہ قدسیہ (امریکہ: ڈاکٹر)

خواجہ افضال حسین (سرگودھا: فوت شد)(۲ بیٹے + ۴ بیٹیاں)

خواجہ مجاہد حسین (وکیل: سرگودھا)(۲ بیٹیاں) — خواجہ شاہد حسین (وکیل: سرگودھا)

(مسماۃ آئمہ مجاہد + مسماۃ نجیبہ مجاہد ۔ دونوں زیر تعلیم)

مسماۃ زہرا افضال — مسماۃ عذرا افضال — مسماۃ فاطمہ بشریٰ — مسماۃ فاطمہ مبین

(۳) مسماۃ مشتاق فاطمہ (۲ بیٹے+۲ بیٹیاں)

خواجہ غلام السیدین ۔ اظہر عباس ۔ مسماۃ مختار فاطمہ ۔ مسماۃ صالحہ بیگم

خواجہ غلام السدین (۴ بیٹیاں)

مسماۃ زہرا بیگم (انڈیا) ۔ مسماۃ بلقیس بیگم (انڈیا) ۔ مسماۃ ذکیہ بیگم (انڈیا) ۔ مسماۃ سیدہ بیگم (انڈیا)

اظہر عباس (۱ بیٹا+۲ بیٹیاں)

انور عباس (پروفیسر: کراچی) ۔ مسماۃ نرجس (انڈیا: فوت شد) ۔ مسماۃ امینہ (کراچی)

مسماۃ مختار فاطمہ (۴ بیٹیاں)

مسماۃ سائرہ ۔ مسماۃ ساجدہ ۔ مسماۃ زاہدہ ۔ مسماۃ بجیا

مسماۃ صالحہ بیگم (لاولد)

(۴) مسماۃ صدیقہ (۳ بیٹیاں)

مسماۃ عباس فاطمہ (کراچی) ۔ مسماۃ مجتبائی بیگم (انڈیا: فوت شد) ۔ مسماۃ ارشاد فاطمہ (انڈیا: فوت شد)

نوٹ:

یہ شجرۂ نسب حالی کی اولادسے جناب خواجہ شاہ حسین ایڈوکیٹ ساکن سرگودھا نے مرتب کر کے ارسال فرمایا۔اس کے متن کی تصدیق حالی کے خاندان سے ان کی پڑپوتی محترمہ صغریٰ خاتون (مقیم اسلام آباد) سے کی

گئی ہے، جن کا نام شجرہ میں موجود ہے۔ میں اس عنایت کے لیے جناب خواجہ شاہد حسین اور محترمہ صغریٰ خاتون کا خاص طور پر شکرگزار ہوں۔ حالی کا اتنا مفصل شجرۂ نسب پہلے موجود نہیں۔ اس شجرہ کے علاوہ پروفیسر حمید احمد خان نے خاندانِ حالی کے ایک رکن خواجہ حبیب علی کی مدد سے مرتب کر کے ارمغانِ حالی میں درج کیا تھا۔ لیکن موجودہ شجرہ نسب کی حیثیت نئی تحقیق سامنے آنے تک حتمی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد میاں، سید، مولانا، پانی پت اور بزرگان پانی پت، جمعیت پبلشرز وحدت روڈ لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۹

۲۔ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر، افکارِ حالی، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۲۹، ۲۸

۳۔ مالک رام دہلوی، تلامذہ غالب، گلوب پبلشرز اردو بازار لاہور، س ن، ص ۸۳

۴۔ محمد اسماعیل پانی پتی، شیخ (مرتب)، (بیان حالی) کلیاتِ نثر حالی جلد اول، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۳۳۰

۵۔ محمد اسماعیل پانی پتی، شیخ (مرتب)، کلیاتِ نثر حالی جلد اول، ص ۳۳۱، ۳۳۰

۶۔ خلیق انجم، ڈاکٹر، حالی کے سوانح مشمولہ الطاف حسین حالی (تحقیقی وتنقیدی جائزے)، مرتبہ پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۵۳

۷۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، تذکرہ حالی، حالی پریس پانی پت، ۱۹۳۵ء، ص ۳۳۔۳۴

۸۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر (مرتب)، (بیانِ حالی) مشمولہ کلیات نظم حالی، حصہ اول، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۴۔۳

۹۔ مرتضیٰ حسین فاضل، مقدمہ مثنویاتِ حالؔی، شیخ مبارک علی لوہاری دروازہ لاہور، ص ۱۲، نیز نقوش شخصیات نمبر ص ۳۵

۱۰۔ محمد اسماعیل پانی پتی، شیخ، تذکرہ حالی، ص ۳۲۔۳۳

۱۱۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر (مرتب)، (بیانِ حالؔی) مشمولہ کلیات نظم حالی، حصہ اول، ص ۵

۱۲۔ محمد عبدالرزاق کانپوری، یادِ ایام، عبدالحق اکیڈمی، اشاعت منزل کوچہ عبدالحق، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۶ء، ص ۳۰۷، ۳۰۶

۱۳۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، مقدمہ کلیات نظم حالی، ص ۵۔۶۔۷

۱۴۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، مقدمہ کلیات نظم حالی، جلد اول، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۷

۱۵۔ خلیل احمد داؤدی، مقدمہ یادگار غالب، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۱۲

۱۶۔ حالی الطاف حسین، بیان حالی، مشمولہ کلیاتِ نثر حالی، جلد اول، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۳۳۷

۱۷۔ عبدالحق مولوی، مشمولہ مسدس حالی، صدی ایڈیشن، مرتب ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، بزم اقبال لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۴

۱۸۔ مالک رام دہلوی، تلامذہ غالب، گلوب پبلشرز اردو بازار لاہور، س ن، ص ۸۴۔۸۵

۱۹۔ حالی الطاف حسین، بیان حالی، مشمولہ کلیاتِ نثر حالی، جلد اول، ص ۳۳۸

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۴۰

۲۱۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، حواشی مقدمہ شعر و شاعری، مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۵۳ء، ص ۴۴

۲۲۔ حالی الطاف حسین، دیوان حالی، عشرت پبلشنگ ہاؤس، ہسپتال روڈ لاہور، س ن، ص ۱۰۲

۲۳۔ حالی الطاف حسین، مکتوبات حالی حصہ دوم، مرتب خواجہ سجاد حسین، حالی پریس پانی پت، ۱۹۲۵ء، ص ۹۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۹۹۔۹۵

۲۵۔ ایضاً، ص ۹۹

۲۶۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، حواشی مقدمہ شعر و شاعری، ص ۴۴

۲۷۔ حالی الطاف حسین، مکتوبات حالی حصہ دوم، مرتب خواجہ سجاد حسین، ص ۱۰۱

۲۸۔ حالی الطاف حسین، دیوان حالی، ص ۱۰۳

۲۹۔ سر سید احمد خان، مکتوبات سر سید، جلد اول، مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۵۰

۳۰۔ حالی الطاف حسین، دیوان حالی، ص ۹۱، ۹۲

۳۱۔ حالی الطاف حسین، ترجمہ حالی، مشمولہ کلیات نظم حالی، جلد اول، مرتب ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۶۱

۳۲۔ حالی الطاف حسین، مکتوبات حالی حصہ دوم، مرتب خواجہ سجاد حسین، ص ۲۹۵، ۲۹۶

۳۳۔ صحیفہ، حالی نمبر، پچاسواں شمارہ، مجلس ترقی ادب لاہور، جنوری ۱۹۷۰ء، ص ۶۶

۳۴۔ شبلی، مکاتیب شبلی، مرتبہ سید سلیمان ندوی، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۸۷ء

۳۵۔ حالی الطاف حسین، مکتوبات حالی حصہ دوم، مرتب خواجہ سجاد حسین، ص ۳۶۰،۳۶۱

۳۶۔ حالی الطاف حسین، کلیات نثر حالی، مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۸۱

۳۷۔ ایضاً، ص ۲۷۰

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۴۸

۳۹۔ حالی الطاف حسین، مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، اردو مرکز گنپت روڈ لاہور، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۰ء، ص ۱۰۴

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۰۵، ۱۰۶

۴۱۔ حالی الطاف حسین، مکتوباتِ حالی، حصہ اول، خواجہ سجاد حسین، ص ۱۸۰

۴۲۔ لد میلا وسیلیوا نیک نفس حالی، مقالہ الطاف حسین حالی تنقیدی و تحقیقی جائزے، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۳۹۹

۴۳۔ مرتضیٰ حسین فاضل، مقدمہ مثنویات حالی، شیخ مبارک علی، تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۴۴

۴۴۔ شجاعت علی سندیلوی، مطالعہ حالی، ادارہ فروغ اردو نادان محل روڈ لکھنؤ، ۱۹۵۶ء، ص ۹۱

۴۵۔ محمد اقبال، کلیات اقبال اردو، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۵۰

۴۶۔ حمید احمد خان، پروفیسر، ارمغانِ حالی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۱۳

۴۷۔ خلیل الرحمٰن داؤدی مقدمہ یادگارِ غالب، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۲۵

۴۸۔ حالی الطاف حسین، دیوان حالی، ص ۱۷۵

۴۹۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، حالی کی اردو نثر نگاری، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۶۵ ۔ ۶۶

۵۰۔ ایضاً، ص ۷۷، ۷۸

۵۱۔ حالی الطاف حسین، کلیات نظم حالی، جلد اول، مرتب ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۔۱۴

۵۲۔ حالی الطاف حسین، ترجمہ حالی، مشمولہ کلیات نثر حالی، مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۳۴۱

۵۳۔ Malik Ram "Hali" Sahitya Akademi New Delhi, 1982, P.29

۵۴۔ خلیل الرحمٰن داؤدی، مقدمہ یادگارِ غالب، ص ۴۸

۵۵۔ مقدمہ یادگار غالب، شیخ مبارک علی، تاجر کتب، لاہور، ص ۳۷۵

۵۶۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، مرتب ''اردو کا بہترین انشائی ادب''، میری لائبریری چوک انار کلی، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۱۰۶

باب سوم

مکتوباتِ حالی میں معاصرین حالی کا تذکرہ اوران کے علمی، ادبی اورشعری کارناموں کی تفاصیل

مکتوبات حالی میں معاصرین حالی

ذیل کے باب میں مولانا حالی کے ان معاصرین کا ذکر کیا جائے گا۔جن کے نام مولانا حالی کے خطوط تو نہیں ملتے لیکن ان کا تذکرہ ان خطوط میں ملتا ہے بعض کا ذکر ایک یا دو سطروں میں کیا گیا ہے جبکہ بعض کا ذکر کسی کتاب انجمن پریس، یا جلسہ کے حوالے سے بھی ملتا ہے۔ان میں ایسی شخصیات بھی ہیں جو اس عہد کے نامور ادیب، شاعر سرکاری آفیسر، کاروباری شخصیت، کتب فروش، پبلیشرر، سماجی راہنما، مہتم کتب خانہ، حکیم وغیرہ تھے۔ مثلاً مکتوب حالی کا حصہ اول میں مولوی عزیز مرزا، وحید الدین سلیم پانی پتی، حکیم اجمل خان، مولوی نذیر احمد دہلوی، انگلستان کے مشہور مصنف مسٹر سموئیل، اسماعیل میرٹھی، منشی رحمت اللہ رعد، مولوی چراغ علی، شیخ عبدالقادر، مولوی زین العابدین، مولوی عبداللہ خان صاحب، لالہ سری رام، خواجہ لطیف احمد، غلام بھیگ نیرنگ، نواب علاوالدین احمد، نواب محمد اسحق خان خواجہ غلام اثقلین، ہیڈ ماسٹر شیخ فضل الٰہی مومن خان مومن، محمد ابراہیم، مولوی محمد علی نقی، مولوی قلندر علی زبیری، مولانا حسن رضا، مسٹر آرنلڈ، نصیر الدین حیدر، رجب علی بیگ سرور، میر انیس، امام بخش ناسخ، مرزا سلامت علی دبیر، شاہ حسین الدین عبدالولی، جبکہ مکتوبات حالی حصہ دوم میں تمام خطوط ان کے دونوں صاحبزادوں خواجہ سجاد حسین جو کہ انسپکٹر تعلیمات تھے اور خواجہ اخلاق حسین جو منصرم عدالت کے نام ملتے ہیں جن میں روزمرہ زندگی کے معاملات، صحت، سرکاری مصروفیات، معاملات، خاندانی مسائل، وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔

اس کے علاوہ ان کے خاندانی حالات اولاد کے ساتھ محبت، صحت تندرستی بیماری اور معمولات خانگی کے مذکور ہیں۔

جن کتب کا ذکر ہے ان میں تزک جہانگیزی، تاریخ فرشتہ، ناسخ التواریخ، دیوان نشاط، سیرۃ النعمان، المامون، سفر نامہ روم وشام ومصر، تاریخ علم کلام، موازنہ انیس ودبیر، رسالہ الندوہ، الفاروق، سوانح مولانا روم، دستہ گل، ''حیات النذیر'' معرکہ مذہب وسائنس، روزنانہ احیا لاہور، ذوالقرنین، اردوئے معلّٰی، تذکرۃ الحفاظ،

کنزالعمال، شاعرانہ خیالات، حیات جاوید، یادگار غالب، حیات سعدی، البرامکہ، وغیرہ جیسی اہم کتابوں کا ذکر ان کے خطوط میں ملتا ہے۔

جن رسائل واخبارات کا ذکر ان میں:

- ☆ پیسہ اخبار لاہور
- ☆ رسالہ اتحاد و دلگداز لکھنو
- ☆ زمانہ کانپور
- ☆ رسالہ آفتاب جھالراپاٹن
- ☆ زوالقرنین بدایوں
- ☆ رسالہ العصر لکھنو وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جبکہ بعض خطوط ایسے بھی ہیں کسی شعر کے مطالب ومثنی تشریح اور وضاحت کرتے ہیں۔

اسماعیل میرٹھی، مولوی

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی ۱۲۔نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔آپ کے اباؤ اجداد لاوڑ کے رہنے والے تھے لیکن ترک سکونت اختیار کر کے میرٹھ میں آ کر آباد ہوئے، اسی نسبت سے وہ میرٹھی کہلائے۔جس محلے میں وہ پیدا ہوئے اس کا نام محلّہ مشائخاں تھا جو بعد میں اسماعیل میرٹھی کی وجہ سے اسماعیل نگر ہو گیا۔ یہ نام ڈسٹرکٹ بورڈ نے رکھا تھا۔ابتدائی تعلیم ایک مکتب سے حاصل کی اور یہ مکتب مرزا رحیم بیگ کے زیر اہتمام چلتا تھا۔مولانا نے اس زمانے کے مشہور استاد مرزا رحیم بیگ سے فارسی زبان سیکھی۔انھیں فن خطاطی میں بھی دسترس حاصل تھی۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ جس کا آغاز میرٹھ سے ہوا مولوی اسماعیل اس وقت میرٹھ میں تھے اور ان کی عمر تقریباً ۱۴ سال تھی۔انھوں نے نارمل سکول میرٹھ سے تعلیم حاصل کی۔ازاں بعد سر رشتہ تعلیم میں ملازمت اختیار کی۔

ابتدا میں دفتر میں ملازم ہوئے بعد میں مولوی کے عہدے پر فائز ہوئے۔انھوں نے سہارنپور، میرٹھ اور سنٹرل نارمل اسکول آگرہ میں خدمات انجام دیں۔۱۸۹۹ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر حالوف میرٹھ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

مولانا کو تصوف سے خاص دلچسپی تھی وہ حضرت غوث علی شاہ پانی پتی کے مریدین میں سے تھے۔مولوی محمد اسلم سیفی لکھتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ ان کی زندگی پر سب سے بڑا اثر ان کے پیر و مرشد مولانا غلام غوث شاہ قلندر قادری قدس سرہ العزیز کی ذاتِ بابرکات تھی۔۱۸۷۰ء یا ۱۸۶۹ء میں وہ ملاقات سے مشرف ہوئے اور دس سال تک مستفید ہوتے رہے۔شیخ کے اشارہ پر ۴۰ رباعیاں لکھیں۔شیخ کے وصال پر ترکیب بند اردو میں اور مثنوی دور آخر فارسی میں لکھی۔ چند اور فارسی کے قطعے بھی اس سلسلہ میں لکھے۔شیخ کے وصال کے بعد جب تذکرہ غوثیہ کی تدوین کا خیال مولانا شاہ گل حسن رحمۃ اللہ علیہ کو ہوا تو اس کتاب کو جامۂ زبان پہنایا۔ یہ ان کی نثر کا پہلا اور نہایت دلفریب نمونہ ہے۔''(۱)

ان کے کلام میں نظم و غزل میں پند و حکمت اور نصیحت آمیزی کا خاص عمل دخل ہے۔انھوں نے بچوں کے لیے کئی ایک نظمیں لکھیں جو یادگار بن گئیں۔ان کا کلام کلیات اسماعیل کے نام سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا جس کی زبان سادہ عمدہ اور خیالات نہایت شریں اور اعلیٰ درجے کے ہیں۔محمد یحییٰ تنہا مراۃ الشعراء میں لکھتے ہیں:

''آخری عمر میں آپ کی علمی خدمت یہ تھی کہ نواب محمد اسحاق خان صاحب مرحوم آنریری سیکرٹری ایم اے او کالج علی گڑھ کی فرمائش پر حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کی تنقید اور ان کی سوانح عمری نہایت مدلل مستند کتب و تواریخ سے مرتب کر رہے تھے اور تنقید مثنوی قرآن السعدین مکمل ہو چکی تھی کہ پیام اجل آ

پہنچا۔''(۲)

یکم نومبر ۱۹۱۷ء میں اپنے آبائی وطن میں وفات پائی۔

مولانا کو مثنوی اور بچوں کی نظمیں لکھنے میں خاص کمال حاصل تھا۔ سیدھے سادھے اور صاف خیالات میں لکھتے تھے ان کے کلام میں مولانا حالی کا سا انداز نظر آتا ہے وہ عام فہم اور سلیس انداز اپناتے ہیں۔ ان کی نظم شمع ہستی ملاحظہ ہو:

اے شمع ہستی اے زندگانی
بھاتی ہے دل کو تیری کہانی
ہے کوچ تیرا ہر لحہ جاری
جاتی ہے بگ ٹٹ تیری سواری
بجلی سے بڑھ کر بے تاب ہے تو
یا واہمہ ہے یا خواب ہے تو
کیوں چپ چپاتی ہر دم رواں ہے
آتی کہاں سے جاتی کہاں ہے
اے سب کی پیاری سب کی چہتی
کہہ منہ زبانی کچھ آپ بیتی
سنتے رہو گے میری کہانی......
جب تک ہے باقی دنیائے فانی

مولوی صاحب جب آگرہ میں مدرس تھے تو انھوں نے دو اردو ریڈریں اور پرائمر بھی لکھیں جو گورنمنٹ کی منظوری سے ایک عرصہ تک نصاب میں شامل رہیں بقول رام بابو سکسینہ:

''یہ سب ریڈریں سلاست زبان اور عمدگی مضامین کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ

درجے کی ہیں سچ پوچھیے تو ان کا جواب سرشتہ تعلیم کی منظور شدہ کتابوں میں کسی

صوبہ میں اب تک نہیں ہوا ہے۔''(۴)

مولوی صاحب شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ اور ان کا نظم و نثر میں مجموعی رنگ سادگی اور صفائی کے ساتھ انداز بیان ہے۔

چراغ علی، مولوی

مولوی چراغ علی ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے والد کا نام مولوی محمد بخش تھا۔ مولوی محمد بخش سرکاری ملازم تھے جنھوں نے میرٹھ، سہارنپور اور پنجاب کے دیگر مقامات پر ملازمت کرنے کے بعد ۱۸۵۶ء میں وفات پائی۔ مولوی محمد بخش کے چار بیٹے تھے جن میں مولوی چراغ علی سب سے بڑے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد معمولی سی ملازمت ضلع بستی کے محکمہ خزانہ سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اس وقت ان کی تنخواہ بیس روپے ماہوار تھی۔ سرکاری کام کے بعد جو وقت ان کو ملتا اس میں انھوں نے اپنی تعلیمی استعداد کو بڑھاتے رہے۔ ۱۸۷۶ء میں ایک انگریز افسر کی وساطت سے جن کے ساتھ ان کے والد محمد بخش کام کر چکے تھے نائب منصرم کی آسامی پر فائز ہوئے۔ بقول غلام پنجتن:

''۱۸۷۲ء یا ۱۸۷۳ء میں ایک انگریز افسر جس کے ساتھ ان کے والد پنجاب میں کام کر چکے تھے اودھ کا جوڈیشنل کمشنر ہو کر آیا۔ چراغ علی اسے ملنے گئے اس نے ان کا تقرر اسی ۸۰ روپے ماہوار کی جائداد نائب منصرمی پر جو اتفاق سے اس وقت خالی تھی فوراً کر دیا اس طرح یہ بستی سے لکھنؤ پہونچے اس زمانے تک انھوں نے اتنی علمی استعداد حاصل کر لی تھی کہ ان کے مضامین لکھنؤ کے رسالوں میں چھپنے لگے۔ لکھنؤ میں آکر انھیں اہل علم وفضل کی صحبت کا موقع ملا جس سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ پادری عماد الدین کی تاریخ محمدی کا جواب لکھ کر اسی زمانہ قیام

لکھنؤ میں انھوں نے شائع کیا جو نہ صرف عالم اسلام کو پسند آیا بلکہ سرسید احمد خان جنھوں نے مذہب کے بچاؤ میں ایک نئی روش اختیار کی تھی بڑی داد دی۔ عام مسلمانوں نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور چراغ علی اب مولوی چراغ علی کہلائے۔''(۴)

اودھ سے ان کا تبادلہ سیتاپور میں بطور تحصیلدار ہوگیا۔لکھنؤ میں ان کی ملاقات سرسید احمد خان سے ہوئی چنانچہ سرسید کی دعوت پر وہ رخصت لے کر علی گڑھ پونچے جہاں سرسید نے انھیں انگریزی عربی کتابوں کے تراجم پر مامور کردیا۔ ۱۸۷۷ء میں حیدرآباد چلے گئے جہاں نواب محسن الملک کے ماتحت نائب معتمد مالیات مقرر ہوئے اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے سیکرٹری ریونیو اور پولٹیکل کے عہدہ تک پہنچے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق اپنی مشہور تصنیف چند ہم عصر میں لکھتے ہیں:

''مولوی چراغ علی مرحوم نے ابتدا میں ایک معمولی منشی کی طرح دفتر میں ملازمت کی اور محض اپنی لیاقت اور محنت سے اعلیٰ رتبے پر پہنچ گئے ان کی تعلیم معمولی درجے کی ہوئی تھی لیکن لگاتار مطالعہ اور محنت کی بدولت انھوں نے وہ فضیلت حاصل کی جو بڑے بڑے ڈگری یافتوں اور صاحبانِ دستارِ فضیلت کو میسر نہیں ہوئی۔ان کی زندگی ایک سبق ہے ان لوگوں کے لیے جو دنیا میں بڑھنا اور کچھ کرنا چاہتے ہیں۔''(۵)

مولوی چراغ علی سرکاری کام بڑی محنت تندہی اور توجہ سے انجام دیتے تھے۔وہ ہمیشہ بے لاگ بے تعلق اور بے لوث رہ کر کام کرنے کے عادی تھے۔ رعائت اور جانبداری کا ان کے ہاں گزر نہیں تھا۔وہ بلا خوف وخطر اپنا کام کرتے اور سفارش اور مداخلت کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ان کی ان عادات کی وجہ سے اہل حیدرآباد ان سے نالاں رہتے تھے۔

مطالعے کے بہت شوقین تھے۔اپنے فارغ وقت میں ہمیشہ مطالعہ کرتے تھے یہاں تک کہ کھانا کھاتے

وقت بھی کوئی نہ کوئی کتاب ان کے پیش نظر ہوتی تھی۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''مسٹر محبوب علی (سپرنٹنڈنٹ مدرسہ حرفت وصنعت اورنگ آباد فرزندِ مرحوم) اپنی والدہ کی زبانی یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ فرماتی ہیں کہ میری ایک ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ رات کو ان کے سینے پر سے کتاب اٹھا کر رکھوں۔''(۶)

ان کی مشہور تصانیف تحقیق الجہاد، رسول برحق، اسلام کی دنیاوی برکتیں، قدیم قوم کی مختصر تاریخ اس کے علاوہ ان کے خطوط کا مجموعہ رسائل اور تہذیب الاخلاق میں لکھے گئے مضامین اہم ہیں۔ ۱۸۹۵ء میں پچاس سال کی عمر میں دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔ ان کی وفات پہ مولانا حالی نے قطعہ لکھا جو درج ذیل ہے:

آہ آہ از رحلتِ بے گاہ اعظم یار جنگ
کرمیانِ رہ زہمراہاں عناں پیچیدو رفت
حیف دیناراہ بہ پنجہ سادگی کردہ وداع
بزمِ مارا بزمِ ماتم باز گرد ایندو رفت
مستفیداں پُر نہ کردہ دامنِ معنی ہنوز
مُشتے از گنجینۂ لعل و گہر پاشیدو رفت
از سحابِ فیض کلکش ناشدہ سیراب خلق
ساعتے برقِ یمانی از اُفق تابید و رفت
عقدہ ہانکشودہ ماند و نکتہ ہا نوشتہ ماند
بہر جوئے شیر کوہِ بے ستوں کندید و رفت
کرد بے آزارِ خلق اعمالِ سلطانی ادا
نے زکس رنجید و نے کس را برنجا نیدو رفت
یاورانِ قوم را تا زیست یاور بود و یار

ہر چہ بتوانست در تائید شاں کوشید و رفت

از دلِ پر دردِ او گاہے صدائے برنخاست

مدّتے چوں بحرِ کاہل در نہاں جوشیدو رفت

طبع آزادش بہر ملت کہ بینی صلح داشت

در دلِ خویش و دلِ بیگانہ در گنجید و رفت

گرزید صد سال کس انجام او مرگست و بس

چوں شرر بر وضع دوراں میتواں خندید و رفت (۷)

سرسید احمد خان

سرسید احمد خان نہ صرف مولانا حالیؔ کے ہم عصر تھے بلکہ اس زمانے کے ایک اہم قومی اور ادبی راہنما کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ حالی اور سرسید کے تعلق اور ربط کا اندازہ ان کے اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے مولانا حالی کو لکھا۔ یہ خط مکتوبات سرسید جلد اول کے صفحہ نمبر ۴۸ پر درج ہے اور جون ۱۸۷۹ء کا محررہ ہے۔ لکھتے ہیں:

جناب مخدوم و مکرم من!

''عنایت نامجات مع پانچ جلدیں مسدس پہنچے جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی......

مزید لکھتے ہیں:

بے شک میں اس (نظم) کا محرک ہوا اور اس کو اپنے اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں اور جب (قیامت میں) خدا (مجھ سے) پوچھے گا کہ (اعمال میں سے) کیا لایا! میں

کہوں گا کہ حالؔی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں اور کچھ نہیں ۔''(۸)

سرسید جہاں اپنے عہد کے نامور محقق، ادیب، مضمون نگار اور تاریخ نویس تھے وہاں علمی اور صحافتی میدان میں بھی ان کی حیثیت مسلمہ ہے۔

سرسید ۱۷۔ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام سید محمد متقی تھا جو آزاد منش آدمی تھے جن کا اثر سرسید کی زندگی پر بھی نظر آتا ہے۔ سرسید کا سلسلہ نسب حضرت امام محمد تقی ابن موسیٰ رضا سے ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید خود کو تقوی سید کہتے تھے۔ سرسید کی ایک بہن اور بھائی ان سے بڑے تھے بھائی کا نام سید محمد خان اور بہن کا نام صفیۃ النساء تھا۔ سرسید بچپن میں مضبوط جسامت اور اچھی صحت رکھتے تھے۔ وہ اپنی والدہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جب ان کے نانا دوسری بار کلکتہ آئے اور سرسید کو دیکھا تو کہتے ہیں ''یہ ہمارے گھر جاٹ پیدا ہوا ہے۔''(۹)

سرسید نے ابتدائی تعلیم مولوی حمید الدین جو صاحب علم بزرگ تھے اور سرسید کے نانا کے ہاں ملازم تھے سے حاصل کی جن سے انھوں نے ابتدائی کتابیں کریما، خالق باری، گلستان، بوستان وغیرہ پڑھیں اس کے بعد کچھ عربی علوم پڑھے جن میں میبذی، شرح تہذیب، علم ریاضی انھوں نے اپنے ماموں زین العابدین سے پڑھی اس کے بعد چند دیگر علوم حاصل کیے۔ سرسید کی جسامت اور شکل وصورت کے متعلق شیخ محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں:

> ''رنگ سرخ و سفید، چہرہ نہایت پرُرعب، پیشانی بلند سر بڑا۔ بھویں جدا جدا۔
> آنکھیں مناسب اور نہایت روشن، ناک چھوٹی، کان لمبے گلے میں بڑی سی رسولی
> لمبی ڈاڑی میں بالکل چھپی ہوئی جسم فربہ قد لمبا، ہڈی چوڑی چکلی ہاتھ پاؤں قوی
> اور زبردست۔ بدن گٹھیلا اور مضبوط صورت وجیہہ وزن پورا ساڑے تین من
> لباس ترکی معاشرت انگریزی یہ تھے جوادالدولہ عارف جنگ ڈاکٹر سرسید احمد خان
> مرحوم بانی علی گڑھ کالج مجدد زبان اردو، باعث تخلیق مسدس حالی۔''(۱۰)

برصغیر کے جن ارباب کمال نے پاک و ہند کی پس ماندہ قوم کی علم وعمل کی طرف راہنمائی کی اور غفلت

سے بیدار کرنے کے لیے کوشاں رہے ان میں سر سید احمد خان کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔انھوں نے علم و آگہی کے چراغ اس وقت روشن کیے جب مسلمانانِ برصغیر کے ہر طرف اندھیرا تھا اور ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ان پر علم کے معاش کے روزگار کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔ایسے میں ہلکی روشنی بھی بہت ہوا کرتی ہے۔بقول پروفیسر رشید:

تمام عمر اندھیروں میں جس نے کاٹی ہو
وہ دھندلکوں کو بڑی روشنی سمجھتا ہے

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانان برصغیر کو ایک نئی سوچ نئی فکر سے ہم آہنگ کرنے میں اہم کردار ادا کیا ان کی ذات سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کی سوچ اور فکر سے اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے۔وہ ہمارے لیے زندگی کے ایسے بیش قیمت نمونے چھوڑ گئے جس سے آج کی نسلیں بھی مستفید ہو رہی ہیں۔خدا نے ان کو اس وقت پیدا کیا جس وقت مسلمانوں کو علم کی اور اہل علم و فکر کی شدید ضرورت تھی۔انھوں نے تلوار کی بجائے زیورِ علم سے قوم کو آراستہ کرنے کی کوششیں کی۔

اس سلسلے میں انھوں نے کئی ایک کارہائے نمایاں سرانجام دیے جن میں علی گڑھ کالج کا قیام ۱۸۷۵ء غازی پور اور مراد آباد میں مدارس کا قیام سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام ۱۸۶۴ء انجمن خواستگاران ترقی مسلماناں ۱۸۷۰ء محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸۶ء اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۲۰ء شامل ہیں۔

علمی و ادبی حوالے سے بھی ان کی خدمات طویل ہیں جن میں رسالہ اسباب بغاوت ہند، آثار الصنادید، تاریخ سرکشی بجنور، مضامین سر سید، مقالاتِ سر سید، مکتوباتِ سر سید، اس کے علاوہ انھوں نے علی گڑھ سے تہذیب الاخلاق جاری کیا۔سر سید کی علمی و ادبی خدمات نے اس عہد کو یادگار عہد کے طور پر متعارف کروایا۔یہ عہد عہدِ سر سید اور تحریک علی گڑھ کے نام سے مشہور ہوا۔سر سید بذاتِ خود ایک ذہین اور جوہر شناس آدمی تھے ان کے عہد میں علمی و ادبی اعتبار سے جو ترقی ہوئی اس میں حالی، شبلی، نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، محسن الملک، وقار الملک کی خدمات نمایاں ہیں۔اس ساری تحریک اور قافلے کے روح رواں سر سید خود تھے۔ان کے عہد میں اردو ادب میں

سادگی، مدعا نگاری اور مقصدیت کو فروغ ملا اور مقصدی ادب پروان چڑھا۔ سرسید ۱۸۹۸ء میں ایک طویل سرکاری علمی و ادبی زندگی گزارنے کے بعد ۸۱ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ مولانا حالی نے سرسید کی زندگی اور کارناموں پر اپنی مشہور کتاب ''حیات جاوید'' لکھ کر انھیں ہمیشہ کے لیے زندہ و جاوید کر دیا۔ مولانا حالی کے مکتوبات میں سرسید کے نام کوئی خط نہیں ہے جبکہ مکتوبات سرسید جلد اول میں مولانا حالی کے نام آٹھ خطوط ہیں جن سے سرسید کی محبت اور عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا حالی نے اپنے مکتوبات میں جابجا سرسید کا ذکر کیا۔ خواجہ سجاد حسین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: ''جب تک کہ سید صاحب کی لائف چھپ نہ لے نہایت عدیم الفرصت رہوں گا اور مجھ سے تمہارے گھر کی مطلق خبر نہ لی جا سکے گی۔''(۱۱)

درج بالا اقتباس سے جہاں حالی کی سرسید کے ساتھ وابستگی اور محبت کا اظہار نظر آتا ہے وہاں ان کے کام کے ساتھ لگن اور سچے جذبات کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ سرسید کے دل میں جو ان کی قدر و منزلت تھی اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

> ''علی گڑھ کالج کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۸۹۱ء میں خواجہ صاحب نے ایک ترکیب بند پڑھا جس میں متوسط درجے کے لوگوں کی حالت کو خود غرض امراء اور گدا و فقرا کی حالت سے بہتر بتایا گیا ہے۔ سرسید اسے سن کر مولانا حالیؔ کو داد دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور بولے، صاحبو! آئندہ زمانے میں اگر پوچھا جائے گا کہ فخرِ قوم، فخرِ شعراء، فخرِ ملک، فخرِ علماء قوم کو زندہ کرنے والا اور راہ بتانے والا کون ہے؟ تو کہا جائے گا! حالیؔ!''(۱۲)

حالی کے بعض خطوط میں لطافت کا پہلو بھی ابھرتا ہے۔ ایک خط میں مولانا محمد یعقوب مجددی کو لکھتے ہیں:

> ''آپ کو معلوم ہے کہ سرسید احمد خان نے جو اس قدر شہرت اور عزت ملک و قوم کی نظر میں حاصل کی ہے اس کا کیا سبب ہے۔ میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ صرف اس وجہ سے ان کو یہ رتبہ حاصل ہوا کہ ان کی اہلیہ ان کی جوانی میں مر گئی تھیں۔ بہت سے

لوگوں نے ان کو دوسری شادی کی صلاح دی مگر انھوں نے اک نہ مانی۔‘‘(۱۴)

عبدالقادر، شیخ

شیخ عبدالقادر ۱۸۷۴ کو قصور میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی بغدادی قاعدہ اپنی بہن سے پڑھا۔قرآن مجید ناظرہ پڑھنے کے بعد مدرسے میں داخل ہوئے۔قصور میں مڈل پاس کرنے کے بعد لاہور آگئے بی۔اے کا امتحان ایف سی کالج لاہور سے پاس کیا ایک انگریزی اخبار کے سب ایڈیٹر ہو کر عملی زندگی میں داخل ہوئے۔جوانی کے ایام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

’’جوانی کی دلچسپیوں میں ایک نہایت قابل یاد دلچسپی اقبال مرحوم کی دوستی سے پیدا ہوئی جس نے دور تک ساتھ دیا وہ اس وقت کالج میں پروفیسر تھے۔انہوں نے شہر میں میرے پرانے مکان کے قریب ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیا ہماری ملاقات تو پہلے ہی ہو چکی تھی شہر کی ہمسائیگی نے ہم نشینی کے مزید مواقع فراہم کر دیے میں شام کو ان کے ہاں جا بیٹھتا۔ان کے دو تین اور دوست وہاں موجود ہوتے تھے ان میں ایک تو ان کے استاد مولانا میر حسن کے فرزند سید محمد تقی تھے ان کی دوستی بہت پرانے تعلقات پر مبنی تھی۔سیالکوٹ کے ایک اور صاحب سید بشیر حیدر بھی تھے جو اس وقت طالب علم تھے۔بعد ازاں ڈپٹی ہو گئے تھے۔ایک اور طالب علم سردار عبدالغفور تھے جو اقبال کی شاعری کے بہت مداح تھے۔‘‘

آگے مزید لکھتے ہیں:

’’میں جاتا تو سلسلہ شروع ہو جاتا میں کوئی شعر یا مصرع اقبال کو سنانے کے لیے ڈھونڈ رکھتا جو طرح کا کام دے جاتا وہ حقہ پیتے جاتے اور شعر کہتے جاتے تھے۔ابو صاحب پنسل اور کاغذ لے کر لکھنا شروع کر دیتے۔اقبال کے ابتدائی کلام کا

بیشتر حصہ اس طرح لکھا گیا۔ ابو ایک مجلد کتاب میں اپنی پنسل سے یاداشتیں صاف
کر کے لکھ لیتے تھے۔ اگر ابو صاحب کا تیار کیا ہوا رسالہ موجود نہ ہوتا تو ہمارے
مرحوم دوست کا بہت سا کلام چھپنے سے رہ جاتا کیونکہ وہ اس زمانے میں اپنے پاس
کوئی مسودات نہیں رکھتے تھے۔'' (۱۴)

۱۹۰۱ لاہور سے مشہور ادبی رسالہ ''مخزن'' جاری کیا جو اس قدر مقبول ہوا کہ پورے ہندوستاں سے شعراء وادباء اپنے مضامین اور شعری تخلیقات ''مخزن'' کو بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ شیخ عبدالقادر کی مخزن کی وساطت سے تمام ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں سے خط و کتابت ہونے لگی۔ جلد ہی مخزن کا شمارہ برصغیر کے مشہور اردو رسائل میں ہونے لگا۔ کچھ عرصہ بعد وہ بار ایٹ لاء کے لیے انگلستان چلے گئے۔

بقول ڈاکٹر وحید قریشی: ''مختلف اوقات میں یونیورسٹی کی فیلو شپ ہائی کورٹ کی ججی، پنجاب کونسل کی صدارت اور مجلس اقوام میں ہندوستان کے نمائندے مقرر ہوئے۔'' (۱۵)

ان کے انگلستان کے زمانہ طالب علمی میں اقبال بھی کیمبرج میں زیر تعلم تھے۔ چنانچہ اقبال کی اور ان کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ اگر چہ لندن کے زمانہ قیام کے دوران ہی وہ تصنیف و تالیف کی طرف آ چکے تھے۔ اس دوران انھوں نے ''مقام خلافت'' جو ان کی پہلی تصنیف ہے لکھی لیکن ان کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز واپسی پر اور لاہور کے زمانہ سے ہی ہوتا ہے۔ اس دوران ان بہت سے ادیبوں شاعروں سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں جن میں آزاد سر سید، مولانا حالی، نذیر احمد دہلوی، مرزا ارشد گورگانی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خودنوشت میں مولانا حالی کے متعلق لکھتے ہیں: ''مولا حالی مرحوم کو کئی مرتبہ سنا۔ ان کا کلام سادہ تھا مگر ان کا ایک ایک لفظ اثر میں ڈوبا ہوا تھا پڑھنے کا طریقہ بھی سادہ تھا مگر نہایت پراثر۔'' (۱۶)

شیخ عبدالقادر کا شمار اردو ادب کے نامور خدمتگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے اپنے مضامین اور تحریریں اعلیٰ پائے کے ادب پاروں میں شمار ہوتی ہیں۔ وہ ایک صاحب مطالعہ شخص تھے ان کی زندگی علم وادب کی نامور شخصیتوں کے ساتھ گزری۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''سر عبدالقادر کے پاس ایک وسیع اور گراں قدر کتب خانہ تھا۔ان کی ساری زندگی مطالعہ میں گزری وہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں بے تکان گفتگو کر سکتے تھے۔اور دونوں زبانوں کے ادیب تھے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی انگریزی اور ادبی کاوشوں کا ایک تفصیلی جائزہ لیا جائے ......ہندوستان میں عبدالقادر کا نام اردو کے بڑے محسنوں میں شمار ہوتا رہے گا۔''(۱۷)

شیخ عبدالقادر کا اسلوب بہت سی ادبی خوبیوں سے مزین ہے ان کے رسالہ مخزن نے کئی نامور شخصیات اور ادیبوں شاعروں کو منظر عام پر لایا۔جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''وہ اردو ادب کے اعلیٰ ادیب اور نقاد تھے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر انہیں کامل قدرت تھی۔اور جیسے وہ بہترین انشا پرداز تھے ویسے ہی مقرر تھے اور ہر موقع پر وہ بے تکلف تقریر کرتے تھے وہ بڑے زندہ دل، خوش مذاق اور وسیع الاخلاق تھے۔''(۱۸)

ان کی مشہور تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ Famous urdu Poets and writers

۲۔ مخزن اور انتخاب مخزن، حصہ اول و حصہ دوم

۳۔ سیاحت نامہ یورپ

۴۔ مقام خلافت

۵۔ New School of urdu leterature

لالہ سری رام دہلوی

لالہ سری رام ۴ دسمبر ۱۸۷۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم دہلی میں حاصل کی پھر اپنے والد کے

ساتھ لاہور آ گئے ۔ یہاں سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔۱۸۹۵ء میں انگریزی میں ایم ۔ اے کیا اور منصفی کے امتحان میں کامیابی کے بعد منصف بنے ۔والد کا نام رائے بہادر مدن گوپال ایم اے بار ایٹ لاء تھا جبکہ ان کے چچا مشہور ماہر تعلیم ماسٹر پیارے لال آشوب تھے جو حالی اور آزاد کے دوستوں میں تھے ۔ بحیثیت منصف پہلے لاہور اور بعد میں امرتسر رہے خرابی صحت کی بنا پر ۱۹۰۴ء ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور علمی و ادبی مشاغل میں مصروف ہو گئے ۔ان کا خاندان سماجی خدمات اور سخاوت کے حوالے سے مشہور تھا۔اور دہلی کا ایک ممتاز خاندان سمجھا جاتا تھا۔ان کی ذاتی لائبریری میں ہزاروں نادر کتب اور کئی اہم تصاویر موجود تھیں جو ان کی وفات کے بعد بنارس ہندو یونیورسٹی کو دے گیں ۔ لالہ سری رام شعر و ادب سے لگاؤ رکھتے تھے ۔ ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد انھوں نے زمانہ اور مخزن میں ادبی مضامین لکھنے شروع کر دیے ساتھ ساتھ کتب کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ داغ دہلوی کے غیر مدون اشعار کو ضمیمہ یادگارِ داغ کے نام سے شائع کیا۔اس کے علاوہ بہاری لال مشتاق جو غالب کے شاگرد تھے محمد تقی بیگ مائل کا دیوان بھی شائع کے بہت سے نئے شاعروں کو روشناس کرایا اور ان کی مدد کی ۔خم خانہ جاوید ان کی اہم اور یادگار تصنیف ہے جس کی کئی جلدیں شائع ہو چکیں بقول ڈاکٹر رام بابو سکینہ:

> ’’ان کی مایہ ناز تصنیف خم خانہ جاوید کی پہلی جلد ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی ۔۵۰ مارچ ۱۹۳۰ء جب ان کی موت ہوئی وہ اس کی چار جلدیں شائع کر چکے تھے ۔ پانچویں جلد علامہ کیفی نے ان کی وفات کے بعد شائع کی اور کہا جاتا ہے کہ چھٹی جلد ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ضائع ہو گئی ۔‘‘(۱۹)

لالہ سری رام کا شمار اردو ادب کے محسنوں میں ہوتا ہے ۔اس کے ساتھ ان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ ملازمت تک قربان کر دی اور منصف سے مصنف بن گئے ۔مخطوطات،مصوری کے نادر نمونے اور نایاب کتابیں جمع کرنا ان کا مشغلہ بن چکا تھا۔اب یہ تمام کتب اور مخطوطات بنارس یونیورسٹی کی زینت ہیں اور یونیورسٹی میں ان کے نام سے ایک شعبۂ منسوب کر دیا گیا ہے ۔ان کی تصنیف خم خانہ جاوید ایک زندہ اور یادگار کارنامہ ہے جو اردو ادب کے انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا حالی کے ساتھ ان کا مختلف حوالوں سے تعلق تھا اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی تھا۔ مولانا حالی ایک خط میں مولوی عبدالحق کو لکھتے ہیں:

> ''قواعد وضوابط کا مسودہ میرے پاس پہنچ گیا ہے مگر آج تک نظر بھر کر اس کو نہیں دیکھا۔ ارکانِ شوریٰ میں ہندو صاحبوں کا نام عرض کرتا ہوں۔ لالہ سری رام صاحب یم۔ اے آف دہلی برادر زادہ رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب آف دہلی سابق انسپکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب حال پنشنر، لالہ سورج نرائن صاحب مہر تخلص سابق اسسٹنٹ انسپکٹر سررشتہ تعلیم لاہور حال پنشنر، پنڈت برجموہن کیفی تخلص معرفت پوسٹ ماسٹر شہر جالندھر، پنڈت دیانرائن صاحب نگم مالک و مہتمم رسالہ زمانہ کانپور، لالہ فقیر چند صاحب مالک رسالہ ادیب الہ آباد (پہلے اس رسالہ کے ایڈیٹر پیارے لال شاکر رئیس میرٹھ تھے)''(۴۰)

ان کی شخصیت تہذیب و شائستگی کا مرقع تھی وہ ہندوستانی تہذیب کے ایک نہایت وضع دار فرد تھے جن میں بہت سی خوبیاں موجود تھیں۔ وہ خوش گفتار، سلیقہ شعار اور خوش مزاجی میں اپنی مثال آپ تھے۔ لالہ جی کا انداز بیان اس قدر مہذب تھا کہ وہ بروں کو برا کہنے سے اجتناب کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں سینکڑوں گم نام شاعروں کا ذکر کیا اور ان کے کارناموں کی تفصیل دی۔ اس سلسلے میں آغا محمد باقر لکھتے ہیں:

> ''بعض جگہ کچھ غلط بیانیاں بھی ہوگئی ہیں جن کی بعض لوگوں نے تصحیح کر دی ہے اتنی بڑی کتاب میں غلطیاں ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ فاضل مصنف نے نہایت محنت سے ہر شاعر کے چوٹی کے اشعار منتخب کیے ہیں۔ عبارت بھی نہایت سلیس اور بامحاورہ ہے۔''(۴۱)

لالہ سری رام کا حلقہ احباب بڑا وسیع تھا پورے ہندوستان کے مختلف حصوں سے لوگ ان کے ملنے والے آتے تھے جن کو اپنی کوٹھی میں ٹھہراتے ان میں ادیب، شاعر، سماجی شخصیات شامل ہوتی تھیں۔ مولوی محمد احسن اللہ

خان ثاقب کوایک خط میں مولانا حالی لکھتے ہیں:

''مکرمی خواجہ صاحب آپ کا کارڈ پہنچا۔ میں نہایت شرمندہ ہوں کہ آپ کے خط کا جواب جلد نہ دے سکا۔ سبب یہ تھا کہ لالہ سری کام صاحب کا خط بھی آیا ہوا تھا اور مجھ سے مشاہرہ کی تعداد پوچھی گئی تھی میں حیران تھا کہ کیا لکھوں۔ آج آپ کی تحریر سے اطمینان ہو گیا بہت اچھا ہوا کہ میں نے اس باب میں ان کو کچھ نہیں لکھا۔''(۲۲)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''شیخ عبدالقادر صاحب کی توجہ سے آپ کو مخزن پریس میں خاطرہ خواہ مقام مل گیا۔ مکتوباتِ امیر کے مسودے کی بابت جو کچھ گفتگو ہو اس سے مجھے ضرور مطلع کیجیے گا۔ لالہ سری رام صاحب اور پیرزادہ صاحب کے پاس سے جب کوئی تحریر آئے گی آپ کو ضرور اطلاع دوں گا۔''(۲۳)

مولانا حالی نے اس کے علاوہ بھی کئی خطوط میں ان کا ذکر کیا ہے جو مختلف حوالوں سے ہے بعض جگہوں پر کسی کتاب یا کسی مشورہ وغیرہ کے حوالے سے ہے۔

آخری عمر میں مختلف عوارض لاحق ہو گئے چنانچہ ۲۵۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں آنجہانی ہو گئے۔

محمد عزیز مرزا، مولوی

مولوی محمد عزیز مرزا ۱۸۶۵ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ کالج سے بی۔اے کیا۔ وہ بچپن سے ہی ذہین اور ہونہار طلبا میں شمار ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے بقول:

''مرحوم لڑکپن سے ذہین و ذکی مشہور تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ اپنے ہمسروں سے ممتاز رہے اور آنرز کے ساتھ بی۔اے کا امتحان پاس کیا اور علی گڑھ

کالج کے نہایت قابل اور سعید سپوتوں میں سے تھے۔''(۲۴)

بی اے کرنے کے بعد حیدر آباد چلے گئے اور معمولی ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اپنی خدا داد صلاحیتوں، ذہانت اور محنت کے بل بوتے پر ترقی کرتے ہوئے ہوم سیکرٹری کے اہم عہدے پر مامور ہوئے وہ اپنی کارکردگی اور کام کی بدولت پوری ریاست حیدر آباد میں مشہور تھے کیونکہ وہ سرکاری امور کی کٹھن اور دشوار منزلوں کو ہمیشہ آسانی کے ساتھ طے کر لیتے تھے سرکاری ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ وہ علمی و ادبی کاموں میں بھی مصروف رہتے تھے۔ ان کا شمار مشہور نثر نگاروں میں ہوتا تھا۔ ان سے متعدد تصانیف یادگار ہیں۔ اس سلسلے میں آغا محمد باقر لکھتے ہیں:

> ''گلگشتِ فرنگ یعنی اردو ترجمہ سفرنامہ انگلستان، نواب فتح جنگ مہدی حسن، سیرۃ المحمود یعنی شاہانِ بہمنی کے مشہور وزیر خواجۂ جہاں عمادالدین محمود گاواں کے حالاتِ زندگی اور کالیداس کے مشہور ڈرامے ''وکرم اروسی'' کا اردو ترجمہ ان کی تصانیف ہیں۔''(۲۵)

ان کی تحریروں میں سادگی، سلاست، روانی اور دلکشی نظر آتی ہے۔ ان کے تحریریں اور مضامین اس عہد کے مشہور رسائل و جرائد میں شائع ہوتیں تھیں مولانا ظفر علی خان نے جب ''پنجاب ریویو'' نکالا اور اس کی اشاعت پر مولانا حالیؔ نے جو خط لکھا اس میں عزیز مرزا کے مضمون کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''پنجاب ریویو کا پہلا نمبر جس خوبی سے شائع ہوا اس کی کچھ تعریف نہیں ہو سکتی۔ مولوی محمد عزیز مرزا صاحب کا مضمون، جے۔ رام پوری صاحب کا مضمون اور مجذوب کی بڑ تینوں مضمون نہایت دلچسپ ہیں۔''(۲۶)

عزیز مرزا کے بعض مضامین اردو نثر میں بہت اعلیٰ درجے کے مضامین میں شمار کیے جاتے ہیں ان کو علمِ تاریخ سے بھی خاصا لگاؤ تھا جس کا ثبوت اس رسالے سے ملتا ہے جو انھوں نے محمود گاواں کی سیرت پر لکھا۔ وہ نہ صرف حیدر آباد میں ہر خاص و عام میں مقبول تھے بلکہ بہت سی تحریکوں کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ ان کی آمدن کا

ایک حصہ دوسروں کی سرپرستی میں صرف ہوتا تھا۔ڈاکٹر مولوی عبدالحق اپنی کتاب چند ہم عصر میں لکھتے ہیں:

> ''اس سے بڑھ کر دوسری بات جس نے مرحوم کو خاص و عام، امیر و غریب، ادنا و اعلا سب میں ہر دل عزیز بنا دیا تھا ان کی وسعتِ اخلاق تھی۔وہ چھوٹے بڑے سب سے یکساں خوش اخلاقی اور بشاشت کے ساتھ پیش آتے تھے ہر ایک کی سنتے اور ہمیشہ بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتے تھے۔نخوت و رعونت چھو کر نہیں گئی تھی چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ بھی مساوات کا برتاؤ کرتے تھے۔ان کا گھر پبلک کا گھر تھا۔صبح کے ۴ بجے سے لے کر رات کے ۱۱ بجے تک لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔''(۴۷)

حیدر آباد سے جانے اور ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے اپنی زندگی رفاعی کاموں اور مسلم لیگ کے لے وقف کر دی تھی۔وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری بنے انھوں نے مسلم لیگ کو فعال اور منظم کیا۔ان کی ایک اور اہم تصنیف ''خیالات عزیز'' ہے۔وہ مولانا حالی کے دوستوں میں سے تھے۔شاید یہی وجہ ہے کہ مکتوبات حالی حصہ اول مرتبہ خواجہ سجاد حسین میں سب سے زیادہ ذکر عزیز مرزا کا ملتا ہے۔۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔

منشی رحمت اللہ رعد

منشی رحمت اللہ نام اور رعد تخلص تھا۔۱۸۵۷ء بارہ بنکی اودھ میں پیدا ہوئے۔والد کا نام شیخ مراد بخش تھا جو کانپور میں کتب فروشی کا کام کرتے تھے۔منشی صاحب کی ساری زندگی کانپور میں گزری اور وہیں دفن ہوئے۔وہ شاعر بھی تھے لیکن اصل شہرت نامی پریس سے ہوئی۔تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے والد کے ساتھ کتاب فروشی کی دوکان پر کام کرنے لگے۔انھوں نے اردو، ہندی کتب کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا چند برسوں میں کتابوں کے کامیاب تاجر بن گئے۔۱۸۸۲ء میں کانپور میں نامی پریس قائم کیا جس کا شمار ہندوستان کے مشہور چھاپہ خانوں میں ہوتا تھا۔انھوں نے وہاں سے جنتری شائع کی جو تمام ہندوستان میں مقبول تھی جو ایک عرصہ تک چھپتی رہی۔

تقریباً ۲۰ سال تک اس میں شایانِ اسلام کی تاریخی لکھی۔ ۱۸۸۷ء میں اردو کا پہلا تصویری اخبار ''عالم تصویر'' کے نام سے جاری کیا جو پہلا مصور اخبار تھا۔ عبدالرزاق کانپوری ''یادِایام'' میں لکھتے ہیں:

''نیشنل کانگرس وجود میں آنے کے بعد ۱۸۸۷ء میں اخبار ''عالم تصویر'' جاری کیا جو اردو میں پہلا مصور اخبار تھا اس کے مقابلے میں روزانہ سات آٹھ اخبار آتے تھے۔ میرے لیے یہ بہتر مشغلہ تھا اور رحمت اللہ رعد کی چھوٹی سی دوکان میرے حق میں امام غزالی کا حجرہ تھا۔''(۴۸)

نامی پریس کانپور نے نہ صرف خوش نویسی اور مصوری میں کمال حاصل کیا بلکہ کئی یادگار کتابیں شائع کیں، جن میں البرامکہ، نظام الملک طوسی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ منشی صاحب میں قومی اور ملی خدمت کا جذبہ اس قدر تھا کہ کانپور میں جتنے بھی پروگرام منعقد ہوتے تھے ان کا انتظام وہ خود کیا کرتے تھے۔ مقدمہ دیوان حالی ۱۸۹۳ء میں نامی پریس کانپور سے چھپا جس کے ٹائٹل پر منشی رحمت اللہ رعد کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ رباعیات حالی پہلی مرتبہ آپ ہی کے زیر اہتمام شائع ہوئی جس کا ذکر مولانا حالی مولوی نظام الدین حسین ایڈیٹر ذوالقرنین بدایوں کے نام خط میں اس طرح کرتے ہیں:

''جو رباعیاں دیوان میں موجود ہیں اور منشی رحمت اللہ رعد ان کو چھاپ چکے ہیں ان کو آپ بھی چھاپ سکتے ہیں کوئی تازہ کلام ان کے سوا اس وقت موجود نہیں۔''(۴۹)

منشی صاحب کے تربیت یافتہ افراد کی ایک طویل فہرست ہے جن میں مولوی فضل الرحمٰن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ان کی کاوشوں سے کانپور میں حلیم مسلم ہائی سکول قائم ہوا جو بعد میں انٹر کالج کے درجے کو پہنچا۔ ۱۸۸۴ء میں کانپور میں ایک انجمن ''اخوان الصفاء'' کے نام سے قائم ہوئی جس کے بانی مولوی محمد حسین لکھنوی تھے جو محکمہ زراعت میں آفیسر تھے۔ انجمن کے دفتر کے ساتھ ایک چائے خانہ تھا جس کا انتظام ایک ایرانی کے پاس تھا۔ رعد سرسید کے خاص دوستوں میں شامل تھے اور قومی جلسوں میں تقریر میں کیا کرتے تھے۔ وہ ۵۰ سال کی قومی

ملی اور اشاعتی خدمات کے بعد ۱۹۲۱ء میں فوت ہوئے۔رعد ایک خوش گفتار شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ بذلہ سنج اور حاضر دماغ انسان کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔مولانا حالی مولوی عبدالحق کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

مکرمی!

''منشی رحمت اللہ رعد نے کتاب ''حیات جاوید'' کا اشتہار جنتری میں بغیر میرے مشورہ کے درج کر کے بڑی دقت میں ڈال دیا جس کی تفصیل طولانی ہے اس غلطی کا نتیجہ ہے کہ اب تک کتاب شائع نہ ہوسکی۔''(۳۰)

نذیر احمد دہلوی،مولوی

مولانا نذیر احمد کی ولادت ۱۸۳۰ء میں موضع ریہڑ ضلع بجنور میں ہوئی۔اس وقت ان کے والد مولوی سعادت علی اپنے خسر قاضی غلام علی شاہ کے ہاں ریہڑ میں مقیم تھے اور تقریباً چار سال تک وہاں رہے۔

قاضی غلام علی شاہ کی وفات کے بعد ان کی جائیداد کے بارے میں تنازعہ پیدا ہو گیا چنانچہ مولوی سعادت بجنور آ گئے اور اپنے آبائی مکان میں مقیم ہو گئے اور اپنے اجداد کی جاگیر میں زمینداری شروع کر دی جو ان کو دینی خدمات کے عوض عطا ہوئی تھی۔انھوں نے معلمی کا پیشہ اپنایا۔نذیر احمد کے والد نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی۔نذیر احمد نے ابتدائی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی۔قاعدہ پڑھنے کے بعد قرآن مجید ناظرہ پڑھا کچھ عرصہ مکتب میں بھی داخل رہے لیکن ان کے والد نے ان کو گھر میں بلا لیا اور فارسی کی کئی کتابیں پڑھائیں۔بقول سید افتخار عالم مارہروی مولف ''حیات النذیر'' ''ان کتابوں میں مینا بازار، پنج رقعہ، اور سہ نثر ظہوری بھی شامل تھیں۔''(۳۱)

نذیر احمد نے آٹھ نو سال کی عمر میں فارسی زبان میں بہت حد تک دسترس حاصل کر لی تھی۔ان کی تعلیم میں ان کے والد کا بڑا کردار تھا جس کا ذکر وہ عمر بھر کرتے رہے۔اپنے بیٹے مولوی بشیر الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں:''میں نے تمہارے ساتھ وہ کیا اور کرتا رہوں گا جو میرے باپ نے (خدا ان کو جنت نصیب کرے) میرے ساتھ کیا تھا۔''(۳۲)

نذیر احمد نے اپنے عہد کی مشہور شخصیت ڈپٹی کلکٹر ڈپٹی نصر اللہ خان سے صرف ونحو پڑھی اس کے بعد مولوی سعادت علی اپنے دونوں بیٹوں علی احمد اور نذیر احمد کو لے کر دہلی آ گئے اور مشہور پنجابی بزرگ مولوی عبدالخالق کے درس میں شامل کرا دیا۔

۱۸۴۶ء تقریباً پندرہ سال کی عمر میں وہ دہلی کالج میں داخل ہوئے۔انھوں نے مدارس کے زمانے میں خصوصاً اورنگ آبادی مسجد میں مولوی عبدالخالق سے عربی کی تعلیم پہلے ہی حاصل کر رکھی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے۔ بقول ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی:

> ''نذیر احمد نے اپنی عربی زبان دانی کی قابلیت پر آئندہ تراجم، تصانیف، تحریر اور تقریر میں بڑا فائدہ اٹھایا عربی میں وہ اپنے عہد کے ممتاز علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ انھیں اپنی اس قابلیت پر جو بڑے ریاض کا نتیجہ تھی بجا طور پر ناز تھا۔ اپنے لیکچروں میں اکثر اپنی عربی دانی کا ذکر بجو ملیح کے پیرائے میں کرتے تھے۔''(۳۳)

دہلی کالج میں انھوں نے مفتی صدرالدین اور مولانا مملوک علی سے پڑھا جو عربی زبان میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں کالج کے دیگر اساتذہ ماسٹر رام چندر اور مولوی امام بخش صہبائی سے بھی فیض حاصل کیا۔ دہلی کالج میں مولوی ذکا اللہ اور محمد حسین آزاد ان کے ہم عصر تھے۔ نذیر احمد تقریباً آٹھ برس تک دلی کالج میں رہے۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد ان کی پہلی ملازمت کا آغاز کنجاہ ضلع گجرات (پنجاب) کے سرکاری سکول میں مدرس کی حیثیت سے ہوا۔ خود لکھتے ہیں:

> ''کنجاہ پہنچ کر میں نے مدرسے کی بنیا ڈالی اور منت سماجت سے چند ابجد خواں لڑکے جمع کیے مگر میں اپنی قسمت کو روتا تھا کہ الٰہی اتنا پڑھ لکھ کر یہی حرف ناشناس منڈے میری تقدیر میں تھے لوگ سچ کہتے ہیں مکتب کے لونڈے میاں جی کی عقل چرا لیتے ہیں۔ میرا جتنا وقت کنجاہ میں صرف ہوا علم کے اعتبار سے میں اس کو رجعت قہقری سے تعبیر کرتا ہوں یعنی جس وقت میں نے کالج چھوڑا عربی کے

سینکڑوں اشعار مجھ کو یاد تھے۔ پنجاب کے دو برس کے قیام میں مشکل سے دو درجن یاد رہے ہوں گے باقی سب بھول گئے مگر خدا کا شکر ہے کہ مطالعہ کی قوت دست بردنسیان سے محفوظ رہی۔'' (۴۴)

اگر چہ نذیر احمد دہلی جیسے بھرپور شہر میں بارہ سال گذار کر آئے تھے اور کنجاہ ایک بے رونق اور چھوٹی سی بستی تھی لیکن انھوں نے جلد ہی یہاں بھی علم دوست گھرانوں کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیے جن میں مولوی فضل احمد اور علامہ سید احمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔لیکن وہ جلد ہی کانپور میں اسی روپے تنخواہ کے عوض ڈپٹی انسپکٹر ہو کر چلے گئے۔ یہ ۱۸۵۶ء کا زمانہ تھا۔۱۸۵۷ء میں نذیر احمد دہلی میں تھے۔انھوں نے ایک انگریز خاتون مسز لین کی جان بچائی۔ ہنگامہ کے بعد نذیر احمد بحال ہو گئے اور الہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔اس کے علاوہ مولانا کو طلائی تمغہ اور کچھ نقد انگریز حکومت سے بطور انعام ملا۔ کچھ عرصہ بعد انھوں نے تحصیلداری کا امتحان پاس کیا۔نذیر احمد جب ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہ آباد تھے انھوں نے چھ ماہ کے عرصہ کے دوران انگریزی زبان سیکھی اور تعزیرات ہند کے ترجمے کیے۔ بقول عبدالرزاق کانپوری:

''میور صاحب لیفٹنٹ گورنر الہ آباد جو علوم شرقیہ کے عالم تھے روزانہ تعزیرات ہند کے ترجمے کو ملاحظہ کرتے تھے اور مسودات پڑھ کر خوش ہوتے تھے اور داد دیتے تھے۔ یہ ترجمہ بلحاظ صحت و وضع اصطلاحاتِ قانون عدیم المثال ہے۔مولوی عبداللہ جان وکیل سہارنپور نے بہ سبیل تذکرہ بیان کیا ہے کہ میں چند مصطلحات کو بدلنا چاہتا تھا مثلاً بھک سے اڑ جانے والا مادہ، حفاظت خود اختیاری، خلاف وضع فطری وغیرہ۔ مسلسل چھ ماہ تک کوشش کی مگر مقصد میں کامیاب نہ ہوا اور یہ تسلیم کرنا پڑا کہ جس طرح لارڈ میکالے کا مسودہ عظیم النظیر ہے ویسا ہی ترجمہ بھی لاجواب ہے۔ ترجمے کے صلے میں لفٹنٹ گورنر نے تحصیلدار مقرر کر کے کانپور تعینات کیا۔'' (۴۵)

تعزیرات ہند کے ترجمے کے بعد ترقی کرتے ہوئے ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔انھوں نے چھ

ماہ کے قلیل عرصہ میں قرآن پاک حفظ کیا۔مولانا نذیر بورڈ آف ریونیو میں ۷۰۰ پر مشاہرہ پر بھی تعینات رہے چند سال بعد پنشن لے کر دلی آ گئے اور باقی عمر تصنیف و تالیف میں گزاری۔ ۱۸۸۸ میں علی گڑھ تحریک میں سرسید، حالی، شبلی، منشی ذکا اللہ کے ساتھ شامل ہوئے اور سرسید کے رفقا کے حلقے میں آ گئے۔مولانا نے مجموعہ نظم اردو اور مجموعہ لیکچر کے علاوہ سترہ کتابیں لکھیں ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا جبکہ ۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ ۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا اور دہلی میں دفن ہوئے۔

نذیر احمد مولانا حالی کے قدر دان تھے۔اپنی ایک نظم کی ابتدائی گفتگو میں اس طرح ان کا ذکر کرتے ہیں:

''مدح و ستائش نہ بھی ہوتا ہم یہ فائدہ کیا کم ہے کہ مجھ جیسے اناڑی عطائی کی وجہ سے خواجہ الطاف حسین حالی کا واقت حق قدرہ قدر کی جائے گی۔''(۴۶)

مولانا حالی نے اپنے مکتوبات میں ان کا ذکر کئی جگہوں پر کیا ہے کہیں حیات النذیر کے حوالے سے اور کہیں مولانا نذیر احمد کی ذات کے حوالے سے۔مولوی عبدالحق کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''حیات النذیر میں آپ کا ریویو الناظر میں پڑھا جب کا مریڈ کا دفتر کلکتہ سے دلی میں آیا تھا۔اس وقت افتخار عالم نے حیات النذیر کی ایک نامکمل کاپی میرے پاس بھی ریویو کے لیے بھیجی تھی۔ چنانچہ میں نے ان کے اصرار پر ایک مختصر ریویو لکھا تھا۔''(۴۷)

ایک اور خط بنام وقار الملک مولوی مشتاق حسین کو لکھتے ہیں: ''مولوی نذیر احمد صاحب بھی کوئی مستقل رائے رکھنے والے آدمی نہیں ہیں کیا عجب ہے کہ مولوی ذکا اللہ کے خیالات کا ان پر بھی اثر پڑے۔''(۴۸)

نذیر احمد کی علمی و ادبی خدمات:

☆ قانونی تراجم: تعزیرات ہند کے ترجمے میں شرکت

☆ مصائب غذر

☆ تاریخ دربار تاج پوشی، منتخب حکایات

☆ مبادی الحکمت، نصاب خسرو

☆ مکتوب نگاری موعظہ حسنہ

☆ خطبات لیکچروں کا مجموعہ

☆ مجموعہ شاعری نظم و نثر

☆ ترجمہ القرآن، الحقوق و الفرائض، اجتہاد، مطالعہ القرآن

☆ ناول نگاری

☆ توبتہ النصوح، ابن الوقت، رویائے صادقہ، فسانہ مبتلا اہم ہیں۔

موعظہ حسنہ نذیر احمد کے خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے بیٹے بشیر الدین احمد کو لکھے۔ یہ خطوط انھوں نے اعظم گڑھ، حیدرآباد اور دہلی سے لکھے۔ یہ مجموعہ پروفیسر محمد عبدالغفور شہباز سابق لیکچرار اورنگ آباد کالج و ڈائریکٹر تعلیمات بھوپال کی کوششوں سے مرتب ہوا اور پہلی دفعہ قومی پریس لکھنؤ سے ۱۸۸۷ء میں شائع ہوا۔ جب کہ مجلس ترقی ادب کا ایڈیشن ۱۹۶۳ء میں منظر عام پر آیا۔

نواب مرزا داغ دہلوی

فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ وہ والئی ریاست فیروز پور جھرکہ نواب شمس الدین کے فرزند تھے۔ بچپن میں یتیم ہو گئے۔ نواب شمس الدین کے پھانسی پانے کے بعد ان کی والدہ ان کو لے کر قلعہ معلیٰ میں آ گئیں۔ مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو بہادر خلف بہادر شاہ ظفر کے ساتھ عقدِ ثانی کیا اور شوکت محل کا خطاب پایا۔ قلعہ معلیٰ میں داغ کی تعلیم و تربیت شہزادوں کی صحبت میں ہوئی۔ اس لیے اُن کی زبان نہایت معتبر اور ٹکسالی سمجھی جاتی ہے۔ بقول جوش ملیسانی اس زمانے میں ان کا کہا ہو یہ شعر:

"رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

مرزا غالب کو کسی نے سنایا تو وہ وجد میں آ گئے شطرنج کی بازی چھوڑ کر دیر تک کیفیت کے عالم میں رہے اور پوچھا کہ یہ شعر کس کا ہے۔''(۳۹)

داغؔ نے فارسی کی تعلیم مولوی غیاث الدین موئلف ''غیاث اللغات'' اور مولوی احمد حسین سے حاصل کی مرزا فخرو جو ذوق کے شاگرد تھے مشاعروں میں داغ کو ساتھ لے جایا کرتے تھے چنانچہ داغ کا شعری ذوق ان کے زیر اثر پروان چڑھا۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا جس کے بعد داغ کو کئی ایک مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ابھی یہ مصائب کم نہ ہوئے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ داغ کو مجبوراً دلی چھوڑنا پڑی اور وہ رام پور آ گئے۔ نواب رام پور کلب علی خاں نے ان کو داروغہ اصطبل مقرر کر دیا۔ داغ نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیا یہیں سے ان کو شہسواری سے لگاؤ پیدا ہوا۔

داغ نے تقریباً ۲۴ سال رام پور میں آرام وسکون کے ساتھ گزارے۔ وہ نواب رام پور کے ساتھ حج وزیارت کے لیے بھی گئے۔ وہ رام پور کو آرام پور کہا کرتے تھے۔ انھوں نے لکھنو، کلکتہ اور پٹنہ کا سفر بھی کیا کلکتہ کے سفر کا ذکر اپنی مثنوی ''فریاد داغ'' میں بھی کیا ہے نواب رام پور کے انتقال کے بعد مختلف جگہوں سے پھرتے پھراتے سر آسمان جاہ کے حکم پر حیدر آباد آ گئے جہاں وہ میر محبوب علی خاں کے استاد مقرر ہوئے۔ حیدر آباد میں ان کو تنخواہ انعامات کے علاوہ بلبل ہند، دبیر الدولہ، فصیح الملک جیسے خطابات عطا ہوئے۔ حیدر آباد میں داغ کی بہت قدر ومنزلت ہوئی اور انہیں آرام وسکون میسر رہا یہاں پر امیر مینائی سے بھی ان کی ملاقات ہوئی۔ بیسیوں لوگ ان کے شاگرد ہوئے۔ بقول جوش ملیسانی:

> ''شاگردوں کی کثیر تعداد میں بے خود دہلوی۔ بے خود بدایونی۔ نوح نواروی۔ نواب سائل۔ رسا رام پوری۔ نسم بھرت پوری۔ احسن مارہروی۔ طپش مارہروی۔ مہر گوالیاری۔ نواب یار جنگ۔ حضرت اقبال۔ ندا گلاؤٹھی۔ ناطق گلاؤٹھی۔ احسن سنجی۔ مبارک عظیم آبادی۔ متین مچھلی شہری۔ وجاہت جھنجانوی۔ راز دہلوی۔ رعد گوالیاری۔ ثاقب اور سب سے بڑھ کر خود نظام دکن شامل ہوں تو اس سے بڑھ کر

ان کی شاعرانہ عظمت کا ثواب اور کیا ہوگا۔"[۴۰]

داغ دہلوی سید وحید الدین بے خود کو اپنے عزیز ترین شاگردوں میں شمار کرتے تھے۔ چنانچہ داغ کی وفات کے بعد جب اُن کی جانشینی کا مسئلہ درپیش ہوا۔ اور ایک جلسہ میں بیخود کو ان کا جانشین مقرر کیا گیا۔ جس پر مولانا حالی نے مولوی سید احمد دہلوی کے نام خط میں اس طرح اظہار خیال کیا۔

مکرمی مولوی صاحب

"روئداد جلسہ دستار بندی و جانشینی نواب فصیح الملک بہادر داغ دہلوی مرحوم دیکھ کر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی اور اس بات کا افسوس ہوا کہ جلسہ مذکورہ میں مجھ کو شریک ہونے کا موقع نہ ملا۔ میں عزیزی و شفیقی سید وحید الدین صاحب بے خود کو بلا شبہ مرحوم کی جانشینی کا مستحق جانتا ہوں اور ان کا رشید ترین شاگرد اور شاعری میں اُن کا قدم بقدم چلنے والا سمجھتا ہوں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے فصیح الملک مرحوم بھی ان کو ارشد تلامذہ میں شمار کرتے تھے اور جانشینی کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے۔

فقط

راقم خاکسار الطاف حسین حالی

۱۷ فروری ۱۹۰۸ء[۴۱]

داغ فروری ۱۹۰۵ء میں دار فانی سے رخصت ہوئے اور حیدر آباد میں دفن کیے گئے۔

مہتاب داغ، گلزارِ داغ، یادگار داغ اور مثنوی فریاد داغ ان کی یادگار کتب ہیں۔ مولانا حالی نے اپنے ایک شعر میں ان کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر وزبر

اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانہ ہرگز (۴۲)

مراۃ الشعراء میں مولوی محمد یحییٰ (تنہا) نے حالیؔ اور داغ کی ہم طرح غزلوں کا موازنہ اس طرح پیش کیا ہے۔

''حالی اور داغ کی ہم طرح غزلوں کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے کہ حالیؔ کا تخیل کہاں سے کہاں پہنچا ہے۔لیکن داغ نے دلی کی گلیوں سے آگے قدم نہیں بڑھایا یعنی داغ نے قدیم مضامین کو دہرایا ہے اور حالی کے یہاں جدت اور طرز ادا میں ندرت ہے ایک غزل کے چند قافیے جو دونوں کے یہاں بندھے ہیں۔'' ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

حالی

اغماض چلتے وقت مروت سے دور تھا
رو رو کے ہم کو اور رلانا ضرور تھا

داغ

پاس ادب سے رہ گئی فریاد کچھ ادھر
میں کیا کیوں کہ عرش بریں کتنی دور تھا

حالی

تھی ہر نظر نہ محرم دیدار ورنہ یاں
یہ خار نخل ایمن ہر سنگ طور تھا

داغ

یہاں امتحان برق تجلی ضرور تھا
کیا میں نہ تھا اس آگ میں جلنے کو طور تھا (۴۳)

داغ کی زبان میں سادگی اور شوخی عام ہوتی تھی مبالغوں دوراز کار تشبیہات سے وہ اجتناب کرتے تھے۔

مولوی عبدالحق مقدمہ انتخاب داغ میں لکھتے ہیں:

''مرزا داغ کے چار دیوان اور ایک مثنوی ''فریاد داغ'' ہے۔ داغ زبان کے بادشاہ ہیں اردو زبان پر جو قدرت انہیں حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوئی علاوہ فصاحت و سادگی کے ان کے کلام میں شوخی، ظرافت اور خاص بانکپن پایا جاتا ہے ان کا کلام اردو زبان کے محاوروں اور روزمرہ اور بول چال کا خزانہ ہے محاورے دوسروں نے بھی استعمال کیے ہیں لیکن داغ کا بے ساختہ پن نہیں پایا جاتا۔''(۴۴)

مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی

مولوی وحید الدین سلیم مولانا حالی کے ہم وطن تھے۔ وحید الدین نام تھا اور سلیم تخلص۔ ۱۸۶۹ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام مولوی فرید الدین تھا جو ملتان سے وارد پانی پت ہوئے۔ وہ حضرت بو علی شاہ قلندر کے مزار کے متولی تھے۔ مولوی وحید الدین نے ابتدائی تعلیم پانی پت میں حاصل کی پھر لاہور آ گئے۔ مولوی فیض الحسن سہارنپوری سے عربی اور مولانا عبداللہ ٹونکی سے معقول و منقول پڑھے۔ انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد قانون کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے لیکن جلد ہی محکمہ تعلیم بہاولپور میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ وہاں سے رام پور ہائی سکول گئے اور ہیڈ مولوی کی اسامی پر فائز ہوئے تھوڑے عرصے بعد جنرل عظیم الدین خان کے قتل کے بعد ملازمت ترک کر دی اور واپس پانی پت آ کر مطب شروع کر دیا آغا محمد باقر لکھتے ہیں کہ:

''مولانا حالی کی وساطت سے سرسید سے ملاقات ہوئی سرسید ان سے مل کر اس قدر خوش ہوئے کہ انہیں اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بنا لیا۔ سلیم سرسید کی زندگی بھر ان کے ساتھ رہے۔ وہ سرسید کے تصنیف و تالیف کے کام میں بہت مدد دیتے تھے۔''(۴۵)

سرسید کی وفات کے بعد صحافت کی طرف آ گئے اور رسالہ ''معارف'' نکالا جو کافی عرصہ تک کامیابی کے

ساتھ چلتا رہا۔ وہ علی گڑھ گزٹ اور زمیندار سے بھی وابستہ رہے۔ نواب محسن الملک کے اصرار پر علی گڑھ گزٹ کے ایڈیٹر بنے لیکن تھوڑے عرصے بعد علالت کی وجہ سے کنارہ کش ہو گئے بعد میں مسلم گزٹ لکھنو کے ایڈیٹر ہو گئے سانحہ مسجد کانپور کے متعلق کچھ مضامین لکھنے کی بنا پر انہیں یہ بھی چھوڑنا پڑا۔ ازاں بعد ''زمینداز'' کے چیف ایڈیٹر بنے۔ زمیندار بند ہونے کے بعد اس سے علیحدہ ہونا پڑا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''مرحوم نے عمر بھر یا تو طالب علمی کی یا علم و ادب کی خدمت۔ علاوہ ایک بلند پایہ ادیب ہونے کے وہ اعلیٰ درجے کے اخبار نویس بھی تھے مسلم گزٹ کے پرچے جن صاحبوں نے بہ غور پڑھے ہیں انہیں معلوم ہے کہ ایسے زبردست مضامین مسائل وقت پر کسی دوسرے اخبار میں نہیں نکلے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو جب انہوں نے اپنے ہاتھ میں لیا تو اس کی کایا پلٹ دی۔ یا تو وہ ایک مردہ اخبار تھا دفعتاً زندہ ہوگیا۔ ان کا رسالہ معارف اردو کے ان چند رسالوں میں ہے جنہوں نے ملک میں علمی ذوق پیدا کرنے اور زبان کی حقیقی خدمت کی ہے۔''(۴۶)

مولوی وحیدالدین سلیم بہت اچھے مضمون نگار اور مترجم تھے اس بنا پر دارالترجمہ حیدرآباد والوں نے انہیں بلالیا۔ یہاں کچھ دیر بعد جامع عثمانیہ میں پہلے اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر اور بعد ازاں پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہ اعلیٰ درجے کی لیاقت رکھتے تھے۔

بقول آغا محمد باقر:

> ''سلیم مرحوم کی طرز نہائت زوردار، سلیس اور معنی خیز ہے ان کے ہاں کہیں کہیں جذبات کے مرقع بھی نظر آتے ہیں۔ غیر مانوس عربی فارسی الفاظ کے شائق نہیں بلکہ مولانا حالی کی طرح شریں اور سریلے الفاظ اپنی تحریروں میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ وضع اصطلاحات ان کی معرکتہ آلارا تصنیف ہے۔ تلسی داس کی شاعری، اردو دیومالا، عرب کی شاعری پر اعلیٰ درجے کے مضامین رسالہ اردو

میں لکھے تھے۔ (۴۷)

مولوی وحید الدین سلیم، مولانا حالی سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کا بے حد احترام کرتے تھے وہ مولانا حالی کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کر سکتے تھے اس سلسلہ میں روشن پانی پت ایک واقعہ لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ باہر سے ایک واعظ آیا اور درگاہ حضرت قلندر صاحب پہ واعظ کرتے ہوئے مولانا حالی کی شان میں یہ کہہ دیا کہ کہ مولانا حالی نیچری اور بے دین ہیں۔ یہ خبر مولانا سلیم تک پہنچی اگلے روز پھر اس واعظ کا وعظ ہونا تھا۔ مولانا کمر کس کر اور اپنے احباب کا ایک مجمع ساتھ لے کر جلسہ میں پہنچے اور سامعین سے خطاب کر کے فرمایا: اے مسلمانوں اس کافر وملحد کا وعظ سننا تمہارے لیے حرام ہے یہ مسلمان نہیں نہ کلمہ کو ہے اور نہ کلمے کے معنی سمجھتا ہے۔'' (۴۸)

ان کے سیاسی تاریخی اور ادبی مضامین کثیر تعداد میں ہیں وہ سادہ اور سلیس لکھتے تھے افادات سلیم طبع ہو چکی ہے جو ان کی تحریروں کا شاہکار ہے۔

آخری عمر میں سرطان کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور حیدر آباد سے اپنی صاحبزادی کے ہاں ملیح آباد (اودھ) علاج کے لیے آئے لیکن جانبر نہ ہو سکے۔ بالآخر ۲۹ جولائی ۱۹۲۸ء میں راہی ملک عدم ہوئے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد اسلم سیفی، مولوی، اسماعیل میرٹھی، مشمولہ نقوش شخصیات نمبر۲، ادارہ فروغ اردو لاہور، اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص ۵۔۱۴

۲۔ تنہا مولوی محمد یحییٰ، مرآۃ الشعراء، جلد دوم، شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور، ۱۹۵۰ء، ص ۱۲۴

۳۔ سکسینہ رام بابو، تاریخ ادب اردو، عشرت پبلشنگ ہاؤس ہسپتال روڈ لاہور، سن ندارد، ص ۵۰

۴۔ غلام پنجتن، چراغ علی مولوی، مشمولہ نقوش شخصیات نمبر۲، ادارہ فروغ اردو لاہور، ص ۷۶۹

۵۔ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر، چند ہم عصر، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۱۳

۶۔ ایضاً، ص ۳۱

۷۔ حالی الطاف حسین، مکاتیبِ حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، اردو مرکز گنپت روڈ لاہور اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۰ء، ص ۶۵

۸۔ سرسید احمد خان، مکتوبات سرسید، جلد اول، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلسِ ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۴۸

۹۔ سلیم اختر، پروفیسر، تلخیص، حیات جاوید، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۳۵

۱۰۔ محمد اسماعیل پانی پتی، سرسید احمد خان، مشمولہ نقوش، شخصیات نمبر۲، ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۴۳

۱۱۔ حالی الطاف حسین، مکتوبات حالی، حصہ دوم، مرتب خواجہ سجاد حسین، حالی پریس پانی پت، ۱۹۲۵ء، ص ۲۴۳

۱۲۔ صادق قریشی، ذکرِ حالی، اردو مرکز گنپت روڈ لاہور، ۱۹۴۹ء، ص ۱۳

۱۳۔ حالی الطاف حسین، مکتوبات حالی، حصہ اول، مرتب خواجہ سجاد حسین، حالی پریس پانی پت، ۱۹۲۵ء، ص ۱۲۲

۱۴۔ عبدالقادر، خودنوشت مشمولہ مقالات عبدالقادر، مرتب، محمد حنیف، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۴۱۔۴۲

۱۵۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، مرتب، اردو کا بہترین انشائی ادب، میری لائبریری لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۱۴۳

۱۶۔ عبدالقادر، خودنوشت مشمولہ مقالات عبدالقادر، مرتب، محمد حنیف شاہد ص ۴۸

۱۷۔ محمد باقر، ڈاکٹر، عبدالقادر، نقوش، شخصیات نمبر، ادارہ فروغ اردو لاہور، جنوری ۱۹۵۵، ۵۸۳، ۵۸۴

۱۸۔ ماہنامہ اوراق نو،عبدالقادر نمبر،ص ۳۰

۱۹۔ رام بابا سکسینہ، ڈاکٹر، لالہ سری رام دہلوی، مشمولہ نقوش، شخصیات نمبر ۲، ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۵۶ء، ص ۱۴۱۰

۲۰۔ حالی الطاف حسین، مکتوبات حالی، جلد اول، مرتب خواجہ سجاد حسین، حالی پریس پانی پتی، ۱۹۲۵ء، ص ۹۸۔۹۹

۲۱۔ محمد باقر، آغا، تاریخ نظم ونثر اردو، آزاد بک ڈپو امرتسر ۱۹۳۳ء، ص ۳۲۲۔۳۲۱

۲۲۔ حالی الطاف حسین، مکتوبات حالی، جلد اول، مرتب خواجہ سجاد حسین، ص ۱۱۵

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۲۴۔ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر، چند ہم عصر، ص ۵۹

۲۵۔ محمد باقر، آغا، تاریخ نظم ونثر اردو، ص ۳۱۵

۲۶۔ حالی الطاف حسین، مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ص ۶۴

۲۷۔ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر، چند ہم عصر، ص ۶۲۔۶۳

۲۸۔ کانپوری، محمد عبدالرزاق، یادایام، عبدالحق اکیڈمی، اشاعت منزل کوچہ عبدالحق حیدرآباد دکن، دسمبر ۱۹۴۶ء، ص ۳۳۲

۲۹۔ حالی الطاف حسین، مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ص ۷۷

۳۰۔ حالی الطاف حسین، مکتوباتِ حالی، حصہ اول، مرتب خواجہ سجاد حسین، ص ۴۰

۳۱۔ مارہروی افتخار عالم، حیات النذیر، مطبوعہ بھوپال، ۱۹۱۲ء، ص ۱۴

۳۲۔ افتخار احمد صدیقی، پروفیسر، مقدمہ موعظہ حسنہ (ڈپٹی نذیر احمد کے خطوط کا مجموعہ)، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۱۲۴

۳۳۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، نذیر احمد دہلوی، احوال و آثار، مجلس ترقی ادب لاہور، ص ۷۷

۳۴۔ نذیر احمد دہلوی، لیکچروں کا مجموعہ، جلد دوم، مشمولہ اقتباس، نذیر احمد دہلوی احوال و آثار، مجلس ترقی ادب لاہور، ص ۳۲۴،۳۲۵

۳۵۔ کانپوری محمد عبدالرزاق، یاد ایام، عبدالحق اکیڈمی اشاعت منزل کوچہ عبدالحق حیدر آباد دکن، ۱۹۴۶ء، ص ۳۷

۳۶۔ لیکچروں کا مجموعہ جلد دوم، مشمولہ اقتباس، نذیر احمد دہلوی، احوال و آثار، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۸۶

۳۷۔ حالی الطاف حسین، مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ص ۴۸

۳۸۔ حالی الطاف حسین، مکتوباتِ حالی، حصہ اول، مرتب خواجہ سجاد حسین، ص ۳

۳۹۔ جوش ملیسانی، مقالہ داغ دہلوی مشمولہ نقوش، شخصیات نمبر۲، ادارہ فروغ اردو لاہور، اکتوبر ۱۹۵۶، ص ۹۷

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۴۷

۴۱۔ حالی الطاف حسین، مکاتیب حالی، مرتب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، اردو مرکز گنپت روڈ لاہور، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۰، ص ۸۸

۴۲۔ حالی الطاف حسین، دیوان حالی، عشرت پبلشنگ ہاؤس ہسپتال روڈ لاہور، ۱۹۶۴، ص ۶۹

۴۳۔ تنہا مولوی محمد یحییٰ، مرآۃ الشعرا جلد دوم شیخ مبارک علی لاہوری دروازہ لاہور ۱۹۵۰، ص ۴۳

۴۴۔ مولوی عبدالحق، مقدمہ انتخاب داغ، مشمولہ مقدمات عبدالحق، مرتب ڈاکٹر عبادت بریلوی، اردو مرکز گنپت روڑ لاہو، ۱۹۶۴ء، ص ۴۴

۴۵۔ محمد باقر آغا، تاریخ نظم ونثر اردو، آزاد بک ڈپو امرتسر، ۱۹۳۳ء، ص ۳۱۷

۴۶۔ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر، چند ہم عصر، ص ۱۱۹۔۱۱۸

۴۷۔ محمد باقر آغا، تاریخ نظم ونثر اردو، ص ۳۱۷

۴۸۔ روشن پانی پتی، مولوی وحید الدین سلیم، مشمولہ نقوش شخصیات نمبر، ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۵۵ء، ص ۲۶

باب چہارم

مکتوباتِ حالی میں افکارِ حالی اور شعری نظریات

کسی بھی شاعر یا ادیب کے افکار ونظریات کو سمجھنے کے لیے اس کے عہد اور پس منظر سے آگاہی ضروری ہوتی ہے کیونکہ وہ جس عہد میں رہتا ہے اس زمانے کے معروضی حالات اس کی ذات اور اس کی تخلیقات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ ہر شاعر اور ادیب کا ایک خاص انداز فکر ہوتا ہے جو اس کی تخلیقات میں جھلکتا ہے۔بقول ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی:

> ''ادب اور ادیب دونوں اپنے عہد اور ماحول سے متاثر ہوتے ہیں اور ہر عہد اپنے ماضی کی روایات صالحہ اور کاذبہ کا آئینہ دار ہوتا ہے، ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے۔یہ ازمنہ ثلاثہ بظاہر الگ الگ ہیں، لیکن حقیقت میں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں، جو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کی جا سکتیں۔''(۱)

ادیب یا شاعر اپنے گرد و پیش کی دنیا میں رہتا ہے اور اس کو محسوس کرتا ہے۔اس معاشرے کے ساتھ روابط رکھتا ہے۔اس پر معاشرے کے خارجی اور داخلی حالات اثر انداز ہوتے ہیں۔چنانچہ ایک تخلیق کار جو کچھ کہتا ہے اس میں اس کے اندر کی تحریک اور ماحول کارفرما ہوتا ہے نیز اس کے حالات میں ایسے محرکات موجود ہوتے ہیں جو اسے لکھنے پر مجبور کرتے ہیں البتہ اس کی فطری صلاحتیں اور فنی کمالات اس کو عروج پر پہنچا دیتے ہیں۔

مولانا حالی نے اپنی زندگی میں کئی انقلاب اور زمانے کے اتار چڑھاؤ دیکھے اس کے ساتھ انھیں کئی ایک ادبی اور سماجی تحریکوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔وہ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔یہ بہادر شاہ ظفر کا زمانہ تھا اور مغلیہ دور ختم ہو رہا تھا۔ہندوستان معاشرتی اور تمدنی اعتبار سے زوال پذیر تھا۔۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر میں سیاسی، ادبی اور تمدنی تبدیلیوں کا آغاز ہوتا ہے۔مولانا حالی مسلمانوں کے زوال کو قریب سے دیکھتے ہیں اور اس کے اسباب کا بغور مطالعہ کرتے ہیں اور اس کی راہ نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ان کی مشہور زمانہ نظم ''مسدس حالی''

اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔وہ ایک حساس اور باشعور انسان تھے جو حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

حالی کی شاعری کا ابتدائی دور دہلی کا وہ زمانہ ہے جب وہ پانی پت سے حصول علم کی غرض سے دہلی گئے۔ اس وقت ان کی عمر سترہ برس کے قریب تھی۔حالی کی دلی میں آمد کے حوالے سے ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

> ''حالی پہلی بار جب دلی آئے تو وہ بہت کم عمر طالب علم تھے۔سترہ اٹھارہ سال عمر تھی اور چوں کہ انھیں علم حاصل کرنے کی لگن تھی اس لیے دلی کی ادبی محفلوں اور مشاعروں سے دور رہے یا بہت کم ان میں شرکت کی لیکن دوسری بار یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۸۶۱ء میں ملازمت کی تلاش میں جب حالی دلی آئے تو ان کی عمر تقریباً ۲۴ سال تھی اب وہ صاحب علم تھے فارسی اور عربی اور اس عہد کے دیگر مروجہ علوم پر خاصی قدرت حاصل کر چکے تھے اس لیے انھیں خود پر اعتماد حاصل ہو چکا تھا اور اب ان میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔''(۲)

حالی عالم شباب میں بھی ایک نیک طبیعت اور صالح نوجوان تھے۔وہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل تھے۔دلی کے قیام کے زمانے میں وہ مرزا غالب کی صحبت میں حاضر ہوا کرتے تھے غالب سے انھوں نے شاعری کے بنیادی اصول اور رموز سیکھے۔صادق قریشی اس دور کا ایک واقعہ لکھتے ہیں:

> ''ایک مرتبہ مرزا غالب کو با قاعدہ نماز ادا کرنے کی نصیحت کرنے لگے مرزا غالب زمانے کے سرد وگرم چشیدہ اور اسرار تصوف سے آشنا عجب آزادہ رو انسان تھے۔ حالی کی نصیحت سن کر برس پڑے اور اپنی گنہگاری کا اعتراف ایسے دل خراش الفاظ میں کرنے لگے جن سے غم و غصہ کا اظہار ہوتا تھا۔ایک نظم میں حالی کا شکوہ کیا۔ حالی نے جواب میں معذرت کا ایک قطعہ لکھا''۔(۳)

قطعہ ملاحظہ ہو:

تو اے کہ عذر فرستادہ ای بہ سوے رہی

سزد کہ جان گرامی براں نثار کنم

شکایتے کہ تواں گفت عین اخلاصش

گرم تو دوست شماری ہزار بار کنم

نماندہ قاعدۂ شکرِ بے ربا بہ جہاں

اساس دوستی از شکوہ استوار کنم

چو شکوہ جز بہ تقاضائے دوستی نہ بود

زغیر شکر و شکایت زدوستدار کنم

سرشت پاک و دل صاف دادہ اندمرا

بہ حرفِ تلخ و لے خالی از غبار کنم

خوش آنکہ ساز کنم از تو شکوہ بے جا

تو اعتذار کنی و من افتخار کنم (۴)

حالی کے قطعہ کے جواب میں مرزا غالب نے نواب محمد مصطفےٰ شیفتہ (جو فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے) کو ایک قطعہ لکھا کیونکہ حالی ان دنوں شیفتہ کے ہاں مقیم تھے اور ان کے بچوں کی اتالیقی پر مامور تھے مرزا کا قطعہ ملاحظہ ہوں جس میں معذرت کا اظہار کیا گیا ہے۔

تو ای کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری

ہمی بہ لطف تو خودرا امید وار کنم

چو حالی ازمن آشفتہ بے سبب رنجید

تو گر شفیع نہ گردی بگو ، چہ کارکنم

دوبارہ عمر دہندم اگر بفرض محال

براں سرم کہ دراں عمر ایں دو کارکنم

یکے ادائے عبادات عمر پیشنہ

دگر بہ پیش گہ حالی اعتذارکنم (۵)

مذکورہ بالا قطعہ سے جہاں ایک طرف مرزا غالب کی حالی کے ساتھ محبت کا اظہار ہوتا دوسری طرف یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حالی عالمِ جوانی میں بھی ایک محترم نوجوان تھے۔

مولانا حالی کے پہلے دور کی شاعری میں وہی روایتی مضامین ہجر ووصال، حسن وعشق محبوب کی بے مروتی وغیرہ ملتے ہیں۔حالی کے اس دور کی غزلیات میں وہ ساری صفات نظر آتی ہیں جو غزل گوئی کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔مرزا غالب کی وساطت سے ان کی ملاقات نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ سے ہوئی جو حالی کو اپنے ساتھ جہانگیر آباد لے گئے۔۱۸۶۱ء کا زمانہ تھا چنانچہ حالی آٹھ برس شیفتہ کے پاس رہے۔حالی شیفتہ کے ادبی مزاج سے بہت متاثر ہوئے۔نواب شیفتہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔وہ ابتداء میں مومن کو اپنا کلام دکھایا کرتے تھے۔مومن کی وفات کے بعد غالب سے مشورہ سخن کرنے لگے چنانچہ حالی کا شیفتہ کی صحبت میں بہت اچھا وقت گزرا۔شیفتہ کی وفات کے بعد حالی بے روزگار ہو گئے۔بیان حالی کے مطابق:

> ''اس زمانے میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔انہی کے ساتھ میں جہانگیر آباد سے اپنا کام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ واصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے۔''(۶)

حالی کے شعری نظریات کو سمجھنے کے لیے غالب اور شیفتہ کے نظریہ شعر کو سمجھنا ضروری ہے۔

جب وہ دلی کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے تو شعرا کے ملاپ سے ان کے شعری ذوق اور صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہو چکا تھا اور وہ ایک پختہ شاعر کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے پھر غالب اور شیفتہ کی

صحبتوں نے ان پر گہرا اثر ڈالا وہ غالب اور شیفتہ کی شاعری کو اس لیے پسند کرتے تھے کہ دونوں شعرا بازاری پن اور عامیانہ شاعری ناپسند کرتے تھے خاص طور پر شیفتہ جن کے ساتھ ان کا زیادہ وقت گزرا چنانچہ ''یادگارِ غالب'' میں شیفتہ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''شعر کا جیسا صحیح مذاق ان کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا۔ویسا بہت ہی کم دیکھنے میں آیا ہے لوگ ان کے مذاق کو شعر کے حسن و قبیح کا معیار جانتے تھے ان کے سکوت سے شاعر کا شعر خود ان کی نظر سے گر جاتا تھا اور ان کی تحسین سے اس کی قدر بڑھ جاتی تھی۔''

شیفتہ سادہ بیانی نے ہمیں چمکایا
ورنہ صنعت میں بہت لوگ ہیں بہتر ہم سے

یا پھر یہ اشعار دیکھیے:

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی
وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہے
بناوٹ سے نہیں خالی کوئی بات
مگر ہر بات میں اک سادہ پن ہے (۷)

غالب کے اسلوب اور شاعری میں جہاں سنجیدگی معنی آفرینی اور متانت نظر آتی ہے وہاں ایک لطف کا احساس ملتا ہے۔بقول پروفیسر عبدالمغنی:

> ''غالب کی شعریت میں وہ دبازت ہے جو متانت سے پیدا ہوتی ہے۔ان کے اشعار کی تہ داری ان کے کلام میں وزن کا باعث ہے نہ کہ ثقل کا اگرچہ اس میں ایک دقیقہ سنجی ہے مگر اسے ژولیدگی سمجھنا صحیح نہیں۔یہ ایک وقت نظر ہے نہ کہ معمہ بازی یہ ایک مرکب اسلوب نگارش ہے کوئی پر پیچ طرز بیاں نہیں اس کی پیچیدگی

بمقابلہ سادگی بالیدگی کی غماز ہے۔''(۸)

غالب کا نظریہ فن یہ ہے کہ وہ شاعری کے معیار اور تاثر Poetic effect پر نظر رکھتے ہیں۔وہ الفاظ و معنی، اسلوب اور اس کے فنی محاسن کو پیش نظر رکھ کر لکھتے ہیں۔اور مربوط انداز میں لطف سخن پیدا کرنے کے قائل ہیں۔پروفیسر عبدالمغنی نے غالب کے فن کی جو نمایاں خصوصیات بیان کی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ تخیل کی بلندی

۲۔ ایمائیت

۳۔ جستجوئے حقیقت

۴۔ شوخی فکر

۵۔ پرتاثیر پیکرتراشی

۶۔ لطف سخن

۷۔ تخیل وتفکر کی کامل ہم آہنگی(۹)

چنانچہ حالی ابتدا میں غالب کے نظریہ فن سے متاثر تھے اور ان کی معنی آفرینی تخیل کی بلندی کو شاعری کا اصل جوہر سمجھتے تھے۔غالب کے کلام کی اہم خوبی یہ ہے کہ وہ پڑھنے والوں کو نہ صرف مسحور کر دیتی ہے بلکہ اس کی حسیات کو بیدار کرتی ہے۔یہی چیز حالی کے لیے اہم ہے۔غالب کے تتبع کے سلسلہ میں ان کا وہ خط اہم ہے جو انھوں نے دیوان وحشت کے مطالعہ کے بعد وحشت کلکتوی کو لکھا۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''مولانا اگر انصاف سے دیکھیے تو مرزا کا تتبع کرنا ہم لوگوں کا حق تھا مگر آپ نے یہ ہمارا حق ہم سے چھین لیا ہے۔سچ ہے ''دورانِ با خبر در حضور و نزدیکانِ بے خبر دور'' تکلف بر طرف اگر مرزا صاحب کے ان بلند اور اچھوتے خیالات کو جن میں وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے مستثنٰی کر لیا جائے تو آپ کو بلاشائبہ تصنع کے کلام کا نمونہ قرار دینا ہرگز داخل مبالغہ نہیں ہوسکتا اور چونکہ ایشیا کی قدیم شاعری بظاہر

چراغ سحری معلوم ہوتی ہے اور فارسی زبان ہندوستان سے آہستہ آہستہ مفقود ہوتی جاتی ہے۔"(۱۰)

حالی نے رسمی خیالات اور فرسودہ باتوں سے اجتناب کیا اور سیدھی سادی اور مبالغہ سے پاک زبان کو پسند کیا۔ حالی جہاں شاعری کی فنی خوبیوں پر توجہ دیتے ہیں وہاں وہ اس کو معاشرتی ترقی کے لیے بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ حالی نے قدیم شاعری کو نئی زبان عطا کی جس سے زبان اور معنی دونوں میں اضافہ ہوا علاوہ ازیں انھوں نے تقلید کی روش ترک کر کے نئی چیزیں اور نئے موضوعات اس میں داخل کیے۔ حالی کے خیالات اور الفاظ کو مربوط کر کے پیش کیا وہ اس چیز کو شاعری کے لیے ضروری خیال کرتے تھے اس کے علاوہ وہ الفاظ اور معنی کے تعلق اور زبان کی درستی پر بڑا زور دیتے ہیں اگر دیکھا جائے تو مذکورہ بالا چیزیں حالی کے کلام نظم و نثر میں نظر آتی ہیں۔

حالؔی شیفتہ و غالب سے متاثر ہونے کے باوجود شاعری میں اسلاف کی پیروی کے قائل نہ تھے اور اپنی ایک الگ راہ نکالنا چاہتے تھے جس میں وہ کامیاب رہے۔ خود لکھتے ہیں:

سخن میں پیروی کی گر سلف کی
انہی باتوں کو دہرانا پڑے گا
بشر پہلو میں دل رکھتا ہے جب تک
اسے دنیا کا غم کھانا پڑے گا (۱۱)

حالی نے مقدمہ میں فن شاعری کے خوبیوں کو ایک معیاری نثری اسلوب میں سمجھنے اور سمجھانے کی طرف توجہ دی وہ خود بھی شاعر تھے لہٰذا ان باریک نقطوں کو انھوں پہلی بار سامنے لانے کی کوشش کی کہ شاعری صرف عشق و عاشقی، ہجر و وصال، شکوہ حالات، شکوۂ محبوب، غم ہجراں، غم روزگار، اور زمانے کو بے وفا کہنے کا ہی نام نہیں بلکہ اس کے بہت سے دیگر اہم مقاصد بھی ہیں۔ جن سے کام لے کر ہم معاشرتی اصلاح اور سماجی بہتری کے کام کر سکتے ہیں۔ انھوں نے ناقدانہ انداز میں غزل، مثنوی، قصیدے اور مرثیے وغیرہ پر الگ الگ بحث کرنے کے بعد

بہت سے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔انھوں نے شعر کی اصلیت، ماہیت اور اس کی صفات پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔وہ اچھے کام، اچھے ذوق اور اچھے ادب کے قدر دان نظر آتے ہیں۔اس حوالے سے انھوں نے کئی ایک مغربی اور مشرقی شاعروں کو بطور حوالہ پیش کیا ہے۔وہ کہنا چاہتے ہیں کہ عشق کوچہ جاناں میں اپنی آبرو برباد نہ کرتا پھرے۔بقول اقبال:

عشق اب پیروی عقل خداداد کرے

آبرو کوچہ جاناں میں نہ برباد کرے (۱۲)

ان کے نزدیک شعرو شاعری کے کئی مقامات ہیں جن سے مستفید ہوا جا سکتا ہے۔حالی نے ان لوگوں کو نئی راہ دکھائی جو شاعری کو صرف محاورہ بندی، عروض اور ہم وزن بنانے کے قائل تھے۔انھوں نے بڑے دانشمندانہ انداز سے بات کی ہے اور دلائل سے اپنی بات کو ثابت کرنے کی طرف خاص توجہ دی ہے۔حالی کی تنقید کے متعلق پروفیسر حمید احمد خاں لکھتے ہیں:

''مقدمہ شعرو شاعری میں ایسے تنقیدی نکتے بھی جا بجا ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حالی بطور نقاد کے ایک واضع اجتہادی شعور کے مالک تھے مثلاً شعر گوئی کی ٹیکنیک کے بیان میں انھوں نے ردیف اور قافیے کے باہمی فنی تعلق سے جو بحث کی ہے وہ بڑی سبق آموز ہے۔اس بحث کی صحت وصداقت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم اقبال کے دورِ پختگی تک پہنچتے ہیں اور بالِ جبریل میں قافیہ و ردیف کا وہی استادانہ استعمال دیکھتے ہیں جس کی ناقدانہ نشاندہی حالی نے چالیس برس پہلے کر دی تھی۔''(۱۳)

وہ شعر کی تاثیر کے مطلق بھی کھل کر اظہار خیال کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اچھا شعر وہ ہوتا ہے جو تاثیر سے پر ہو۔اور سننے والے کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکے۔وہ شعر کی اخلاقی اور سماجی حیثیت کو بھی نظر انداز نہیں کرتے اور پھر اس کے جمالیاتی پہلو پر بھی بحث کرتے ہیں۔

مولانا حالی عربی و فارسی پر قدرت رکھتے تھے اور یہ چیز انھیں کامیابی عطا کرتی ہے۔ وہ ایک مقبول نقاد کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ بقول پروفیسر حمید احمد خان: ''کو مقدمہ نئی تنقید کا نقطۂ آغاز ہے مگر اس کے باوجود آج بھی فنِ تنقید کے ایک زندہ کتاب ہے۔''(۱۴)

مولانا حالی کا لکھا ہوا مقدمہ شعر و شاعری اردو ادب میں جدت اور وسعت کا سبب بنا۔ اور اسے اردو تنقید کا نقش اولین قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کے خطوط میں ان کے شعری نظریات کی جھلک اس طرح دیکھی جا سکتی ہے۔ حالؔی مقدمہ شعر و شاعری کے سبب تصنیف کے متعلق ایک خط حافظ سعد اکبر عثمانی کو لکھتے ہیں جو نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

> ''مجھ کو قاضی صاحب مرحوم کے کتب خانے میں سے ایک کتاب مطلوب ہے جس کا نام ''مزہر'' ہے مصر کی چھپی ہوئی ہے اور اصولِ علم لغت میں جلال الدین سیوطیؒ نے لکھی ہے اس کی ضخامت شرح وقامہ سے کچھ زیادہ ہوگی۔''

آگے مزید لکھتے ہیں:

> ''میں ایک لمبا چوڑا مضمون مسلمانوں کی شاعری پر لکھنا چاہتا ہوں جس میں زمانہ جاہلیت سے لے کر آج تک ان کی شاعری کی حقیقت لکھی جائے گی اور عربی فارسی اور اردو تین زبانوں کی شاعری پر بحث کی جائے گی۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ اردو کی شاعری جو نہایت خراب اور مضر ہوگئی ہے اس کی اصلاح کے طریقے بنائے جائیں اور یہ ظاہر کیا جائے کہ شاعری اگر عمدہ اصول پر مبنی ہو تو کس قدر قوم اور وطن کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اس نیاز نامہ کا جواب جلد مرحمت ہو۔ زیادہ نیاز۔
>
> خاکسار الطاف حسین از دہلی ۹ جنوری ۱۸۸۲ء''(۱۵)

حالی کا یہ مضمون مقدمہ شعر و شاعری کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ حالی پہلے کسی نقطہ یا صنف کی وضاحت کرتے ہیں اور دلائل کے ساتھ نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں البتہ ان کے افکار و نظریات میں اخلاقی نقطہ

نظر زیادہ نمایاں اور واضح ہو کر ابھرتا ہے۔ جو بسا اوقات ان کے تنقیدی خیالات ونظریات کی کمزوری کا سبب بنتا ہے۔لیکن مقدمہ کا اندازِ بیان تنقیدی ہونے کے باوجود اپنے اندر سنجیدگی اور وقار لیے ہوئے نظر آتا ہے۔اس سلسلے میں محترمہ صالح عابد حسین لکھتی ہیں:

''مقدمہ شعر و شاعری کا انداز بیان مدلل، رواں، دلچسپ اور پر اثر ہے۔عبارت میں سادگی، سلاست اور روانی موجود ہے۔معنی کی صحت، لہجے کی متانت اور علمی و ادبی نکات کو صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں بیان کرنا حالی کا حصہ ہے۔اس کی زبان بھی حالی کی وہی مخصوص زبان ہے، جس میں ہندی اور اردو کے خوبصورت اور موزوں الفاظ کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں انگریزی کے کرخت اور بے جوڑ الفاظ نظر بٹو کی طرح آنکھوں میں کھٹکتے اور کانوں کو گراں گزرتے ہیں۔''(۱۶)

مولانا حالی نے مقدمہ کے حصہ غزل میں جو اخلاقی مضامین لکھے ہیں وہ ان کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہیں۔وہ شاعری میں بے سروپا باتوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔قصیدے کے ضمن میں مقدمے شعر و شاعری میں جو کچھ انھوں نے لکھا وہ بھی واضح ہے۔اگر چہ مولانا کی شاعری میں مبالغہ بھی ہو سکتا ہے لیکن ان کے نظریات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حقیقت بیانی کے قائل تھے۔

حالی نے اپنے شعری نظریات و افکار کے ذریعے ادب کو کئی نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔شاعری کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ شاعری سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔وہ شاعر کی خوبیوں سے بھی آگاہ تھے جس کا ذکر وہ مقدمہ میں کرتے ہیں۔اس سلسلے میں پروفیسر ممتاز حسین رقمطراز ہیں:

''جو شے حالی کی نظر میں شاعر کو غیر شاعر سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی قوت متخیلہ ہے نہ کہ موزونی طبع ایسی صورت میں ان کا شمار منطیقوں میں کرنا چاہیے۔جو یہ کہتے ہیں کہ شعر کے لیے صرف تخیل ضروری ہے اس میں شبہ نہیں کہ ایک جگہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وزن کی شرط (verse) نظم کے لیے ہے نا کہ

پوئیٹری یا شاعری کے لیے۔''(۱۷)

لاہور میں حالی نے آزاد کے ساتھ مل کر نئی طرز کی شاعری کو فروغ دیا یہاں سے ان کی نیچرل شاعری کا آغاز ہوتا ہے جو مبالغہ آرائی اور تصنع سے پاک نظر آتی ہے ان کے اس عہد کی مشہور نظموں میں برکھارت، حب وطن، رحم و انصاف اور امید اہم ہیں۔ ان نظموں کی زبان آسان، سلیس اور رواں ہے انھوں نے طرز قدیم چھوڑ کر نئی راہیں تلاش کیں ان کے خیال کے مطابق شاعری سے بڑے بڑے کلام لیے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے اس زمانے میں نیچرل شاعری کی طرف توجہ دی۔ نیچرل شاعری اگر چہ انگریزی ادب سے اردو میں رائج ہوئی لیکن اس کا آغاز حالی ہی سے ہوتا ہے۔

حالی اس بات کے قائل تھے کہ ادیب اور شعرا قوموں کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں وہ زندگی میں قنوطی پہلو کی طرف کم دیکھتے ہیں بلکہ وہ رجائی نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ بقول رفیق خاور:

> وہ ایک بحرانی دور میں پیدا ہوئے جس میں جمود کا شعار ہونے یا آگے بڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔''(۱۸)

مولانا حالی کے نظریہ شعر میں ایک طرف وہ نظریہ ہے جو قدیم شعرا کے حوالے سے وہ حاصل کرتے ہیں دوسرا وہ جو انھوں نے مغربی لٹریچر اور جدید شاعری کے حوالے سے حاصل کیا۔ یہ زمانہ قیام لاہور کا تھا جب وہ پنجاب بک ڈپو میں ملازم تھے۔ یہیں سے انھیں انگریزی ادب سے واقفیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے شعری نظریات کی بنیاد انھی دو نظریات کے امتزاج سے قائم کی۔ اس سلسلے میں ان کا یہ خط نہایت اہمیت کا حامل ہے جو مولوی محبوب عالم ایڈیٹر ''پیسہ اخبار'' کے نام ہے، لکھتے ہیں:

> ''ہم نہ قدیم شاعری کے مخالف ہیں نہ جدید شاعری کے مزاحم۔ بلکہ ایک لحاظ سے جدید شاعری کے زیادہ موید ہیں لیکن ہماری رائے میں جدید شاعری کو ترقی دینے یا اس کی داد لینے کا مقام بجائے قومی جلسوں کے نئی طرز کے مشاعروں کو قرار دینا چاہیے، جن کا عمدہ نمونہ ایک دفعہ پہلے لاہور میں قائم ہو چکا ہے۔ نئی طرز

کے مشاعرے سے ہماری مراد یہ ہے کہ قدیم دستور کے موافق اس میں شعراء کو مصرع طرح نہ دیا جائے بلکہ کسی مضمون کا عنوان بتا کر نظم کہلوانی چاہیں اور اس بات کا اختیار کہ وہ کس بحر یا کس صنف میں ترتیب دی جائیں خود شعراء کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ نئی طرز کی شاعری میں سوا اس کے کہ لوگوں نے جا بجا مسلمانوں کے تنزل کا رونا رویا ہے اور مضامین کی طرف بہت ہی کم توجہ کی گئی ہے حالانکہ نیچرل مضامین کا ایک وسیع اور ناپید کنارا میدان موجود ہے جس میں ہمارے شعراء طبیعت کی جولانیاں اور فکر کی بلند پردازیاں دکھا سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے کہ قومی جلسوں میں شاعری کے جوہر دکھانے سے کوئی عمدہ نتیجہ شاعری یا قوم کے حق میں پیدا نہیں ہوسکتا۔''(۱۹)

حالی مقدمہ شاعر و شاعری میں نیچرل شاعری سے مراد وہ شاعری ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچرل ہو۔ یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو لفظاً نیچرل کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعراء کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے۔ نیچر یا سکنڈ نیچر کا حکم رکھتی ہے۔ پس شعر کا بیاں جس قدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور روزمرہ سے بعید ہوگا اس قدر ان نیچرل سمجھا جائیگا۔ معناً نیچرل کے معنی موافق ہونے سے مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہیں۔ پس جس شعر کا مضمون اس کے خلاف ہوگا وہ ان نیچرل سمجھا جائے گا۔ مثلاً

کوئی رکھ کے زیر زنخداں چھڑی
رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی
رہی کوئی انگلی کو دانتوں میں داب
کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب (۲۰)

مولانا حالی نظریاتی طور پر حقیقت پسندی کے قریب نظر آتے ہیں۔شاعری میں جہاں اخلاقی پہلوؤں کو مدِنظر رکھتے ہیں وہاں ادب اور زندگی کے تعلق کو بھی بہت اہمیت دیتے ہیں۔وہ بے جا مبالغہ سے اجتناب کے قائل ہیں وہ ادب میں پائیدار نظریہ تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی: ''جو نظریہ حقیقت کے جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ زندہ اور پائیدار ہوتا ہے۔''(۲۱)

حالی نے برصغیر میں زوال اور انقلاب کا مشاہدہ کیا اور شعروادب کو انسانیت کی اصلاح کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔انھوں نے بدلتے ہوئے سماجی حالات اور ملت کے زوال کو بڑی شدت سے محسوس کیا کیونکہ وہ سنجیدہ اور شریف النفس انسان ہونے کے باوجود شاعرانہ مزاج رکھتے تھے۔اقبال سے پہلے اگر کسی شاعر نے ملت کی اصلاح کی طرف توجہ دی تو وہ حالی ہیں کیونکہ غدر کے بعد مسلمانوں کی حالت مخدوش تھی دن بدن ان کے حالات بگڑتے جارہے تھے۔یہ وہ قوم تھی جس نے ایک زمانہ برصغیر میں بلاشرکت غیرے حکومت کی تھی آج روبہ زوال تھی۔حالی اس قوم کے درد کو محسوس کرتے ہیں اور اپنی نظم ونثر میں اصلاحی پہلو کی طرف توجہ دیتے ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں:

> ''مولانا الطاف حسین حالؔی ایک ایسے دورِ خزاں کے عندلیبِ حزیں ہیں جس کے ایک طرف بہارِ گل کا جلوہ واپس دلوں کو گزرتے ہوئے سہانے زمانے کی یاد سے سرشار کررہا تھا اور دوسری طرف بادِ خزاں دیدہ کی طرح بکھر بکھر کر دلوں کو یاس و الم سے تڑپا رہے تھے۔حالؔی کی نواہائے جگر سوز میں اس دورِ خزاں کی روح عصر کارفرما ہے اسی دورِ خزاں میں وہ نہ صرف قومی زوال کے مرثیہ خواں کی حیثیت سے شہرت عام حاصل کرتے ہیں بلکہ ملی نشاۃِ ثانیہ کے نقیب بن کر قوم کے دل میں احساس زیاں بیدار کرنے اور تحریک احیاء کی کامیابی کے لیے ایک موثر ذریعہ بن جاتے ہیں۔''(۲۲)

حالی نے ایک تو شاعری میں خیالی اور فرضی مضامین سے روگردانی کی اور دوسرے حقیقت پسندی اور

واقعہ نگاری پر توجہ مرکوز کی۔ چنانچہ انھوں نے عشق و عاشقی کی شاعری کو ترک کر کے قومی بیداری کی تحریک میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور ادب کو زندگی کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی طرف توجہ دی ان کے خیال میں عشق و عاشقی رندی و مستی کے مضامین بے وقت کی راگنی ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن

راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا (۲۳)

چنانچہ حالی نے ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے قومی شاعری کی طرف توجہ دی۔ وہ شعر و شاعری کو زندگی کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی طرف لگے رہے اور ادب اور زندگی کو جدا کرنے کے قائل نہیں بلکہ اس کو دو رخی تصویر سمجھتے تھے۔

حالی شاعری اور شعر کو موضوع بناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاعری کے لیے چار چیزیں اہم ہیں:

''شاعری کی بنیاد چار چیزوں پر ہے ایک یہ کہ شاعر کے خیالات کم و بیش کسی حقیقت واقعہ پر نہ کہ اختراع ذہن پر مبنی ہونے چاہیں ورنہ شعر میں کچھ تاثیر نہ ہو گی۔ دوسرے وہ ایسے خیالات ہوں جن میں عام خیالات کی نسبت ایک قسم کی ندرت اور نرالا پن اور تعجب پایا جائے، ورنہ معمولی بات چیت میں اور شعر میں کچھ فرق نہ ہو گا۔ تیسرے یہ کہ خیالات عمدہ لباس میں ظاہر کیے جائیں کیونکہ خیال کے ساتھ ہی عمدہ ہو اگر مناسب لفظوں میں ادا نہ کیا جائے تو دائرہ شاعری سے خارج ہو گا۔ چوتھے شاعر کے دل میں جب کہ وہ کسی مضمون پر شعر لکھ رہا ہے کم و بیش اس مضمون کا جوش اور ولولہ موجود ہونا چاہیے ورنہ شعر نہایت کمزور ہو گا۔'' (۲۴)

مولانا حالی شاعری کے لیے تین چیزوں کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ تخیل، تفحص الفاظ اور مطالعہ کائنات۔ مقدمہ

میں انھوں نے اس پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ان کے نزدیک شاعر کی قوت متخیلہ اسے بلندی عطا کرتی ہے اور مطالعہ کائنات سے اس کے کلام میں پختگی آتی ہے۔جبکہ الفاظ کا چناؤ اس کو حسن عطا کرتا ہے۔مقدمہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''وہ قوت جس نے شاعر کی معلوماتِ سابقہ کو دوبارہ ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشی ہے تخیل یا امیجینشن ہے اور اس نئی صورت میں موجودہ فی الذہن نے جب الفاظ کا لباس پہن کر عالم محسوسات میں قدم رکھا ہے اس کا نام شعر ہے۔''(۲۵)

حالی نے ۱۸۷۹ء میں اپنی مشہور زمانہ نظم ''مسدس حالی'' لکھی اس میں انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کو ان کے ماضی کی یاد دلائی بلکہ مستقبل کی طرف راہنمائی بھی کی۔وہ خلق کو نئی راہوں کی طرف گامزن کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔وہ اس نظم کے ذریعے ملت کی سیاسی اور سماجی راہنمائی کی کوشش کرتے ہیں۔حالی کو اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ وہ اس قوم کے فرد ہیں جس کی عظمت و رفعت کا ایک زمانہ معترف رہا ہے۔حالی کی شعری تخلیقات میں ان نظریات کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔''مسدس حالی'' کے دوسرے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''مصنف کو اگر فخر ہے تو صرف اس بات پر ہے کہ اس نے زمین شور پر تخم ریزی نہیں کی اور پتھر میں جونک لگانی نہیں چاہی۔اس نے ایک ایسی جماعت کو مخاطب گردانا ہے جو بے راہ ہے پر گمراہ نہیں۔وہ رستے سے بھٹکے ہوئے مگر رستے کی تلاش میں چپ و راست نگراں ہیں۔ان کے نیر مفقود ہو گئے ہیں مگر قابلیت موجود ہے۔ان کی صورت بدل گئی ہے مگر ہیولیٰ باقی ہے۔ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں مگر زائل نہیں ہوئے۔ان کے جوہر مٹ گئے ہیں مگر جلد سے پھر نمودار ہو سکتے

ہیں ان کے عیبوں میں خوبیاں بھی ہیں مگر چھپی ہوئی ان کی خاکستر میں چنگاریاں بھی ہیں مگر دبی ہوئی ۔"(۲۶)

جنگ آزادی کے بعد مسلمان پستی اور انحطاط کا شکار ہو چکے تھے ۔حالی نے اس زمانے کی صورت حال کے مطابق اپنی اصلاحی شاعری کے عملی پہلو کو بڑی اہمیت دی وہ بے وقت کی راگنی کو چھوڑ کر تعمیری اور با مقصد ادب کی طرف توجہ دیتے ہیں ۔اس سلسلے میں حالی اور سرسید میں مماثلت نظر آتی ہے لیکن حالی اس کی عملی صورت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ۔سرسید سے ملاقات کے بعد حالی کی زندگی میں اور تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن کا ذکر ڈاکٹر سید عبداللہ اس طرح کرتے ہیں:

"سرسید سے حالی کی ملاقات سب سے پہلے نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کے ہم راہ ہوئی اس کے بعد وہ عمر بھر سید صاحب کے مداح رہے ۔مسدس حالی کے دیباچے میں انھوں نے سید صاحب کے اثرات کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے ۔اس کے علاوہ انھوں نے دوسری علمی خدمات بھی سید صاحب کی ترغیب وتشویش اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے انجام دیں غرض اس میں کچھ شک نہیں کہ حالی کی حقیقت نگاری، متانت ،افادیت پسندی اور اسلوب بیان میں مدعا نگاری اور مطلب نویسی بہت حد تک سرسید کی رفاقت اور محبت کے زیر اثر ہے ۔"(۲۷)

سرسید کے ساتھ ملاقات کے بعد دونوں میں مستقل تعلقات اور روابط کا آغاز ہوتا ہے جو سرسید کی وفات تک قائم رہا۔سرسید اور حالی کے درمیان جو تعلق اور مراسم تھے وہ ان کے تصانیف اور خطوط سے عیاں ہوتے ہیں ۔سرسید سے تعلقات کے بعد ان میں نمایاں فرق ظاہر ہوتا ہے اور ان کی قومی شاعری کا آغاز بھی یہیں سے ہوتا ہے ۔

حالی کے دل میں قومی درد بدرجہ اتم موجود تھا ان کی مقبولیت کا ایک اہم سبب ان کی قومی شاعری بھی سمجھا

جاتا ہے۔ یہ اصلاحی خیالات ان کے دل میں قیام لاہور کے دوران ہی پیدا ہو چکے تھے لیکن سرسید سے ملاقات اور اینگلو عربک سکول دہلی میں ملازمت کے دوران ان میں شدت آ گئی تھی کیونکہ وہ بدلتے ہوئے ماحول اور منظر نامے کو دیکھ رہے تھے چنانچہ انھوں نے مختلف قومی اور زندگی کے دیگر مسائل پر کئی ایک نظمیں لکھیں جن میں معاشرتی، معاشی اور علمی موضوعات کے پیش نظر رکھا گیا ہے اور ان کو بڑے سنجیدہ اور سوز و گزار کے انداز میں پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے عورتوں کے مسائل کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بقول:

> ''مسدس حالی، مناجات بیوہ اور چپ کی داد سے قبل اور ان کے بعد متعدد نظمیں لکھی ہیں ان نظموں کے موضوعات متنوع ہیں لیکن وہ سب ایک مخصوص زاویہ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ اس دور کے مذہبی، علمی، تعلیمی، معاشی، معاشرتی، سیاسی، تاریخی جتنے بھی مسائل تھے ان سب کو حالی نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان میں بعض مختلف جلسوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کہیں کہیں واعظانہ رنگ بھی پیدا ہو جاتا ہے اور وہ شعری اعتبار سے سپاٹ بھی ہو جاتی ہیں لیکن حالی کا خلوص ان میں زندگی کی لہریں دوڑاتا ہے اور اس طرح انھیں ایک نظم کی حیثیت سے ایک زندگی ملتی ہے۔''(۲۸)

حالؔی کے خیال میں شاعری میں عصری میلانات کی عکاسی ہونی چاہیے اور معاشرتی اور سماجی قدروں کو زمانے کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ وہ اپنے خطوں میں اردو شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شاعری کے میدان کو وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہو سکے۔ مثلاً مولوی حبیب الرحمٰن خان شروانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''برسات کے مطالعہ سے برسات کا لطف دونا ہو گیا۔ بہت عمدہ مثنوی ہے۔ اس

میں کسی قسم کے تصرف کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔ اگر چہ شعرائے ایران و ہندوستان کے مسلمات کے خلاف کیا گیا ہے جیسے کرشمہ کا قافیہ جلوہ یا برسیں کا قافیہ بھر دیں یا بدلا کا قافیہ آیا وغیرہ وغیرہ مگر میرے نزدیک اب ان قیود کو اٹھا دینا ہی بہتر ہے۔جن کے سبب سے شاعری کا میدان نہایت تنگ ہوگیا ہے۔"(۲۹)

حالی کے منظومات ایک تحریک کی صورت میں نظر آتے ہیں۔انیسویں صدی کے آخر میں جن ارباب علم و دانش نے جدید نظم ونثر کے فروغ اور معاشرتی اصلاح میں اہم کردار ادا کیا ان میں مولانا حالی کو کس طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اس سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کی یہ رائے ملاحظہ ہو:

"حالی سے قبل تو خیر اس چیز کا ذکر ہی کیا حالی کے زمانے میں بھی کوئی دوسرا اس طرف توجہ نہ کر سکا۔ وہ اس اعتبار سے منفرد رہے۔ انھوں نے قومی اور اجتماعی مسائل پر نظمیں لکھنے کی ایک فضا پیدا کی۔حالی کے بعد بہت سے نظم گو شعرا پیدا کیے۔اقبال اور جوش کو بھی اسی فضا نے پیدا کیا جو حالی کے ہاتھوں وجود میں آئی۔"(۳۰)

۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے حالات کو دیکھتے ہوئے وہ چاہتے تھے کہ اگر چہ ہندو مسلم اتحاد کا پیدا ہونا مشکل ہے لیکن وہ تعلیمی اور سماجی ترقی کے لیے اسے ضروری سمجھتے تھے۔اس سلسلہ میں ان کے دو خطوں کا حوالہ دینا نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے ایک خط چیف جسٹس گوالیار اسٹیٹ صاحب زادہ سلطان محمد خان کے نام ہے جبکہ دوسرا خط مولانا عبدالحلیم شرر کے نام ہے۔ پہلے خط میں لکھتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

ا۔ "اگر چہ علی گڑھ پارٹی کے اصحاب سوائے ایم۔اے۔او کالج اور کسی انسٹی ٹیوشن کی مدد بطوع و رغبت نہیں کرتے لیکن اب زمانے کا اقتضا یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہر ایک تعلیم گاہ کی پوری پوری امداد کی جائے کیونکہ چھ کروڑ مسلمانوں کے لیے

ایک محمڈن کالج کسی طرح کافی نہیں ہوسکتا۔''(۳۱)

دوسرے خط میں عبدالحلیم شرر کو لکھتے ہیں:

۲۔ ''لیکن درحقیقت اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہوسکتا کہ ہندو مسلمانوں میں دوستی کے روابط مستحکم نہیں ہو سکتے۔ بے شک بدقسمتی سے ایسے چند ناشدنی اسباب پیدا ہو گئے ہیں جن سے بالفعل دونوں قوموں کی ایک محدود جماعت کے دل ایک دوسرے سے پھٹ گئے ہیں لیکن ہمارے پاس اس امر کے باور کرنے کی وجوہات موجود ہیں کہ جس قدر تعلیم کی ترقی ہوتی جائے گی جس قدر لوگ ضرورتوں سے واقف ہوتے جائیں گے اور جس قدر نااتفاقی کے مضر نتائج لوگوں پر آشکار ہوتے جائیں گے اس قدر ان پر یہ راز ظاہر ہوتا جائے گا کہ بغیر اتحاد و یکجہتی کے دونوں قوموں کا ملک میں عزت سے رہنا اور گورنمنٹ کی نظر میں وقعت اور توقیر پیدا کرنا غیر ممکن ہے۔''(۳۲)

مولانا حالی دراصل ایک معلم اخلاق تھے یہی چیزیں ان کے کلام میں نظر آتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں فنی کمالات بھی نمایاں ہیں اور یہ فنی کمالات کسی شاعر یا ادیب کی ادبی حیثیت کو متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ان کے شعری نظریات میں ایک اہم پہلو اخلاقیات ہے جو ان کی شعری اور نثری تخلیقات میں نظر آتا ہے۔

اس سلسلے میں پروفیسر حمید احمد خان لکھتے ہیں:

''دراصل حالی کا خاصہ اخلاق ان کی سعی ادبی تخلیقات کے پیچھے ایک محرک اعظم کی حیثیت سے موجود ہے اور ان کی نظم و نثر کا بہت بڑا حصہ ان کے اسی انہماک کی توثیق کے لیے پیش کیا جا سکتا ہے۔حالی بنیادی طور پر معلم اخلاق تھے پاکیزہ انسانی زندگی کا ایک خاص تصور کلام حالی کے مطالعہ سے ابھر کر سامنے آتا ہے۔''(۳۳)

حالی کے اشعار فنی خوبیوں سے مزین ہونے کے ساتھ ساتھ اثر کی فراوانی رکھتے ہیں اس کے ساتھ ان کا عوامی انداز اور طرز تخاطب اپنے اندر ایک چاشنی اور جاذبیت رکھتا ہے۔ان کی سیدھی سادھی گفتگو کی زبان اور بول دراصل یہ ثابت کرتا ہے شعر کی زبان دراصل زندگی کی ہی زبان ہے اس سے مختلف نہیں۔حالی چونکہ عوام سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کے نظریات میں عوامی موضوعات کی جھلک نظر آتی ہے اور تاثیر بھی رکھتے ہیں۔حالی نقاد اور ادیب ہونے کے ساتھ بڑے شعرا کے زمرے میں آتے ہیں۔مولانا حالی شاعری کے ذریعے معاشرتی ترقی کے خواہاں تھے وہ ملکہ شعر کی بیکار نہیں سمجھتے۔بقول شین قاف نظام:

> ''حالی بنیادی طور پر شاعری کو فن کی بجائے سوسائٹی کی ترقی کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے لیکن وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ شاعری کی فنی سطح بھی کمزور نہ ہو۔حالی اور ترقی پسند ناقدین میں یہی فرق ہے۔حالی جہاں مقصدی ادب کو بھی فنی سطح پر ارفع واعلیٰ دیکھنے کے متمنی ہیں وہاں ترقی پسند مقصدیت کی دھن میں فنی تقاضوں کو یکسر نظر انداز کرنے کی حمایت کر بیٹھتے ہیں۔''(۳۴)

چنانچہ یہ کام حالی نے ''مسدس حالی'' کے ذریعے کرنے کی کوشش کی اور یہی وجہ ہے کہ مسدس میں جہاں بیداری ملت کی تحریک کارفرما ہے وہاں حالؔی نے اپنے فن کے جوہر دکھائے جس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔جن میں عرب کے قبائل کے حالات کا ذکر ہے جو تمدن عرب کے اس معاشرہ کی عکاسی کرتے ہیں:

نہ ٹلتے تھے ہرگز جب اڑ بیٹھتے تھے
سلجھتے نہ تھے جو جھگڑ بیٹھتے تھے
جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے
تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے
بلند ایک ہوتا تھا گرواں شرارا
تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر
تو خوف شماتت سے بے رحم مادر
پھر دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور
کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی
یکایک ہوئی غیرت حق کو حرکت
بڑھا جانب بو قبیس ابر رحمت
ادا خاک بطحانے کی وہ ودیعت
چلے آتے تھے جن کی دینے شہادت
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدہ
دعائے خلیل اور نوید مسیحا
وہؐ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولاؐ
خطا کار سے درگزر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا

مفاسد کو زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا (۳۵)

حالی کی مسدس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

''اس کا دوسرا نام ''مدوجزرِ اسلام'' ہے ایسی پر خوش عبرت انگیز، سبق آموز، دلوں کو ابھارنے اور عقیدت دلانے والی نظم ہماری کسی زبان میں نہیں یہ نظم ہماری قومی زندگی کا کامل مرقع ہے اس میں ہمارے خدوخال صاف نظر آتے ہیں۔ پھر حسنِ بیان نے اسے معراجِ کمال تک پہنچا دیا ہے اس میں ایسے تیز نشتر ہیں جو جگر کے پار ہو جاتے ہیں۔''(۳۶)

چنانچہ اردو نظم میں حالی کی بدولت نئی نئی راہیں کھلتیں ہیں انھوں نے مقررہ راستوں سے ہٹ کر اردو میں تنقید نگاری اور واقع نگاری کی بنیاد رکھی۔ وہ اردو کے پہلے نقاد کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ حالی کی بدولت اردو زبان کو وسعت ملی اور یہ زبان اہل علم اور عوامی زندگی کی ترجمان نظر آنے لگی۔ مولانا حالی نے نیچرل شاعری کے ذریعے اردو ادب کو نئی پہچان دی۔ بقول شجاعت علی سندیلوی: ''حالی نیچرل شاعری کے بانی ہوئے زمانہ حال کا کوئی ایسا شاعر نہیں جو مسدس مدوجزر اسلام اور ان کی دوسری نظموں سے متاثر نہ ہوا ہو۔''(۳۷)

مولانا حالی نے روایتی اور غیر آفادی شاعری کی مخالفت کی اور اردو میں نظمیہ شاعری کی افادیت عظمت اور مقصدیت پر زور دیا۔ وہ اس سلسلے میں چپ کی داد اور مسدس جیسی عوامی نظمیں لکھ کر اردو شاعری کی تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ معیاری اور مقصدیت سے مزین شاعری پر زور دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے شعری نظریات انھیں اصولوں پر مبنی نظر آتے ہیں۔ حالی دراصل اخلاقیات کے علمبردار تھے۔ وہ فحش اور اخلاقیات سے گری ہوئی شاعری کو حدف تنقید بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمین جس سے ہے زلزلے میں برابر
ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم و دین جس سے تاراج سارا
وہ ہے ہف نظر علم انشا ہمارا
برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے
عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے
مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگا رواں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے
عرب جو تھے دنیا میں اس فن کے بانی
نہ تھا کوئی آفاق میں جن کا ثانی
زمانے نے جس کی فصاحت تھی مانی
مٹا دی عزیزوں نے ان کی نشانی
سب ان کے ہزار و کمالات کھو کر
رہے شاعری کو بھی آخر ڈبو کر (۳۸)

حالی شاعری کو میجک لینٹرن سے تشبیہ دیتے ہیں جو تاریکی میں روشنی کے لیے استعمال کی جاتی چاہے۔ ان کے نزدیک بہترین شاعری دور جہالت یا اس دور میں تخلیق ہوئی جب تہذیبی ترقی بہت کم تھی۔ حالی نے مسدس لکھ کر نہ صرف مسلم معاشرے کے تعلیمی اور اصلاحی انحطاط پر نظر ڈالی بلکہ اس مسدس نے جدید شاعری کا سنگ بنیاد بھی رکھ دیا۔ بقول عبدالرزاق کانپوری:

''اس مسدس نے جدید شاعری کا سنگِ بنیاد رکھا، جاہل شعرا نے مسدس کی رد میں متعدد مسدس لکھے مگر کسی کو کامیابی نہ ہوئی کیونکہ نیک نیتی اور بدنیتی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس مسدس سے خواجہ کی تاریخ دانی کا بھی اندازہ کیا جاتا ہے۔ بعض بند ایسے ہیں کہ جب تک تاریخ اسلام کے پانچ ہزار اوراق نہ پڑھے جائیں ہرگز نہیں لکھے جا سکتے۔'' (۳۹)

حالی کے نظریہ شعر کی قدر و قیمت ان کی تخلیقات کی روشنی میں متعین ہوتی ہے اور یہ نظریہ ان کی ادبی اور علمی وسعت کا تعین بھی کرتا ہے۔ حالی نے تعیش پسند ادب لذت پرست شاعری کے متبادل ایسی شاعری کی بنیاد رکھی جو انسان سازی کرتی ہے اور یہی تقاضا اس زمانے کے حالات کرتے تھے۔ وہ حقیقت نگاری کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں کیونکہ وہ ایک سنجیدہ اور اخلاقی خوبیاں رکھنے والے شاعر تھے اور یہ ساری چیزیں ان کی نظموں اور خاص کر مسدس میں نظر آتی ہیں۔ جس کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر حمید احمد خاں لکھتے ہیں:

''شاعرانہ عظمت کا اندازہ اگر کسی ایک نظم سے کیا جا سکتا ہے تو وہ نظم بلد مسدسِ مدو جزر اسلام ہے اس نظم کی مجموعی دردمندی اور صداقت اس کے موضوعات کا محیط، اس کی رنگ بھرنگ سیرت نگاری و تصویر کاری اور اس رقت انگیز اندازِ حکمت و عظمت اسے دنیا کی بڑی نظموں میں جگہ دیتا ہے۔'' (۴۰)

حالی کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو بے جا تشبیہات و استعارات اور عربی فارسی کے مشکل الفاظ و محاورات سے نجات دلائی اور سلیس اور سادہ شعری زبان کو استعمال کر کے نہ صرف اسے عام فہم بنایا

بلکہ اس میں دلکشی اور دلچسپی پیدا کی ۔ان کی ایک اور نظم حب وطن کے چند اشعار دیکھیے ۔لکھتے ہیں:

اے وطن اے میرے بہشت بریں
کیا ہوے وہ تیرے آسمان و زمین
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمیں اور وہ آسمان نہ رہا
تیری دوری ہے مورد الزام
تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام
کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے
گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے
مٹ گیا نقش کامرانی کا
تجھ سے تھا لطف زندگی کا
جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا
ان کو کیا ہو گا زندگی کا مزا
ہو گیا یاں تو دو دن میں یہ حال
تجھ بن ایک ایک پل ہے ایک ایک سال (۴۱)

حالی دنیائے علم کی ایک مشہور اور نامور شخصیت جن سے مستفید ہوئے وہ شیخ سعدی شیرازی ہیں ۔شیخ سعدی اور مولانا حالی میں فکری طبعی اور فطری مماثلت نظر آتی ہے شیخ سعدی کا نظریہ فن جو اخلاقی اور اصلاحی پہلو رکھتا ہے حالی کا بھی یہی نظریہ ہے ۔حالی اور سعدی میں مماثلت کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالقیوم لکھتے ہیں:

"اگر چہ حالی کے یہاں اخلاق اور افادیت کا تصور محدود تھا مگر بلاشبہ اس میں زندگی اور صحت مندی کے آثار ضرور تھے ۔اس اخلاقی نقطہ نظر سے حالی نے سعدی

کا انتخاب کیا۔سعدی کی ہر دل عزیزی اور ان کے اخلاقی، دینی و دنیوی خیالات
پیش کرنا قومی خدمت کے مترادف تھا۔دراصل حالی نے سعدی کے کلام میں اپنی
روح کی آواز سنی۔"(۴۲)

سعدی کو زمانے کا بہت بڑا مصلح اور اخلاقیات کا علمبردار سمجھتے تھے۔حالی سرسید کے مکتب سے تعلق رکھتے تھے اور سرسید کے ہاں ادب میں جو جدید تصورات اور خیالات تھے ان سے بھی متاثر تھے اور ان کے افکار و خیالات کے قدردان تھے۔حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں:

"یہ خاصیت جس کو ہم نے بیان کیا ہے ایک سچے ریفارمر کے کلام میں ایسی ہی
ضروری ہے جیسی سچائی اور راست بازی۔وہ مثل شاعروں اور انشا پردازی کے
اپنے کلام کی بنیاد الفاظ کی شستگی اور ترکیبوں کی برجستگی پر نہیں رکھتا بلکہ ایک بے
قرار آدمی کی طرح جو آگ لگی ہوئی دیکھ کر ہمسایوں کو بے تابانہ آگ بجھانے کے
لیے پکارتا ہے ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو گھبراہٹ کی حالت میں بے ساختہ
انسان کے منہ سے نکل جاتے ہیں۔وہ واقعات پر تشبیہ اور استعارے کے پردے
نہیں ڈالتا بلکہ ان کی تصویر کھلم کھلا سب پر ظاہر کرتا ہے۔"(۴۳)

لیکن اس میں شک نہیں کہ انھوں نے سرسید کی ادبی تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود اردو ادب میں اپنی ایک الگ پہچان بنا لی تھی اور یہی چیزیں ان کے شعری نظریات و افکار میں کارفرما نظر آتی ہیں۔ایک وہ مسلمانوں کے ہاں تعلیم کو بہت اہم سمجھتے ہیں دوسرے معاشرتی خرابیوں کی اصلاح پر ان کی نظر تھی۔وہ چاہتے تھے کہ لوگ معاشرے کی بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کریں۔حالی کے ہاں طنز کا پہلو بھی نظر آتا ہے لیکن ان کی طنز میں بھی تعمیر کا عنصر نمایاں ہے۔حالی کی طنز کے متعلق پروفیسر حمید احمد خان لکھتے ہیں:

"حالی کے فنی کمالات کا ایک اور پہلو ان کی طنز نگاری ہے دنیا کے بہت سے نامور

معلمین اخلاق نے طنز کو وسیلہ اظہار بنایا اور حالی نے بھی اس مفید صنف کلام کو نظر انداز نہیں کیا۔"(۴۴)

وہ اپنے کلام میں مولویوں، واعظوں اور فضول رسوم اور عیش وعشرت میں مگن لوگوں پر تنقید کرتے ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم
سمجھو کہ وہاں ہے کوئی برکت کا قدم
یا تو کوئی بیگم ہے مشیر دولت
یا ہے کوئی مولوی وزیر اعظم (۴۵)

اسباب پہ گر نظم جہاں کا ہے مدار
اس قوم کا جینا ہے حالی دشوار
عزت کی نہیں ہے جس کو ہرگز پرواہ
ذلت سے نہیں ہے جس کو ہرگز کچھ عار (۴۶)

عشق کے متعلق لکھتے دیکھیے:

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا
یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے یہ اتنی ہے خبر
اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا (۴۷)

غرور کے متعلق رباعی دیکھیے:

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور
پر عیب سے بچیے تا مقدور ضرور
عیب اپنے گھٹاؤ پر خبردار رہو
گھٹنے سے کہیں ان کے نہ بڑھ جائے غرور (۴۸)

حالی اپنی شاعری میں اصلاح کی طرف متوجہ رہے وہ اصلاح کو اخلاقی انداز میں پیش کرنے کے قائل نظر آتے ہیں۔ وہ قدامت پسندی ار جدت کے درمیان چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ مفلوک الحال قوم کو اصلاح کے ذریعے بلندی کی طرف لاتے ہیں۔

حالی کی شاعری میں حقیقت پسندانہ، سلیس اور فطری نظریات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ وہ سماجی اور معاشرتی زندگی میں شاعری کے کردار کو اہم خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر زمانے میں شاعر کا کردار رہا ہے اس کا ذکر انھوں نے مقدمہ شعر و شاعری میں کئی ایک موقعوں پر کیا ہے۔ وہ سچے اور حقیقی شاعر و ادیب کے قدر دان نظر آتے ہیں۔ وہ رعایا کاری سے دور رہتے ہیں یہی ان کا امتیاز ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' میں لکھتے ہیں:

''نظام خیال اور فن میں دائمی عظمت اور دائمی شہرت کا راز یہ ہے کہ یہاں ریا کاری داخل ہونے نہ پائے اسی بات میں انسانی ہستی کے رفیع الشان حصے کی نا قابلِ تسخیر عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔''(۴۹)

حالی ابتدائی زمانے میں انگریزی تعلیم اور ادب سے دور رہے لیکن لاہور میں پنجاب بک ڈپو کی ملازمت کے دوران جہاں وہ انگریزی سے اردو تراجم کی اصلاح کا کام کرتے تھے۔ انگریزی ادب سے واقفیت پیدا ہوئی۔ علاوہ ازیں سرسید تحریک سے وابستگی کی وجہ سے بھی وہ انگریزی کے موید ہو گئے چنانچہ ان کے نظریات میں انگریزی ادب سے استفادہ کا عمل دخل بھی نظر آتا ہے۔ اپنے ایک خط میں مولوی حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھتے ہیں:

''میں خیال کرتا ہوں کہ اگر آپ انگلش لٹریچر سے واقف نہ ہوتے تو ایسی تصنیف کا
خیال ہرگز آپ کے دل میں نہ گزرتا پس تاوقت کہ ندوۃ العلماء انگریزی تعلیم کی
ضرورت پر زور نہ دے گی اس کی چیخ و پکار سے کوئی معتد بہ نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا۔
اس کے ساتھ میرا بھی یہ خیال ہے کہ صرف انگریزی تعلیم جب تک کہ اس میں
مشرقی تعلیم کی چاشنی نہ دی جائے گی ہرگز مفید آدمی پیدا نہیں کر سکتی۔''(۵۰)

حالی نے مغربی اور اردو ادب کو قریب لانے کی جو کوشش کی اس کے متعلق شجاعت علی سندیلوی لکھتے ہیں:

مغربی ادب سے حالی نے بہت کچھ لانے کی کوشش کی اور پرانے لوگوں نے یہ
رائے قائم کی کہ وہ اردو شاعری کو انگریزی شاعری کے اصولوں سے جانچنا چاہتے
تھے یہ ایک حد تک صحیح ہے۔(۵۱)

مقدمہ شعر و شاعری سے وہ جا بجا انگریزی ادب کی مثالیں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شعر کی زمانہ جہالت میں زیادہ ہوتی ہے۔ وہ قدیم اور جدید ادب کو ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور دونوں کے ملانے سے ایک نئے نظریہ ادب کی بنیاد رکھتے ہیں اور دونوں کے ملانے سے ایک نئے نظریہ ادب کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں مہیا عبدالرحمٰن کی رائے ملاحظہ ہو جو اپنے مقالے روسی اور 'وسط ایشیائی دانش گاہوں میں شناسی' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''الطاف حسین حالی اردو کے قدیم اور جدید ادب کے درمیان کی سب سے مضبوط
کڑی ہیں۔ اس لیے سوویت دور میں اردو ادب کے بارے میں جو تنقیدی اور
تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں۔ ان میں حالؔی کا ذکر کئی حیثیتوں سے آیا ہے خصوصاً
مرزا غالب، سر سید احمد خاں اور محمد اقبال کے مطالعے میں کئی عالموں نے حالی کی
تحریروں کا حوالہ دیا ہے''(۵۲)

حالی کے افکار و خیالات سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ مقصدی اور تعمیری ادب کے قائل ہونے کے

ساتھ ساتھ نیچرل عام فہم شاعرانہ خیالات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔اگر چہ ان کی ابتدائی زمانے کی شاعری روایتی مضامین پر مبنی ہے لیکن وہ جلد ہی حقیقت پسندانہ نظریات کی طرف لوٹ آتے ہیں۔علاوہ ازیں وہ شاعری کو زندگی اوراس کے مسائل کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے ادبی اور فنی معیار پر بھی زور دیتے ہیں۔وہ شعر کی خوبیاں کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں اورانھوں نے مقدمہ شاعری میں جابجا اس کو موضوع بنایا ہے۔حالؔی کی زندگی میں یہ خواہش کہ وہ اپنا کلام نظم ونثر اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شائع کروائیں لیکن مختلف عوارض اور بیماریوں کے سبب وہ زندگی میں ان کو شائع نہ کر سکے۔اپنے ایک خط میں مولانا ظفر علی خاں کو لکھتے ہیں:

”افسوس ہے کہ میری صحت نے بالکل جواب دے دیا ہے۔نت نئی شکایتیں پیدا ہوتی ہیں۔نہ دوستوں کے خطوں کا جواب لکھا جاتا ہے نہ ان کی عنایتوں کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔نہ ان تازہ مضامین وتصنیفات پر مسرت کا اظہار کیا جا سکتا ہے جو قوم کے لیے باعثِ فخر ہوں۔سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر چند اپنا کلام نظم ونثر اردو اور فارسی شائع کرنا چاہتا ہوں مگر نہیں ہوسکتا۔حالانکہ کسی سے یہ امید نہیں کہ میرے بعد کوئی اس کو بوجہ دلخواہ نہ سہی سرسری طور پر ہی مرتب کر دے۔اردو زبان کی تذکیروتانیث پر میں اپنے خیالات شوق سے ظاہر کرنا چاہتا تھا مگر طبیعت کی کاسازی اور مکروہاتِ دنیوی نے اس ارادہ کو اب تک پورا نہیں ہونے دیا۔“(۵۳)

مولانا حالی کی وفات ۱۹۱۴ء کے بعد ان کی یہ کتب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی اور ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے انجمن ترقی ادب لاہور سے شائع کیں جو اردو ادب کے محققین اور قارئین کے لیے نہایت اہم علمی اور تحقیقی ماٰخذ ہیں اور اردو ادب کے لیے اہم حوالہ بن گئی ہیں۔کلیات نثر حالؔی نومبر ۱۹۶۸ء میں طبع ہوئی جبکہ کلیات نظم حالؔی جولائی ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی۔ان کتب میں حالؔی کی نثر اور شاعری کو یکجا کر دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شجاعت علی سندیلوی، ڈاکٹر، حالی بحیثیت شاعر، سرفراز قومی پریس لکھنؤ، ۱۹۶۰ء، ص ۹۵

۲۔ خلیق انجم، ڈاکٹر، حالی کے سوانح، مشمولہ الطاف حسین حالی (تحقیقی وتنقیدی جائزے)، مرتب پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۶۹

۳۔ صادق قریشی، ذکر حالی، اردو مرکز گپت روڈ لاہور، اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۲۶۔۲۷

۴۔ حالی، الطاف حسین، کلیات نظم حالی، جلد دوم، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۴۱۴

۵۔ غالب، اسداللہ خان، کلیات غالب (فارسی)، مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۲۱۴

۶۔ حالی، الطاف حسین، کلیات نثر حالی، جلد دوم، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۳۳۸

۷۔ حالی، الطاف حسین، یادگارِ غالب، علمی کتب خانہ ناظم آباد کراچی، ص ۲۳۷

۸۔ عبدالمغنی، غالب کا فن، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۶

۹۔ ایضاً

۱۰۔ حالی، الطاف حسین، مکتوب بنام وحشت کلکتوی، محررہ ۲۹ مئی ۱۹۱۰ء، عکس تحریر، مشمولہ نقوش مکاتیب نمبر، جلد اول، ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۱۳۶

۱۱۔ حالی، الطاف حسین، دیوان حالی، عشرت پبلشنگ ہاؤس ہسپتال روڈ لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۶۷

۱۲۔ محمد اقبال، کلیات اقبال اردو، اقبال اکادمی لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۶۱۵

۱۳۔ حمید احمد خان، پروفیسر، ارمغانِ حالی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۳۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۴

۱۵۔ حالی، الطاف حسین، مکتوبات حالی، حصہ دوم، مرتب خواجہ سجاد حسین، حالی پریس پانی پت، ۱۹۲۵ء، ص ۱۴۱

۱۶۔ صالحہ عابد حسین، یادگارِ حالی، ارسلان بکس، علامہ اقبال روڈ میر پور آزاد کشمیر، ص ۲۴۰

۱۷۔ ممتاز حسین، پروفیسر، حالی کے شعری نظریات (ایک تنقیدی مطالعہ)، سعد پبلشرز ناظم آباد کراچی، ۱۹۵۰ء، ص ۴

۱۸۔ رفیق خاور، ہماری باتیں مشمولہ ماہِ نو کراچی، مارچ ۱۹۵۳ء، ص ۲

۱۹۔ حالی، الطاف حسین، مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، اردو مرکز گنپت روڈ لاہور، ۱۹۵۰ء، ص ۵۰

۲۰۔ میر غلام حسن دہلوی، سحر البیان، مرتب رشید حسن خاں، انجمن ترقی اردو ہند (نئی دہلی)، ۲۰۰۰ء، ص ۱۸۴

۲۱۔ شجاعت علی سندیلوی، ڈاکٹر، حالی بحیثیت شاعر، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۶۰ء، ص ۱۴۹

۲۲۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، ملی نشاۃ ثانیہ کا نقیب حالی مشمولہ صحیفہ حالی نمبر، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۵۷

۲۳۔ حالی، الطاف حسین، دیوانِ حالی، عشرت پبلشنگ ہاؤس ہسپتال روڈ لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۶۷

۲۴۔ حالی، الطاف حسین، مقدمہ شعر و شاعری، مرتب ڈاکٹر وحید قریشی، مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۵۳ء، ص ۳۸۳

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۲۶۔ حالی الطاف حسین، مسدس حالی، تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور کراچی، سن ندارد، ص ۹

۲۷۔ سرسید اور ان کے نامور رفقا سید عبداللہ، علی گڑھ، ۱۹۹۴ء

۲۸۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جدید شاعری اردو دنیا کراچی، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۵۷

۲۹۔ مکتوبات حالی، حصہ اول، مرتب خواجہ سجاد حسین، حالی پریس، پانی پت، ۱۹۲۵ء، ص ۱۶

۳۰۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جدید شاعری اردو دنیا کراچی، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۱۸۲

۳۱۔ حالی، الطاف حسین، مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، اردو مرکز گنپت روڈ لاہور، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۰ء، ص ۹۹

۳۲۔ ایضاً، ص ۵۴

۳۳۔ حمید احمد خان، پروفیسر، ارمغانِ حالی، ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور، ص ۲۶

۳۴۔ شین قاف نظام، مقدمہ شعر و شاعری اور شعری زبان، مشمولہ الطاف حسین حالی (تحقیقی و تنقیدی جائزے)، مرتب پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۳۷۱

۳۵۔ حالی، الطاف حسین، مسدس حالی، صدی ایڈیشن، بزم اقبال لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۲۔۲۱۔۲۰

۳۶۔ نذیر احمد، پروفیسر، پیش لفظ، الطاف حسین حالی (تحقیقی و تنقیدی جائزے)، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۲

۳۷۔ شجاعت علی سندیلوی، مطالعہ حالی، سرفراز قومی پریس نادان محل روڈ لکھنؤ، ص ۸۱

۳۸۔ حالی، الطاف حسین، مسدس حالی، (صدی ایڈیشن)، تدوین نو ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، بزم اقبال لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۷

۳۹۔ محمد عبدالرزاق کانپوری، یادِ ایام، عبدالحق اکیڈمی اشاعت منزل کوچہ عبدالحق، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۶ء، ص ۳۱۴،۱۵

۴۰۔ حمید احمد خان، پروفیسر، ارمغان حالی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور، ص ۴۴

۴۱۔ کلیات نظم حالی، جلد اول، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۹۴۔۳۹۳

۴۲۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، حالی کی اردو نثر نگاری، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۱۲۶

۴۳۔ حالی، الطاف حسین، حیاتِ جاوید، جلد دوم، ص ۴۸۹

۴۴۔ حمید احمد خان، پروفیسر، ارمغانِ حالی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور، ص ۳۷

۴۵۔ حالی، الطاف حسین، دیوان حالی، عشرت پبلشنگ ہاؤس، ہسپتال روڈ لاہور، ص ۱۵۷

۴۶۔ ایضاً، ص ۱۵۶

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۴۸

۴۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۷۵ء، ص ۲۱

۵۰۔ مکتوبات حالی، حصہ اول، مولف ومرتب خواجہ سجاد حسین، حالی پریس پانی پت، ۱۹۲۵ء، ص ۷، ۸

۵۱۔ شجاعت علی سندیلوی، مطالعہ حالی، ادارہ فروغ اردو امین آباد، لکھنؤ، ۱۹۵۶ء، ص ۱۱۴

۵۲۔ مہیا عبدالرحمٰن، وسطی ایشیائی دانش گاہوں میں حالی شناسی، مشمولہ الطاف حسین حالی (تحقیقی وتنقیدی جائزے)، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۴۷۱

۵۳۔ مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، اردو مرکز لاہور، ۱۹۵۰ء، ص ۶۳

باب پنجم

نثرِ حالؔی کا اسلوب اور حالؔی کی مکتوب نگاری

اردو میں سٹائل کا لفظ انگریزی زبان سے آیا ہے جس کے معنی ہیں انداز بیان، طرز نگارش یا اسلوب۔

اسلوب کسی بھی مصنف کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے کسی بھی ادیب کے اسلوب بیان میں اس کی شخصیت پوری طرح جھلکتی ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالقیوم:

> ''فرانس میں یہ بات مشہور ہے کہ اسلوب تحریر خود مصنف کی شخصیت ہوتی ہے اور اس کی سیرت و عادات کی نمایاں جھلک اس کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ بعض مصنفین سادگی و صفائی کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں اور بعض پیچیدہ انداز بیان اختیار کرتے ہیں اور اسی کو کامیابی کی ضمانت سمجھتے ہیں۔''(۱)

جس طرح انسانوں کی طبیعتیں مختلف ہیں اور وہ ایک دوسرے سے مختلف انداز فکر رکھتے ہیں اسی طرح وہ اپنی تحریروں میں بھی مختلف انداز اپناتے ہیں اور منفرد نظر آنا چاہتے ہیں اور یہ انفرادیت وہ اپنی نگارشات میں بھی برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اسلوب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اسلوب عام طرز تحریر نہیں بلکہ کسی ادیب یا انشا پرداز کا منفرد طرز تحریر ہے جو اسے اس کے زمانے کے دوسروں ادیبوں یا انشا پردازوں سے ممتاز یا منفرد کرتا ہے۔''(۲)

ہر اہل قلم یا ادیب کا انداز بیان ہی مختلف نہیں ہوتا بلکہ باطنی کیفیت بھی جدا جدا ہوتی ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ کسی ادیب کی تخلیقات پر نظر ڈالنے سے پہلے اس کی شخصیت کے متعلق بھی آگاہی حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس سے اس کی تخلیقات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''اسلوب کے دو بڑے عنصر ہوتے ہیں ایک داخلی عنصر اور دوسرا خارجی عنصر۔ یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کی تخلیق پر اس کی داخلی اور ذہنی زندگی کی مہر بھی لگی ہوتی ہے۔''(۳)

ڈاکٹر سید عبداللہ کی یہ رائے حقیقت پر مبنی نظر آتی ہے کیونکہ بعض نثر نگار اپنی نثر میں کچھ اس طرح کے لوازمات داخل کرتے ہیں جو ان کی پہچان بن جاتے ہیں۔ اردو میں محمد حسین آزاد ایک خاص طرز تحریر کے مالک ہیں جس کے موجد بھی وہ خود ہیں اور خاتم بھی وہ صحیح معنوں میں اردو کے صاحب طرز ادیب میں جن کے اسلوب کی حقیقی پیروی ممکن نہیں اور یہ ان کا مخصوص سٹائل ہے جن کے بارے میں رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں: ''مگر وہ چیز جس نے انھیں زندہ و جاوید کر دیا وہ ان کا خاص طرز تحریر ہے جو لاثانی ہے اور جس کی تقلید محال ہے۔''(۴)

لیکن سٹائل یا طرز تحریر کی کامیابی کا انحصار پڑھنے والوں پر بھی منحصر ہوتا ہے اور اس میں قارئین کی پسند اور ناپسند کا بڑا عمل دخل ہے کیونکہ کوئی بھی تحریر جب تک پڑھنے والوں کے مقاصد کو پورا نہیں کرتی اور ان کے دل و دماغ کو روشن نہیں کرتی۔ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

جہاں تک مولانا حالی کے اسلوب کا تعلق ہے تو مولانا حالی کی ابتدائی تحریروں میں قدیم نثر کا انداز نظر آتا ہے اور ان پر اس دور کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کی ابتدائی نثر زیادہ تر مذہبی رسائل پر مشتمل ہے جو انھوں نے ابتدا میں لکھے۔ جیسے مولود شریف، شواہد لالہام وغیرہ ان میں استدلال، منطقیت اور جذبات ملتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہبی رنگ کی نثر میں جذبات اور واعظانہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے ابتدائی زمانے کی نثر ایک خاص ماحول اور پس منظر میں لکھی گئی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد استدلال اور منطقی نثر کی بنیاد سر سید نے رکھی تھی۔ جس میں سر سید نے ہر پہلو پر لکھنے کی کوشش کی لیکن ان کی نثر مقصدیت کی رو میں بہہ کر رومانوی انداز اختیار نہ کر سکی۔ بقول ڈاکٹر عبدالقیوم:

''ان کی ہمہ گیر شخصیت نے کم و بیش ہر پہلو کو سمیٹ لیا جس کا ثبوت ان کی تصانیف سے ملتا ہے لیکن مقصد پر گہری نظر رکھنے کی وجہ سے ان کے یہاں

رومانوی جذبہ نہیں ابھر سکا اور حاجزانہ کیفیت نے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی
جس کی وجہ سے کہیں کہیں خشکی اور ناصحانہ کیفیت ابھر آئی۔''(۵)

حالی کی وجہ سے اردو نثر میں جو تازگی پیدا ہوئی اس نے آگے چل کر اردو نثر کے کئی راستے کھول دیے۔ انھوں نے مقصدیت کی بڑھتی ہوئی روش کو کم کیا اور نثر میں ادبی رنگ کی چاشنی بھری۔ حالی کی اردو نثر کا باقاعدہ آغاز ''حیات سعدی'' سے ہوتا ہے۔ جس کے اسلوب اور نثر پر سرسید تحریک کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اس تصنیف میں جذباتی اور رواعظانہ انداز نظر نہیں آتا بلکہ اس میں صفائی اور سادگی پیدا کرنے کی شعوری کوششیں کار فرما نظر آتی ہیں۔ حیات سعدی میں جو طرز نگارش ملتا ہے۔ وہ استدلالی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کو نتیجہ خیز بنانے کی کاوش نظر آتی ہے۔ بقول ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی:

''اردو زبان میں مفصل، مدلل، محقق اور جدید معیار پر صحیح اترنے والی سب سے پہلی سوانح عمری حالی کی ''حیات سعدی'' ہے اور اس میں جو طرزِ نگارش اور طریقہ استدلال اختیار کیا گیا ہے اس کے بانی اور موجد حالؔی ہیں واقعات کی تفصیل کے ساتھ ترتیب وار درج کر کے روایت کے ذریعے فلسفیانہ طور پر نتائج اخذ کرنا اردو زبان میں حالؔی ہی کی ایجاد ہے۔''(۶)

حیات سعدی ایک ایسی تصنیف ہے۔ شیخ سعدی کے اسلوب کا حسن و جمال جس سے حالی متاثر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اس کی وضاحت کی ہے اور وہ ان کے علمی و ادبی اور اصلاحی کارناموں سے بہت مانوس نظر آتے ہیں۔ سعدی اپنے عہد کے ایک بہت بڑے مصلح تھے۔ حالی نے سعدی کی دو مشہور کتابوں گلستان اور بوستان کا مطالعہ کرنے کے بعد ان پر تبصرہ کیا ہے علاوہ ازیں انھوں نے شیخ سعدی کا بحیثیت شاعر دیگر شعرا کے ساتھ موازنہ کرنے کے بعد شیخ سعدی کو برتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی گلستان اور بوستان سب سے زیادہ مشہور اور مقبول عام کتابیں ہیں جن کا مواد اصلاحی نوعیت کا ہے اگر چہ اصلاحی کتب انسانوں کی طبیعت پر بوجھ ہوا کرتی ہیں لیکن شیخ سعدی نے گلستان کو بڑے دلچسپ اور اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا ان کے

نقطۂ نظر کا قائل ہو جاتا ہے۔

بقول ڈاکٹر عبدالقیوم:

> ''حالی کی تصانیف میں ایک کلاسیکل نظم و ضبط باالفاظِ دیگر رکھ رکھاؤ اور انتہائی سنجیدگی نمایاں ہے۔ان کے یہاں سرسید کے اسلوب کی بیشتر خصوصیات پائی جاتی ہیں بلکہ بعض الفاظ میں ان کی نثر کو سرسید کی ترقی یافتہ نثر کہا جا سکتا ہے۔''(۷)

خواجہ الطاف حسین حالی اپنے عہد کے نہ صرف نامور سوانح نگار تھے بلکہ ان کو اردو تنقید کا بھی سالارِ اول سمجھا جاتا ہے۔اگر مقدمہ شعر و شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف جدید تنقید کے اصول وضع کیے بلکہ ان کی عملی صورتیں بھی پیش کرنے کی کوشش کی۔مقدمہ میں انھوں نے شعر کی ضرورت اور تاثیر کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی سماجی اور اخلاقی ضرورت پر بھی روشنی ڈالی اور پھر وہ اس کے جمالیاتی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔وہ شعر کی اصلی اور اس کی بنیادی صفات پر مدلل بحث کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ شاعری کا ملکہ بیکار نہیں اس سے بڑے بڑے کام لے جا سکتے ہیں۔مقدمہ کا انداز بیان دلچسپ اور پر اثر ہے۔

عہدِ سرسید میں جن لوگوں کو اردو ادب میں خاص مقام حاصل ہوا ان میں مولانا حالی سرفہرست ہیں۔ مولانا حالی نہ صرف اردو نظم میں اپنی الگ شناخت رکھتے بلکہ اردو نثر میں بھی ان کی الگ پہچان ہے۔مولانا حالی کی پہلی نثر تصنیف سوانح حکم ناصر حسرو ہے جو انھوں نے ۱۸۸۲ء میں لکھی اور مقدمے کے ساتھ شائع کی جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔حکیم ناصر خسرو کی فارسی نثر کا رنگ مولانا حالی کی اردو نثر میں جھلکتا ہے۔ اسے مولانا حالی کی نثر کا نقشِ اول قرار دیا جا سکتا ہے۔مولانا حالی کو ناصر خسرو کی راست گوئی اور سادگی بہت پسند تھی جس سے وہ متاثر تھے۔شاید اسی وجہ سے انھوں نے اس کو موضوع بنایا۔حالی کو اس سلسلے میں جو محنت کرنا پڑی اس کا ذکر مولانا عبدالرزاق کانپوری کے نام ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:

> ''میں نے جو اس کے اول میں ناصر خسرو کا حال فارسی میں لکھا ہے اس میں سخت

محنت اور تلاش کرنا پڑی۔'' (۸)

اس کے بعد حیات سعدی ۱۸۸۶ء میں حیات سعدی کے بعد ان کا بڑا کارنامہ ۲۲۸ صفحات پر مشتمل وہ مقدمہ ہے جو انھوں نے ۱۸۹۳ء میں اپنے دیوان پر تحریر کیا تھا اور دنیائے ادب میں م مقدمہ شعر و شاعری کے نام سے شہرت رکھتا ہے اور یہ مولانا کی نہایت اہم تصنیف بن گئی جن کی اہمیت و شہرت آج تک قائم و دائم ہے۔ بقول پروفیسر ممتاز حسین:

''حالی کی نظر میں یہ مقدمہ شعر و شاعری، جو دس سال کی محنت سے تیار کیا گیا تھا کس قدر اہم تھا اس کا اندازہ اس ایک بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ مطبوعہ دیوانِ حالی (۱۸۹۳ء) کے ٹائٹل صفحے پر دیوان حالی معہ مقدمہ نہیں بلکہ مقدمہ مع دیوانِ حالی لکھا ہوا ہے۔'' (۹)

مولانا نے یادگار غالب ۱۸۹۷ء میں لکھی۔ یادگار غالب کو جو پذیرائی حاصل ہوئی وہ اب تک قائم ہے اور ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد مسلم ہے۔ یادگار غالب کے بعد ان کی اہم نثری تصنیف ''حیات جاوید'' ہے جس کا زمانہ تصنیف ۱۹۰۱ء ہے۔ یہ سر سید احمد خان کی سوانح عمری ہے۔

حالی نے اپنی سوانحی تصنیف حیات سعدی کا موضوع جس شخصیت کو بنایا وہ فارسی ادب کی لازوال شخصیت شیخ سعدی شیرازی تھے جن کی سوانح مولانا نے اردو میں لکھی اس میں ان کو تحقیقی نوعیت کا کام کرنا پڑا۔ یہ اردو میں سوانح نگاری کا اولین نمونہ تصور کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ مضامین ہیں جو انھوں نے مختلف رسائل و جرائد میں لکھے اور جو کتابی صورت میں بھی چھپ چکے ہیں۔

جس عہد میں حالی نے نثر نگاری کی جانب توجہ کی وہ عہد سیاسی و سماجی اور تہذیبی اعتبار سے غیر معمولی تبدیلیوں سے عبارت تھا۔ دلی کی دیکھتی آنکھوں کے سامنے ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوا جس کے پیچھے صدیوں کی مغلیہ تہذیب کا شیرازہ بکھر گیا اور ملک پر انگریز مسلط ہو گئے۔ انگریزوں نے اپنی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لیے اپنی زبان، تعلیم اور ثقافت کو ملک کے طول و عرض میں متعارف کرانے کا بیڑا اٹھایا۔ یہاں تک کہ یہ دور مغربی

تہذیب وفکر کے روز افزوں اثرات کے تحت لوگوں کے طرز رہن سہن آداب زندگی اور ادبی نظریات میں گہری تبدیلیوں کا دور بن گیا اس دور میں سرسید جیسا روشن خیال بیدار مغز اور فعال مصلح پیدا ہوا جس نے اہل وطن اور خاص طور پر مسلمانوں کو ماضی پرستی کے رویے سے دستبردار ہونے اور نئے سائنسی تقاضوں کو لبیک کہنے کی تعلیم دی ان کے موثر اور عہد آفریں شخصیت سے حالی بھی متاثر ہوئے۔انھوں نے محسوس کیا کہ اردو زبان وادب اور شعر کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔انھوں نے معنوی اور لسانی احکامات اور حدبندیوں کی توضیع کی علاوہ ازیں اردو نثر میں سادہ نیچرل اور بے تکلف اسلوب کا رواج ہونے لگا جس کے اولین نثر نگاروں میں مولانا حالی نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔بقول ڈاکٹر حامدی کشمیری:

> ''انھوں نے اپنے خیالات اور نظریات کے موثر اظہار کے لیے نثر میں ایک ایسا طرز نگارش اختیار کیا جو اسے ادبی وقعت سے آشنا کرانے اور اردو نثر میں مستقل حیثیت عطا کرنے کا ضامن بن گیا۔یہ وہ کام ہے جو حالؔی ہی سے ممکن ہوا کسی اور انشا پرداز سے نہیں۔حالی سے پہلے اردو نثر میں اسالیب کی روایت نہ ہونے کے برابر تھی۔دکن میں وجہی کی سب رس کے بعد شمالی ہندوستان میں کربل کتھا، نوطرز مرصع اور فسانہ عجائب جیسے داستانوں کی نثر حد درجہ مسجلّی ومقفیٰ تھی یہ نثر غدر کے ساتھ ہی ماضی کا حصہ بن گئی۔''(۱۰)

مولانا حالی کی نثر میں سادگی، سلاست، روانی اور سنجیدگی نظر آتی ہے وہ فلسفیانہ اور پیچیدہ مضامین کو بھی بڑے عمدہ اور احسن طریقے سے بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔اگرچہ حالی سرسید عہد کے ایک اہم انشاپرداز ہیں لیکن سرسید کی تحریروں میں اور حالی کی تحریروں میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔سرسید کی تحریریں سادہ ہونے کے باوجود ناہموار ہیں اور ان میں حالی کی نسبت ادبیت کی کمی نظر آتی ہے۔علاوہ ازیں سرسید اور حالی کی منطقیت میں بھی فرق ہے جس کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''سرسید کی تحریروں میں منطقیت کڑے سانچوں کی صورت اختیار کرتی ہے۔حالی

کی منطقیت شاعرانہ منطق کی طرح نرم اور نفیس ہوتی ہے۔ قیاس تمثیلی سے کام لے کر حالی شاعروں کی طرح بعض قضیوں کو حسن تعلیل کی صورت دے دیتے ہیں۔ سرسید کی تحریروں میں حسن تعلیل کی مغالطہ انگیزی بالکل نہیں۔ سرسید کے بیانات قطعی ہوتے ہیں۔ حالی کی قطعیت میں شاعرانہ تیقن کا انداز پایا جاتا ہے۔ ان امتیازات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حالی سرسید کے ہم عقیدہ ہونے پر بھی ان سے بالکل مختلف آدمی تھے۔''(۱۱)

حالی کی نثر میں الفاظ اور معنی متوازن نظر آتے ہیں جہاں ان کی عبارت دلچسپ اور بامحاورہ ہوتی ہے۔ وہاں ان کے جملوں میں ادبی حسن بھی نظر آتا ۔ان کے جملے بے کیف نہیں ہوتے اس میں شک نہیں کہ اردو زبان کو سادگی اور سلاست عطا کرنے میں سرسید نے اہم کردار ادا کیا اور اردو نثر کو سادگی، سلاست اور مقصدیت عطا کی ۔لیکن حالی نے اس سادگی، سلاست اور مقصدیت میں ادبیت کے رنگ بھرے اور اسے پڑھنے والوں کے لیے دلچسپ بنا دیا جس نے آگے چل کر اردو نثر کو وسعت اور جامعیت بخشی مولانا حالی کا اردو نثر پر بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اسے خواص کے طبقہ سے نکالا اور عوام تک لے کر آئے کیونکہ وہ خود عوام سے تھے اور عوامی انداز میں لکھتے تھے۔اس سلسلہ میں سید شاہ علی مولانا حالی کی نثر نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آج کی اور مستقبل کی زبان حالی ہی کا عطیہ ہے نئے لکھنے والوں اور ترقی پسندوں سب نے اسی کو اپنایا۔جدید نثر نگاروں میں آزاد، نذیر احمد اور شبلی کا مقلد شاذو نادر ہی کوئی نظر آتا ہے۔''(۱۲)

حالی نے نئی تعمیر کا آغاز کیا ان کے دل میں یا ذہن میں جو بات ہوتی ہے وہ بڑے احسن طریقے سے اسے قارئین تک پہنچا دیتے ہیں۔ان کی بات ان کی زبان تک محدود نہیں رہتی تھی۔وہ ایک وسیع المطالعہ اور صاحب فکرونظر انسان تھے اس کے علاوہ ان کے سچے جذبات بھی ان کے ترجمان ہوا کرتے تھے جو خلوص و محبت میں ڈوبی ہوئی باتیں کرتے تھے۔

دبستان سرسید کی اہم خصوصیت سادگی ہے لیکن حالی کی نثر میں یہ خصوصیت اپنا ایک منفرد رنگ اختیار کر لیتی ہے جس سے ان کے اسلوب کی تشکیل ہوتی ہے۔ سرسید کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت بھی سادگی ہی ہے۔ مگر سرسید کی سادگی اور حالی کی سادگی میں نمایاں فرق ہے۔ سرسید کی سادگی بے کیف اور سپاٹ ہے جو بعض اوقات ادبیت سے گر جاتی ہے۔ مگر اس کے برعکس حالی کی سادگی میں ایک شان اور ادبی رچاؤ ہے۔ حالی کی سادہ بیانی ایک علمی سطح رکھتی ہے۔ وہ سرسید کی طرح اپنے تحریروں میں عامیانہ محاورے اور روزمرہ کو جگہ نہیں دیتے۔ چنانچہ ان کی نثر عام فہم سلیس اور سادہ ہوتی ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بات کرتے ہیں۔ عہد سرسید کے ایک اور اہم ادیب شبلی کے ہاں بھی سادہ بیانی ہے لیکن جس طرح حالی کی سادگی سرسید سے مختلف ہے اسی طرح حالی اور شبلی کی سادگی میں بھی نمایاں فرق ہے۔ شبلی کی سادگی مشکل پسندی کی وجہ سے تھوڑے فاصلے پر ہے علاوہ ازیں ان کی عبارت ایک طبقہ یعنی علماء کے لیے ہے جو ان کے اشاروں کو سمجھ لیتے ہیں اور استعاروں کے پس منظر سے گہری واقفیت رکھتے ہوں۔ حالی چونکہ عام لوگوں کے لیے لکھتے تھے اس لیے ان کی سادگی شبلی کی سادگی سے مختلف ہے۔

مجموعی اعتبار سے ہم ان کی سادگی کے بارے میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان میں نہ تو سرسید کی عامیانہ سطح ہے اور نہ شبلی کی عالمانہ شان نہ نذیر احمد کا حد سے بڑھا ہوا ناصحانہ انداز چنانچہ اس دور کے سب سے نمایاں اور اہم نثر نگار حالی ہی نظر آتے ہیں جن کی سادگی میں وقار اور سنجیدگی ہے۔

حالی کے تصور اسلوب میں تین چیزیں بہت اہم ہیں۔ پہلی چیز جس پر وہ زور دیتے ہیں یہ ہے کہ کلام میں صداقت ہو اور وہ حقیقت پر مبنی ہو۔ دوسرے وہ سادہ ہو اور اس میں سلاست بھی موجود ہو۔ تیسری چیز جس کو حالی بہت اہم سمجھتے ہیں وہ نیچرل اسلوب بیان ہے جس میں بناوٹی رنگ نہ ہو۔

حالی اس اسلوب کو اچھا اسلوب سمجھتے ہیں جس میں سچے جذبات ہوں جو نیچرل ہو حالی کے نزدیک یہ اسلوب کی بڑی خوبیاں ہیں۔ حالی اپنی طبیعت کے مطابق سادہ اور لگی لپٹی کے بغیر بات کرتے ہیں اور ان کا یہ انداز بیان منفرد نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے وارث علوی اپنی کتاب ''حالی، مقدمہ اور ہم'' میں لکھتے ہیں:

''حالؔی کے اسلوب میں کوئی بناوٹ نہیں کیونکہ حالی کو بننا نہیں آتا بناوٹ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب آدمی اپنی حقیقی آواز میں نہیں بلکہ مستعار آواز میں بات کرنے لگتا ہے۔ چہرے پر نقاب پہنتا ہے اور تصویر کے لیے ایک ایسا پوز اختیار کرتا ہے جو اسے جو کچھ کہ وہ ہے اس کے برعکس جو کچھ کہ وہ بننا چاہتا ہے وہ بنا کر پیش کرتا ہے۔''(۱۴)

بے ساختگی اور بے تکلفی حالی کی نثر کی اہم خوبی ہے وہ تصنع سے دور سے بھاگتے اور فطری اسٹائل میں لکھتے ہیں۔ سرسید کی تحریروں میں بھی بے ساختگی ہے اور کس حد تک شبلی کے ہاں بھی ہے۔ مگر حالؔی کی بے ساختگی ایک انفرادیت رکھتی ہے اور حالی کی بے ساختگی اور سرسید کی بے ساختگی میں وہی فرق ہے جو سادگی کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔

سرسید اپنی بے ساختگی پر کسی ادبی بیان کے قائل نہیں جبکہ حالی اپنی بے ساختگی کو اس طرح نہ تو بے ضرورت آزادی دیتے ہیں اور نہ ہی شبلی کی طرح بے جا قدغن لگاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی بے ساختگی میں سرسید شبلی اور نذیر احمد کے برعکس وقار نظر آتا ہے۔

حالی کا طرز تحریر سنجیدہ اور متین ہوتا ہے وہ اپنا مافی الضمیر بڑے احسن طریقے سے بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے خیالات اور مقصد کو سمجھنے میں قاری کو دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ یہی نثر کی سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے وہ قاری کو بھول بھلیوں میں نہیں ڈالتے بلکہ سیدھی بات کرتے ہیں اور وہ اس پیرایہ اظہار کو اپناتے ہیں جو قاری کے لیے زیادہ آسان فہم اور موزوں ہوتا ہے۔ حالی کی تمثیلیں موقع محل کے مطابق ہوتی ہیں کہ پڑھنے والا فوراً قبول کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور ان کے نقطۂ نظر کو قبول کر لیتا ہے۔ حالی کے طرز فکر اور ان کے اصلاحی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے قاری کو دشواری نہیں ہوتی۔ وہ ایک وسیع المطالعہ شخص تھے اور انھیں عربی فارسی پر بھی مکمل دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے اپنے مطالعہ اور خیالات کی وسعت کی بنا پر اردو کے نثری ادب میں گراں قدر اضافہ کیا وہ اردو زبان کے ابتدا اور اس کے لسانی طرز تحریر اور پس منظر سے بھی خوب واقف تھے۔ انھوں نے

اپنی تحریروں میں ہندی، کھڑی، بولی، فارسی کے الفاظ کے ساتھ ساتھ انگریزی الفاظ کا بھی بعض موقعوں پر استعمال کیا ہے مثلاً نیچرل، ٹیکنیکل، ڈکشنری، فنڈ، بیوگرافی وغیرہ جیسے الفاظ کی نثر میں ملتے ہیں۔

مثلاً منشی محمود احمد عباسی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''یہ سن کر نہایت مسرت ہوئی (بشرطیکہ آپ بھی خوش ہوں) کہ آپ کو پرسنل اسسٹنٹی پر لے لیا گیا ہے۔ صاحب زادہ صاحب نے یہاں بھی سجاد حسین کو اس امر کی اطلاع دی تھی۔ امید ہے کہ آپ بھی علی گڑھ کے قیام کو دورہ پر ترجیح دیں گے اور اس کام کو دل سے پسند کریں گے۔''(۱۴)

حالی کے اسلوب کی ایک اور نمایاں اور اہم خوبی ان کا غیر شخصی رنگ ہے وہ اپنی تحریروں میں اپنی ذات کو داخل نہیں کرتے۔ یہ غیر شخصی رنگ عہد سرسید کے دیگر ادیبوں میں کم نظر آتا ہے۔ وہ مضامین سوانح، یا مکتوب لکھتے وقت اپنے اس غیر شخصی رنگ کو برقرار رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ حالی کے اسلوب کے اس وصف کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ اپنی ذات کو اپنی تحریروں میں بہت کم داخل کرتے ہیں اس لحاظ سے جس قدر ان کی انشاء غیر شخصی ہے (Imporsonal) ہے سرسید کے رفقاء میں سے کسی اور شخص کی نہیں وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس میں عموماً ایک بے تعلق مبصر، واقعہ نویس اور واقعہ نگار کا رنگ پیدا کرتے ہیں۔ ''حیات جاوید'' میں (نیز کسی حد تک ''یادگارِ غالب'' میں) وہ چاہتے تو اپنی ذات کی زیادہ سے زیادہ آئینہ بندی کرتے اور سرسید کے پردے میں اپنی کہانی بھی سنا دیتے، مگر ''حیات جاوید'' سے زیادہ ان کے بے تکلفی کا گواہ اور کوئی نہ ہوگا۔''(۱۵)

حالی کی حیات سعدی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ''حیات سعدی'' میں شخصی روابط موجود ہیں مگر حالی اور سعدی کے درمیان تو صدیوں کا فاصلہ ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''اور پھر جتنا شخصی رابطہ یا جذباتی تعلق اس کتاب میں نظر آتا ہے اتنا تو ہونا چاہیے ......ورنہ ہم حالی کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتے اور یہ کہنے میں حق بجانب ہوتے کہ ہائیں! یہ تو کوئی مومی مجسمہ ہے جس کے پہلو میں انسان کا دل ہی نہیں۔ دنیا میں اس طرح کے مصنف (اگر وہ سچ مچ مصنف ہیں ادیب اور فنکار ہیں) نہیں ملیں گے۔''(۱۶)

حالی کے غیر شخصی رنگ پر اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اس بنا پر ان کی تحریروں میں روکھا پن نظر آتا ہے یا جذبے کی کمی نظر آتی ہے جو پڑھنے والے کو کھٹکتی ہے ہوسکتا ہے بعض موقعوں پر جذبے کی کمی ہو لیکن جب ہم ان کی تحریروں کو مجموعی تناظر میں دیکھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ کسی شخصیت کے متعلق لکھنے کے لیے وہ جذبہ کارفرما ہوتا ہے جو اس کی تحریروں میں جان ڈالتا ہے یا حرکت پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے ملاحظہ ہو:

''جہاں تک میں حالی کی کتابوں کو دیکھ سکا ہوں، مجھے تو اس حقیقت کا یقین سا ہے کہ حالی کی جملہ تصانیف میں جذبے کا عنصر موجود ہے۔ ثبوت اس کے کئی ہیں، اول تو ان کی بیشتر تصانیف کی بنیادی نوعیت ہی ایسی ہے کہ ان کی تحریک میں ایک شخصی جذبہ کافرما ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ حالی ایک سوانح نگار تھے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کوئی شخص سوانح نگاری کے کسی موضوع کے لیے تب ہی قلم اٹھاتا ہے جب پہلے اسے اپنے موضوع کے ساتھ دلچسپی ہو۔ اور صاحب یہ دلچسپی تفریح تو ہو نہیں سکتی یہ وہ دلچسپی ہوگی جو محبت اور عقیدت ہی کے جذبے سے ابھر سکتی ہے۔''(۱۷)

حیات سعدی میں وہ سعدی کے اسلوب میں سادگی کو بڑا وصف سمجھتے تھے ان کے خیال میں خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہی کیوں نہ ہو وہ ناہموار اور پیچیدہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ وہ عام فہم ہو اور روزمرہ کے زیادہ قریب ہو اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کے بھی قائل نظر آتے ہیں کہ کلام میں ریاکاری نہیں ہونی چاہیے اور بات کو بڑے

احسن طریقے سے کیا جانا چاہیے اور اصلیت پر مبنی ہونی چاہیے۔

مولانا حالی اپنی نثر میں جذبات کا شکار نہیں ہوتے ان کی نثر میں غلو اور جانبداری کا عنصر موجود نہیں وہ لکھتے ہوئے بااعتماد نظر آتے ہیں اور استدلال سے کام لیتے ہوئے بعض نظریات کو اپناتے ہیں اور بعض کو چھوڑ جاتے ہیں۔ دبستان سرسید کے دوسرے ادباء کی طرح حالی کی نثر میں مقصدیت بھی پائی جاتی ہے مگر انھوں نے مقصدیت اور ادبیت میں توازن برقرار رکھا وہ نہ تو مقصدیت کی رو میں بہہ کر ادبیت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور نہ ہی ادب برائے ادب کے قائل ادباء کی طرح مقصدیت کو چھوڑتے ہیں۔ حالی کی تحریروں میں ادبیت اور مقصدیت کا ایسا دلکش امتزاج نظر آتا ہے جو اس دبستان کے دوسرے ادباء میں نہیں۔ سرسید کا جھکاؤ واضح طور پر مقصدیت کی طرف ہے اور شبلی کے ہاں ادبیت کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔ نذیر احمد بھی ادبیت اور مقصدیت میں توازن قائم نہ رکھ سکے ان کے ہاں بھی مقصدیت نمایاں نظر آتی ہے۔ حالی کی تحریروں کا یہ اعتدال اور توازن ان کو انفرادیت بخشتا ہے۔ دراصل حالی مزاج کے اعتبار سے ایک ادیب اور شاعر کا دل و دماغ رکھتے ہیں چنانچہ جب بحث کرتے ہیں تو ان کے دلائل میں مقصدیت کے ساتھ ساتھ شاعرانہ تمثیلیں بھی نظر آتی ہیں۔ خاص طور پر جب مولانا حالی کے اسلوب کی ایک یہ بھی خوبی ہے کہ جب وہ لکھتے تو ابہام پیدا نہیں کرتے یعنی ان کی تحریریں مبہم نہیں ہوتی بلکہ واضح اور شفاف ہوتی ہیں جو دونوں لکھنے والے اور پڑھنے والے کے مقصد کو پورا کرتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالقیوم لکھتے ہیں:

> ''ایک انشا پرداز کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے خیالات میں نہ تو ابہام رہے اور نہ پیچیدگی بلکہ ادبیت کی شان باقی رہتے ہوئے بول چال کی زبان سے قریب آ جائے۔ نازک خیال اور صناعی کچھ شاعروں کے یہاں زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے کہ لکھنے والے کو الفاظ کے درو بست فن انشا کے لوازم اور سب سے بڑھ کر ابلاغ کے فرض سے کما حقہ آگاہی ہو اور وہ سیدھے سادھے الفاظ میں پیچیدہ خیالات کو بھی ادا کرنے کا ہنر جانتا ہے۔''(۱۸)

مولانا حالی اپنے خیالات کے مطابق زبان استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے بیان میں وضاحت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے انداز بیان میں آرائش اور بناوٹ کم نظر آتی ہے۔ حالی ایک ایسے طرز تحریر کے نمایندہ ہیں جسے بعد میں آنے والے ادبا نے بھی اپنایا۔ حالؔی نے اپنی تحریروں میں ہندی اور دیگر زبانوں کے الفاظ خوب استعمال کیے اور ہر موقع پر برمحل کہ کہیں بھی جھول یا کمی نظر آتی بلکہ ان کے استعمال سے علمی و ادبی چاشنی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یہی حالی کی کامیابی ہے۔ وہ نرم شیرین الفاظ کے رمز شناس اور نباض تھے اور انھیں استعمال کرنے کا فن بھی جانتے تھے۔

مولانا حالی کا اسلوب نثر خواہ سوانح کا ہو تنقید کا ہو یا مکتوبات کا وہ ادبی نثر کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ حالؔی کی نثر میں بالخصوص خطوط میں ان کی شخصیت کے پہلو آئینہ ہو جاتے ہیں اور ان کی ذات کے خدوخال متعین کیے جا سکتے ہیں ان کی نثر کے اس وصف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حامد کشمیری لکھتے ہیں:

''حالی کی نثر میں ان کی شخصیت کا غلبہ نہیں بلکہ ان کی شخصیت کے روشن پرتو ملتے ہیں۔''(۱۹)

مولانا حالی نہ صرف اپنے زمانے کے منفرد نثر نگار تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے عہد کے تہذیبی حالات سے بھی واقف تھے چنانچہ ان کی نثر کو ان حوالوں سے پیش نظر رکھ کر دیکھنا چاہیے اس حوالے سے وہ باوقار اور نثر نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ''افکار حالی'' میں لکھتے ہیں:

> ''حالی کی نثر بڑی جچی تلی اور متین ہوتی ہے۔ متین سے میری مراد ایسی نثر ہے جس میں جان اور قوت ہو۔ حالؔی کے مزاج اور کلام میں اعتدال اور قدیم اساتذہ کا سا ضبط ہے۔ وہ جذبات سے مغلوب نہیں ہوتے عقلیت اور استدلال کو مدنظر رکھتے ہیں۔ رنگین عبارت جو تشبیہ و استعارات سے مملو ہوتی ہے ذہن کو اصل موضوع سے ہٹا کر لفظی صنائع اور آرائش کی طرف لے جاتی ہے اور اصل مضمون کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے۔ ان کی نثر میں الفاظ اور خیالات ایسے ایک جان ہو جاتے ہیں اس سے معنی میں روشنی اور کلام میں شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔''(۲۰)

عہد سرسید میں آرائش بیان کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی لیکن جب حالی کی نثر کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں فنکارانہ معنویت نظر آتی ہے۔ان کے کلام میں الفاظ کی تراش خراش پر بھی زور ملتا ہے اور پرکاری بھی نظر آتی ہے۔اپنے ایک مضمون ''زبان گویا'' میں لکھتے ہیں:

> ''اے میری بلبلِ ہزار داستان! اے میری طوطی شیوا بیان اے میری قاصد اے میری ترجمان اے میری وکیل! اے میری زبان سچ بتا کہ تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے کبھی تو ایک ساحرفسوں ساز ہے جس کے سحر کارانہ جادو کا اتار تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زیر کا نہ دارو نہ کاٹے کا منتر تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں بھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔''(۲۱)

درج بالا عبارت حالی کی انشاپردازی کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ یہاں حالی الفاظ کے رمز شناس اور نباض نظر آتے ہیں۔اور وہ بڑے سلیقے کے ساتھ ان کو استعمال کرتے ہیں کہ ان کی فنی اور معنوی خوبیاں عیاں ہو جاتی ہیں۔اور یہ موقع پر مناسب اور متوازن الفاظ لے کر آتے ہیں کہ ان کے فنِ انشاپردازی کی داد دینا پڑتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''حالی کی رائے میں اسلوب اصولاً مصنف کی فطرت اور طبیعت کے ''نیچرل'' بہاؤ کا نام ہے وہ ادیب اور اس کے اسلوب بیان کے درمیان اتنا فاصلہ تسلیم نہیں کرتے جتنا قدیم علمائے بیان و بلاغت سمجھتے ہیں۔ان کا خیال یہ ہے کہ ادیب پہلے پیدا ہوتا ہے پھر بنتا ہے جو ادیب پیدا نہیں ہوتے وہ بن ہی نہیں سکتے۔''(۲۲)

نیچرل سے مراد مولانا حالی ایسے مضامین لیتے ہیں جو فطرت انسان کے مطابق ہوں۔...........قدرت

کے مطابق ہوں اور پھر وہ انسانی عقل کی حدود کے اندر ہوں۔ وہ ایسے بیان کو نیچرل سمجھتے ہیں جو طبیعت میں بے ساختہ طور پر موجود ہو اور پڑھنے والوں کو جس کے سمجھنے میں دشواری نہ ہو اور قارئین کے لیے عام بول چال کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو۔

حالی اپنے پڑھنے والوں کو وہ اصلیت دکھانے کی طرف مائل نظر آتے ہیں جو مصنف کے اپنے ذہن یا تخیل میں ہوتی ہے اور جس میں تصنع نہ ہو وہ کسی بھی چیز کو صحت اور صفائی کے ساتھ پیش کرنے کو انشا پردازی کی بڑی خوبی سمجھتے ہیں۔ حالی کا نیچرل اسلوب ان کی تحریروں میں جا بجا نظر آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> ''مولانا حالی کے نزدیک نیچرل اسلوب بہترین اسلوب ہے اور نیچرل اسلوب کم و بیش مترادف ہے۔ سادگی، بے تکلفی اور مطلب نگاری کا ''حیات جاوید'' کے بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سر سید احمد خاں نیچرل اسلوب یا نیچرل اسٹائل کے مالک تھے، گویا دوسرے الفاظ میں ان کے کلام میں سادگی اور بے تکلفی (بے ساختگی) بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔''(۲۳)

یہ چیز ان کی نثر کو وہ عظمت و رفعت عطا کرتی ہے جو کلاسیکی ادب کا خاصا سمجھا جاتا ہے۔ سر سید کی تحریروں میں ادبی لطافت کی کمی نظر آتی ہے۔ جبکہ مولانا حالی اپنی نثر میں الفاظ و معنی کے تعلق کو جوڑتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور یہ چیز ان کی نثر کو لطیف بنا دیتی ہے جس کو پڑھتے ہوئے قاری محظوظ ہوتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں فصیح اور غیر فصیح کا خیال بھی رکھتے ہیں اور موزوں اور فصیح الفاظ و محاورات کو استعمال کر کے ادبی حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔

حالی سچائی اور جذبوں کی صداقت کو بڑی اہمیت دیتے ہیں ان کے نزدیک تحریروں میں سچائی اور جذبات کارفرما ہونے چاہئیں کیونکہ وہ راست بازی اور خلوص کو کسی ادیب کی تحریروں کا بنیادی وصف قرار دیتے ہیں۔ وہ صداقت کی چاشنی جذبے کی قوت کو نہایت ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مصنف کو بڑی محنت اور عرق ریزی سے اپنی تحریروں کو سجانا چاہیے وہ سمجھتے ہیں کہ جاندار ادب ہی زندہ و جاوید رہتا ہے۔ اپنی تصنیف ''حیات

جاوید'' میں لکھتے ہیں:

> ''جو لوگ تصنیف کے درد سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ کلام میں لذت اور مقبولیت پیدا نہیں ہوسکتی جب اس کے ایک ایک لفظ میں خونِ جگر کی چاشنی نہ ہو۔''(۴۴)

وہ کلام میں نثر ہو یا نظم محنت شاقہ کے قائل ہیں۔خون جگر کی چاشنی سے مراد وہ محنت و مشقت ہے جو مصنف کو دوران تحریر اور دوران تحقیق کرنا پڑتی ہے۔

مولانا حالی اپنی نثر میں جزبات کا شکار نہیں ہوتے وہ نثر کو نثر کے انداز میں لکھتے ہیں۔اپنے موضوع اور مقصد سے نہیں ہٹتے۔بقول ڈاکٹر سید عبداللہ: ''مولانا حالی اصولاً نثر میں نثر ہی لکھتے تھے۔شبلی اور آزاد نثر سے شاعری کا کام لینا چاہتے تھے۔''(۴۵)

حالی کے نزدیک ادب کو زندگی کے تقاضوں سے آشنا ہونا چاہیے اور اپنے عہد کا ترجمان ہونا چاہیے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں دونوں چیزیں نظر آتی ہیں کیونکہ ہر زمانے کا ادب نہ صرف اپنے عہد کا آئینہ دار ہوتا ہے بلکہ اپنے زمانے کے معروضی حالات کے ساتھ جڑا ہوا بھی ہوتا ہے۔

جہاں تک حالی کی سوانح نگاری اور مکتوب نگاری کے اسلوب کا تعلق ہے تو حالی کی پہلی سوانح ''حیات سعدی'' اردو میں باقاعدہ سوانح نگاری کا نمونہ سمجھی جاتی ہے۔شیخ سعدی صدیوں سے ہندوستان میں جانے جاتے تھے لیکن ان کو حالات وواقعات اور کتابی صورت میں پیش کرنے کا سہرا مولانا حالی ہی کے سر ہے۔حیات سعدی میں حالی کا اسلوب تحقیقی اور تعارفی نوعیت کا ہے اس کے اسلوب میں جہاں دلکشی اور دلچسپی موجود ہے وہاں وہ اپنے پڑھنے والے کے لیے کئی نئے دروا کرتی ہے۔حالی نے سعدی کی سوانح عمری کا انتخاب شاید اس لیے کیا تھا کہ وہ اس سے متاثر تھے اور دوسرے وہ فارسی شعرا میں ممتاز اور موثر شاعر سمجھے جاتے ہیں۔حیات سعدی کا اسلوب رواں صاف اور عام فہم ہے اس میں کوئی پیچیدگی نظر نہیں آتی قاری پڑھتے ہوئے دلچسپی محسوس کرتا ہے اور شیخ سعدی خود ایک اہم علمی و ادبی شخصیت تھے لہٰذا اس کتاب میں حالی نے اس کے خصائل عادات اور معمولات

پر بڑے اچھے انداز سے بحث کی ہے۔

مولانا حالی اپنے طرز تحریر میں تصنع اور لفاظی کا شکار بھی نہیں ہوتے اور نہ ہی بے جا تکلفات میں الجھ کر اصل موضوع کو گم ہونے دیتے ہیں وہ اپنے موضوع کو ہمیشہ سامنے رکھتے ہیں اور اصلیت پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ پر تکلف انداز بیان نہیں اپناتے ان کے نزدیک ایسے انداز بیان سے مصنف اپنے اصل مقصد سے ہٹ جاتا ہے اور لفظی صناعی میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔یہی حالی کی کامیابی ہے وہ نہ تو اپنی نثر کو گرنے دیتے ہیں اور نہ ہی الجھاؤ کا شکار ہوتے ہیں۔چنانچہ ان کا طرز تحریر ادبیانہ ہونے کے ساتھ علمی اور تنقیدی بھی ہوتا ہے۔وہ ایک تجربہ کار ادیب کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا حالی اردو زبان کی ترقی اس میں جدت کے قائل تھے وہ اپنی تحریروں میں بھی اس پر زور دیتے تھے اور فرسودہ خیالات تصورات میں تبدیلی کے خواہش مند تھے جس کا اظہار وہ مقدمہ میں کرتے ہیں اور یہ چیزیں ان کے بعض مکتوبات کے ذریعے بھی عیاں ہوتی ہیں۔اپنے ایک خط میں خواجہ تصدق حسین کو لکھتے ہیں:

> ''آپ یقین جانیے کہ میں اس زمانے کی لٹریری ترقی کے آگے ایسی تحریرات کو جو میری طرح محض اردو فارسی کے مرد میدان ہیں۔لاشے محض جانتا ہوں۔ہم لوگ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں داخل ہو گئے ہیں ورنہ پرانے خیالات کا اثر ہمارے دل پر بالکل نہیں گیا ہے۔''(۲۶)

مقدمہ کا اسلوب بہت رواں اور سلجھا ہوا ہے۔

مولانا حالؔی کی دو اہم نثری تصانیف حیات جاوید اور یادگار غالب اس وقت لکھی گئی جب مولانا کا ادبی عروج کا زمانہ تھا۔یادگار غالب حیات جاوید سے قبل لکھی گئی جس میں حالی کا ادبی شعور پختہ نظر آتا ہے اس کے بعد حیات جاوید جو مولانا حالی کی آخری سوانحی تصنیف ہے۔مولانا حالی جب یہ کتاب لکھ رہے تو ان کے دلچسپی اور انہماک کا اندازہ ان کی تحریروں سے کیا جا سکتا ہے۔

سرسید مولانا کے مہربان دوست مربی اور ہمدرد تھے اس لیے وہ ان کی سوانح عمری بڑے اچھے انداز سے لکھنا چاہتے تھے جس سے ان کی زیادہ سے زندگی اور کارناموں کو منظر عام پر لایا جا سکے۔حیات جاوید میں سرسید کی ابتدائی زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بہت ساری قابلیتوں کے مالک تھے۔اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت ساری ذہنی،علمی، اخلاقی اور جسمانی خوبیوں سے نوازا تھا۔انھوں نے ہمہ وقت اپنی ذات کو قومی ملی اور تعلیمی خدمات کے لیے وقف کر رکھا تھا۔وہ ایک جوہر شناس شخص تھے جنھوں نے اپنے عہد کے نامور ادباء،علماء کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل کر لیا تھا۔جنھوں نے نہ صرف علمی بلکہ ادبی میدان میں بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ان میں حالی،شبلی،مولوی ذکا اللہ،ڈپٹی نذیر احمد،محسن الملک،وقار الملک اور مولانا آزاد خاص طور پر قابلِ ذکر ان علماء ملت نے علمی و ادبی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور سرسید کا عہد ایک دبستان اور تحریک بن گیا۔ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔حالی نے اس کتاب میں سرسید کی حیات اور ان کی خدمات پر سیر حاصل بحث کی ہے اور کوشش کی ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ پوشیدہ نہ رہے بلکہ قارئین کے سامنے کھل کر بیان کر دیا جائے۔

حیات جاوید کے اسلوب نگارش میں بھی حالی کے اسلوب خاص کی تمام خوبیاں نظر آتی ہیں مثلاً روانی، سادگی،سلاست وغیرہ محترمہ صالح عابد حسین یادگارِ حالؔی میں حیات جاوید کے طرز تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''حیاتِ جاوید کی زباں اور طرز بیان بہت رواں اور سلجھا ہوا ہے۔باتوں باتوں میں بڑے مشکل مسائل پانی ہو جاتے ہیں۔نہ کہیں ذہن اٹکتا ہے نہ دماغ ٹھوکر کھاتا ہے۔ان کے ایک نقاد نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ حیات جاوید میں تو انھوں نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے ہیں اور ہر لفظ نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے جو اپنی جگہ سے اٹھایا نہیں جا سکتا۔''(۲۷)

حالؔی اپنے طرز تحریر میں پختہ کار نثر نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں ان کو الفاظ کے استعمال کا فن بھی آتا ہے اور وہ جملوں کی ساخت اور بناوٹ میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ان کی نثر کی یہ خوبیاں ان کی تنقید سوانح اور

مکتوبات میں واضع طور پر نظر آتی ہیں۔

یادگارِ غالب حالؔی کی مشہور تصنیف اور مرزا غالب کی سوانح عمری ہے۔ غالب کی شخصیت، شاعری اور مثنویات کسی تعارف کے محتاج نہیں ان کا کلام اور ان کے خطوط قبول عام کا درجہ حاصل کر چکے ہیں ان کی وفات کے بعد ہندوستان میں ادب کا ایک عہد اختتام پذیر ہوا۔ مولانا حالؔی اور غالب کا رشتہ استاد شاگرد کا تھا۔ حالی کی غالب سے ملاقات عالمِ شباب میں ہوئی تھی جب وہ دلی میں تحصیل علم کے لیے گئے تھے۔ قیام دہلی کے زمانے میں جب وہ غالب سے اصلاح لیتے تھے اور ان کی محفلوں اور مجلسوں میں شریک ہوتے تھے حالی کی زندگی میں گہرے اثرات مرتب کیے۔ جس کا اندازہ ان تحریروں سے ہوتا ہے جو حالی نے ان کے متعلق لکھیں۔ حالی نے ان کی شخصیت ادبی کارناموں سے متاثر ہو کر یادگارِ غالب لکھی جو اپنے اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے بہترین سوانحی تصنیف بن گئی اور ہر عہد میں مقبول عام رہی۔ حالی نے مرزا کی شخصیت کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے اور جابجا لطائف کے ساتھ اس کو زیادہ موثر اور دلچسپ بنایا ہے کہ قاری کو پڑھ کر مرزا کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا پورا طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔

یادگارِ غالب کی نثر اور اندازِ بیان دلچسپ، معلوماتی اور ادبی ہے۔ ایسی نثر پڑھنے والوں کے لیے نہ صرف محظوظ ہونے کا سبب بنتی ہے بلکہ معلومات کے کئی در کھول دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کلام غالب کی جا بجا وضاحت اور تشریح کرتے ہیں جو قارئین کے لیے ادبی و علمی وسعت کا سبب بنتی ہے۔ اب حالی کے مکتوباتی اسلوب کو دیکھیے۔

حالی کے خطوط کے اسلوب سے متعلق صالح عابد حسین لکھتی ہیں:

> ''جس خط میں بناوٹ، تکلف اور آورد ہو ممکن ہے وہ ادب کا سہ پارہ بن سکے (اگر چہ اس میں بھی شبہ ہے) لیکن وہ چیز نہ ہوگی جس سے ملاقات کا سا لطف اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔''(۴۸)

محترمہ صالحہ عابد حسین کی رائے کے مطابق جب ہم حالی کے خطوط کو پرکھتے ہیں تو ہمیں ان کے خطوط میں

نہ تو بناوٹ نظر آتی ہے اور نہ تکلف اور آورد بلکہ اس کے برعکس ہمیں خلوص، بے تکلفی اور سچائی نظر آتی جو ان کی شخصیت میں بدرجہ اتم موجود تھی۔اس کے علاوہ ادبیت کے بھرپور اظہار کا احساس بھی ملتا ہے مثلاً ولائت علی خاں عزیز بصفی پوری کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"والا جناب التسلیم والی بالتقریم!

مکرمت نامہ مع ارمغان ونوریاں اور رسالہ اشعار الاشعار کے شرف ورود لایا۔ نہایت افسوس ہے کہ بسبب مکروہات چند در چند ان تینوں عطیوں کی رسید اور شکریہ بھیجنے میں بہت دیر ہوگئی۔امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔اگر چہ ارمغان ونوریان کو دیکھ کر اس لحاظ سے نہایت خوشی ہوئی کہ اس زمانہ ناپرساں میں جبکہ قدیم کمالات بسبب کساد بازاری کے صفحہ روزگار سے مٹتے جاتے ہیں، آپ جیسے صاحب کمال خاکدان ہند میں اب تک موجود ہیں۔"(۴۹)

مذکورہ خط میں الفاظ کا استعمال بڑے خوبصورت انداز سے برمحل اور برموقع نظر آتا ہے اور تراکیب میں بھی فطری حسن بکھرا ہوا ملتا ہے۔حالی مکتوباتی اسلوب میں صداقت، سادگی اور دلکشی نظر آتی ہے۔خطوط چونکہ انسانی سیرت اور شخصیت کو اجاگر کرتے ہیں لہٰذا ان میں کوشش اور آورد سے جو خوبیاں داخل کی جائیں وہ بناوٹی رنگ میں ہوں گی۔حالی کے خطوط تصنع اور آورد سے مبرا ہیں۔ان کا انداز بیان واضع صاف اور سیدھا ہے جو ان کے دل میں ہوتا ہے وہ بے تکلفی سے لکھ دیتے ہیں۔

حالی اپنی عام زندگی میں بھی منکسر المزاج تھے لہٰذا ان کے خطوط بھی ان عاجزانہ صفات سے مزین نظر آتے ہیں۔کہیں بھی اور کبھی بھی اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کرتے۔بلکہ بعض ایسے خطوط بھی ہیں جن میں ادبی نکات کی وضاحت کرتے ہیں اور مشورہ سخن دیتے ہیں وہاں بھی اس طرح مخاطب ہوتے ہیں "میرے خیال میں، جہاں تک میں سمجھتا ہوں، جہاں تک خیال کیا جاتا ہے" وغیرہ لکھتے ہیں۔

خط میں براہ راست گفتگو ہوتی ہے اس لیے تصنع اور ملاوٹ سے خط خط نہیں رہتا جب ہم حالی کے خطوط

کو اس معیار پر پرکھتے ہیں تو وہ نہ تو بناوٹ سے کام لیتے ہیں اور نہ ہی تصنع برتتے ہیں۔ کیونکہ ایسے بیانات یا خطوط مبالغہ آرائی پر مبنی ہوتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر عبدلقیوم:

''سرسید اور حالی ادبی لطافتیں پیدا کرنے کے خلاف نہیں لیکن ان کے یہاں ادبی صناعیاں سماجی، فلاح و بہبود کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہیں اور زندگی کے مسائل اور معاشرت کی پیچیدگیوں کو حل کرنے کے لیے مستعمل ہوتی ہیں وہ محض ادب لطیف پیدا کرنے اور ذہنی آسودگی کی طرف متوجہ نہیں اس لیے ان بزرگوں کے خطوط اپنے اندر وہ خصوصیات نہیں رکھتے جو خطوں کو مقالے سے الگ کرتے ہیں۔

سرسید کے خط دراصل حالی کے مقابلے میں بھی شخصی اثر سے خالی ہیں۔''

آگے مزید لکھتے ہیں:

''حالی کے خطوں میں ذاتی تعلقات، خاندانی کیفیات، رشتہ داروں کی پریشانیوں، باپ بیٹے کے رشتے اور گھریلو معاملات کا ذکر بھی خاصا ملتا ہے جو ان کو سرسید سے کسی قدر الگ بھی کر دیتا ہے۔''(۳۰)

خطوط لکھنے والے کی زندگی کے آئینہ دار بھی ہوتے ہیں اور اس کی شخصیت کی اصلی تصویر بھی سامنے لاتے ہیں۔ مولانا حالی کے خطوط بھی ان کی اصلی صورت پیش کرتے ہیں ان کی شخصیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ حالی کے خطوط میں شکایات زمانہ اور مخالفت کا عنصر نظر نہیں آتا بلکہ خیر کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔ حالی کی شفقت و ہمدردی، دردمندی، بھلائی، خیر خواہی، آل اولاد، اساتذہ و رشتہ داروں سے پیار و محبت اردو ادب میں ایک روایت کی صورت اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مثلاً ایک خط میں اپنی پوتی کو لکھتے ہیں:

''کیا اچھی بات ہو کہ تم وہاں سے ایسی موٹی تازی ہو کر آؤ کہ یہاں تمہیں کوئی پہچان نہ سکے اور تم قسمیں کھا کھا کر یقین دلاؤ کہ میں وہی ہوں۔''(۳۱)

حالی کے خطوط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مکتوباتی اسلوب میں بے ربط تحریر نہیں لکھتے۔ بلکہ ایک واضح اور صاف ستھرا انداز بیان سامنے آتا ہے۔ جو قاری کی طبع پر گراں نہیں گزرتا۔ وہ سرکاری مراعات و اعزازات کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ ان کو بوجھ سمجھتے تھے۔ برنارڈ شا کے قول کے مطابق: ''خطابات اوسط درجے کے انسان کو مشہور بنا دیتے ہیں، برتر انسان کو پریشان کرتے ہیں اور کم تر انسان ان کی بے حرمتی کرتے ہیں۔'' (۳۲)

مولانا حالی اپنے خطوط میں نہ تو ہم عصر لوگوں پر تنقید کرتے ہیں اور نہ مخالفت بلکہ ان کے خطوط میں عزت و احترام اور رواداری کے جذبات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے شاگردوں اور اپنے سے چھوٹے لوگوں کو بھی پیار محبت سے مخاطب کرتے ہیں اور انھیں عزت و احترام دیتے ہیں ان کے اعتراضات کا جواب خندہ پیشانی سے دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقیوم حالی کی ان صفات کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حالی کی شخصیت کا سب سے اہم جزو ان کی انصاف پسندی اور معقولیت تھی۔ یہ دونوں صفات آدمیت کا جوہر ہیں یہ جس قدر ضروری ہیں اس قدر عنقا بھی ہیں۔ چند خاصان خدا ضرور ہوتے ہیں جنھیں یہ صفات ملتی ہیں۔ مہدی نے حالؔی اور شبؔلی کی معاصرانہ چشمک لکھی ہے حالؔی کی کسی سے کیا چشمک ہوتی۔ یہ مہدی کے رنگین قلم کی گل کاریاں ہیں شبلی کے اعتراف کے لیے ہر جگہ حالی کا وسیع قلب کھلا ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شبلی ''حیات جاوید'' کو کذب و افترا کا آئینہ کہتے ہیں لیکن حالی شبلی کی تصانیف کو سراہتے ہیں۔'' (۳۳)

ان کے وہ خطوط جو انھوں نے محسن الملک، حبیب الرحمٰن شہروانی، مولوی عبد الحق، حافظ محمد یعقوب مجددی، مولوی محبوب عالم، مولانا ظفر علی خان، مولوی یحیٰ تنہا کو لکھے ہیں ان میں محبت و خلوص کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ خطوط وہ انھوں نے مولوی عبدالحق کو لکھے ہیں اور جن کی تعداد حالی کے مکتوب الیہ میں سب سے زیادہ ہے انھوں نے ۱۴۱ خط مولوی عبدالحق کو لکھے۔ جن میں مختلف قسم کی کتب اور مضامین کا ذکر بھی ملتا ہے ان میں وہ مولوی

عبدالحق سے دل کی باتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ایک خط میں لکھتے ہیں:''مجھے بے سرو پا مدح سرائی اور بھٹئی کرنی بالکل نہیں آتی۔''(۴۴)

حالی کے مکاتیب ابلاغ کا مقصد بطریق احسن پورا کرتے ہیں۔حالی جملوں کی ساخت پر خاص توجہ دیتے ہیں۔وہ بے ربط نہیں ہوتے۔ان کا طرزتحریر عام فہم اور سادہ ہے جو ان کے مقصد کو پورا کرتا ہے۔حالی کا انداز بیان پڑھنے والوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور اسے سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی۔ان کی نثر صاف اور واضح ہوتی ہے۔

مکاتیب حالی میں حالی کی نثر کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ سید اکبر علی اکبرآبادی ایڈیٹر رسالہ ادیب فیروز آباد کو لکھتے ہیں:

''ادیب کا پہلا نمبر پہنچا۔ایک ہی جلسہ میں اس کو اول تا آخر پڑھ گیا اور بہت محظوظ ہوا۔ظاہراً یہ رسالہ ہونہار معلوم ہوتا ہے۔

خاکسار

الطاف حسین حالی''(۴۵)

۲۔ مولوی حمیدالدین بی۔اے کے نام لکھتے ہیں:

''شمس العلماء کا خطاب ملنے پر جس گرمجوشی اور مسرت کے ساتھ آپ نے خاکسار کو مبارک باد دی ہے اس کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتا ہوں اور اس کو اپنے لیے دستاویز فخر و امتیاز سمجھتا ہوں۔

میں آج کل حد سے زیادہ عدیم الفرصت ہوں نہ کسی تصنیف یا تالیف کے سبب بلکہ بعض مکروہاتِ خانگی کی وجہ سے ورنہ آپ کا شکریہ ایسا سرسری طور پر معمولی الفاظ میں ہرگز نہ لکھتا۔زیادہ نیاز

الطاف حسین حالی''(۴۶)

۳۔ بنام مولوی سید امام الدین

''مکرمی مولوی صاحب تسلیم!

خط پہنچا مسرت حاصل ہوئی۔ دلیل رہبر و راہنما کے معنی میں آتا ہے۔ اور منطق کی اصطلاح یا علم مناظرہ میں دلیل وہ ہے جس کے جاننے سے کسی اور چیز کا جاننا لازم آئے۔ اطبا کی اصطلاح میں قارورہ کو بھی کہتے ہیں۔ علم مناظرہ کی اصطلاح اردو میں کثیر الاستعمال ہے اور لغوی معنی ہیں یعنی رہبر و رہنما کے معنی میں بھی فصیح ہے مگر کثیر الاستعمال نہیں ہے۔ علماء ہی سے استعمال مخصوص ہے۔ تابعدار غلط ہے صرف تابع یا فرماں بردار کہنا چاہیے کیونکہ تابعدار کے معنی تابع رکھنے والے کے ہیں۔ گویا مخدوم ہو گیا نہ کہ خادم فصحا کے کلام میں کہیں نہیں آیا ہے۔ عوام اور جہلا کی زبان پر اکثر جاری ہے۔ غلط العام صحیح کا قاعدہ فصحا جائز نہیں سمجھتے۔ فقط

الطاف حسین حالی

۲ فروری ۱۹۰۷ء''(۴۷)

۴۔ مولوی عبدالحق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں آپ کے ریمارکس کا جو آپ نے میری نثر کی نسبت کیے ہیں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں مگر سچ یہ ہے کہ ہماری اور ہمارے ہمعصروں کو نظم و نثر پر صحیح رائیں اس وقت تک جب تک کہ ہم اور ہمارے طرفدار یا ہمارے مخالف دنیا میں موجود ہیں قائم نہیں ہو سکتیں بلکہ خود ہم میں سے کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے اسٹائل میں کونسی ایسی خوبی ہے جس کی وجہ سے وہ اس کو اوروں کی طرز پر ترجیح دے سکتا ہے۔''(۴۸)

درج بالا خطوط میں مولانا حالؔی کے طرزِ تحریر کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں نہ تصنع ہے اور نہ بناوٹ۔ بے تکلفی سچائی اور خلوص نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ابلاغ کا آسان اور اہم ذریعہ بنتے ہیں۔ جملوں میں خوبصورتی اور پختگی ہے جو قاری کو پڑھتے ہوئے لطف دیتی ہے۔ البتہ انگریزی الفاظ کا استعمال بسا اوقات قاری کو کھٹکتا ہے۔ مثلاً محمود احمد عباسی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ آپ کو پرسنل اسسٹنٹی پر لے لیا گیا ہے وغیرہ۔ الفاظ کا زیادہ استعمال قاری کو گراں گزرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، حالی کی اردو نثر نگاری، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۶۵۹

۲۔ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، مرتب، طیف نثر، لاہور اکیڈمی لاہور، ص ۲۸

۳۔ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، مرتب، طیف نثر، ص ۲۹

۴۔ سکسینہ رام بابو، تاریخ ادب اردو، عشرت پبلشنگ ہاؤس ہسپتال روڈ لاہور، ص ۶۴۴

۵۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، حالی کی اردو نثر نگاری، مجلسِ ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۶۶۶

۶۔ شجاعت علی سندیلوی، مطالعہ حالی، سرفراز قومی پریس نادان محل روڈ لاہور، ۱۹۵۶ء، ص ۲۳۸

۷۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، حالی کی اردو نثر نگاری، ۱۹۶۴ء، ص ۶۶۶

۸۔ حالی، الطاف حسین، مکتوبات حالی، حصہ اول، مرتب خواجہ سجاد حسین، حالی پریس پانی پت، ۱۹۲۵ء

۹۔ ممتاز حسین، پروفیسر، حالی کے شعری نظریات ایک تنقیدی مطالعہ، سعد پبلی کیشنز ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۷

۱۰۔ حامدی کشمیری، ڈاکٹر، حالی کا اسلوب نثر، مشمولہ تحقیق ادب، شمارہ ۴، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ص ۱۷

۱۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، میر امن سے عبدالحق تک، مجلسِ ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۱۴۷

۱۲۔ شاہ علی سید، ڈاکٹر، اردو میں سوانح نگاری، گلڈ پبلشنگ ہاؤس کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۱۸۵

۱۳۔ وارث علوی، حالی، مقدمہ اور ہم، ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳

۱۴۔ حالی، الطاف حسین، مکتوبات حالی، حصہ اول، مرتب خواجہ سجاد حسین، ص ۱۱۸

۱۵۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، میر امن سے عبدالحق تک، ص ۱۴۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۴۸

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۵۰

۱۸۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، حالی کی اردو نثر نگاری،مجلسِ ترقی ادب لاہور،۱۹۶۴ء،ص ۶۵۲

۱۹۔ حامدی کشمیری، حالی کا اسلوب نثر،مشمولہ تخلیق ادب،شمارہ ۴، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد،ص ۱۹

۲۰۔ عبدالحق مولوی، ڈاکٹر، افکارِ حالی، انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی،۱۹۷۶ء،ص ۹۴

۲۱۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، اردو کا بہترین انشائی ادب، میری لائبریری چوک مینار، انار کلی لاہور،۱۹۶۲ء،ص ۱۰۵

۲۲۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، میر امن سے عبدالحق تک،ص ۱۲۱

۲۳۔ ایضاً،ص ۱۳۴

۲۴۔ ایضاً،ص ۱۲۴

۲۵۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، سرسید احمد خان اوران کے رفقا کی نثر کا فنی اورفکری جائزہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد،
س ۔ن،ص ۱۱۲

۲۶۔ مکتوبات حالی حصہ دوم،مرتب،خواجہ سجاد حسین، حالی پریس پانی پت، ۱۹۲۵ء،ص ۲۷

۲۷۔ صالحہ عابد حسین، یادگار حالی، ارسلان بکس علامہ اقبال روڈ میر پور آزاد کشمیر،ص ۲۳۱

۲۸۔ صالحہ عابد حسین، یادگار حالی،ص ۲۴۴

۲۹۔ حالی، الطاف حسین، مکاتیب حالی،مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، اردو مرکز گپت روڈ لاہور، اردو اکیڈمی سندھ
کراچی،۱۹۵۰ء،ص ۳۲

۳۰۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، حالی کی اردو نثر نگاری،مجلس ترقی ادب لاہور،ص ۶۲۳

۳۱۔ مکتوبات حالی حصہ اول،مرتب خواجہ سجاد حسین، حالی پریس پانی پت،خط بنام پوتی ولات، ۱۹۲۵ء

۳۲۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، حالی کی اردو نثر نگاری،ص ۶۳۰

۳۳۔ ایضاً،ص ۶۳۱

۳۴۔ مکتوباتِ حالی حصہ اول،مرتب خواجہ سجاد حسین، حالی پریس پانی پت، ۱۹۲۵ء،ص

۳۵۔ حالی، الطاف حسین، مکاتیب حالی،مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، اردو مرکز گپت روڈ لاہور،۱۹۵۰ء،ص ۲۴

۳۶۔ ایضاً،ص۶۰

۳۷۔ ایضاً،۷۶

۳۸۔ حالی،الطاف حسین،مکتوبات حالی،حصہ اول،مرتب خواجہ سجاد حسین،حالی پریس پانی پت،۱۹۲۵ء،ص۳۲

باب ششم

حالی کے مکتوب الیہ

آغا شاعر دہلوی

آغا شاعر دہلوی کا پورا نام آغا مظفر بیگ قزلباش تھا اور شاعر تخلص کرتے تھے ۔۱۸۷۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ۔اسی نسبت سے دہلوی کہلائے ۔ابتدائی تعلیم دہلی میں حاصل کی۔ شاعری میں داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی اور داغ سکول کے ممتاز اور منفرد شاعر سمجھے جاتے ہیں ۔تلاش روزگار میں حیدر آباد دکن آ گئے اور اپنے استاد داغ دہلوی کی سفارش پر مہاراجہ برکش پرشاد کی ڈیوڑھی میں ملازم ہوئے ۔اس وقت ان کی عمر تیں برس تھی، آغا شاعر کی شخصیت کے متعلق شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

> ''سید و شہاب رنگ، کھلی پیشانی، غلافی آنکھیں جن میں سرخ ڈورے پڑے ہوئے بڑی بڑی مونچھیں گٹھی ہوئی ڈاڑھی دوہرا ڈیل جھوم کر چلتے تھے جہاں سے گزر جاتے تھے انھیں لوگ دیکھتے رہ جاتے تھے ۔ایسے مردانہ حسن و وجاہت کو آغا صاحب کی رنگین مزاجی نے اور بھی نکھار دیا تھا۔ بے حد خوش گفتار اس پر غضب ان کی شاعری کی دھوم لوگ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے ۔جس محفل میں آغا صاحب بیٹھ جاتے وہاں پھر کسی کو دم مارنے کی ہمت نہ ہوتی ۔ان کا انداز گلفشانی گفتار، سامعین کو ہمہ تن گوش بنا دیتا تھا۔شعر خوانی کا انداز بھی سب سے جداگانہ تھا۔ بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ جس نے فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کو نہ سنا ہو افسر الشعراء آغا شاعر قزلباش کو سن لے ۔''(۱)

آغا شاعر بہت خوش گفتار اور ملنسار شخص تھے ۔وہ ایک شاعر مترجم، ڈراما نگار کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں انھوں نے عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ بھی کیا۔وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے ۔ بقول ڈاکٹر

عبادت بریلوی:

''انھوں نے شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔غزل اور نظم دونوں پر انھیں یکساں قدرت حاصل تھی، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ غزل کی صنف سے وہ ایک ذہنی مطابقت رکھتے تھے۔غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی نشو نما غزل ہی کی روایت کے زیر سایہ ہوئی تھی اور اس روایت کے اثرات ان کے مزاج میں کچھ اس طرح رچ بس گئے تھے کہ دونوں میں ایک مخصوص ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔''(۲)

کچھ عرصہ بعد وہ حیدر آباد سے کلکتہ چلے گئے اور مختلف کمپنیوں کے لیے کئی ایک ناٹک لکھے۔وہ ریاست جھالا واڑ کے دربار سے بحیثیت درباری شاعر بھی منسلک رہے وہیں پر انھوں نے رباعیات عمر خیام کا منظوم ترجمہ کیا اور اپنی فنی مہارت کے جوہر دکھائے انھوں نے شاعری کے علاوہ کئی ایک یادگار تصانیف چھوڑی ہیں جن میں ان کا مشہور ڈرامہ ''قتلِ بے نظیر'' بہت اہم ہے اس کے علاہ دامنِ مریم، آویزش گوش ان کی تخلیقات میں شامل ہے۔ان کا پہلا دیوان ''تیرونشتر'' کے نام سے ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔جوان کی شاعرانہ عظمت کا شاہکار ہے۔آغا شاعر کا بڑا کارنامہ قرآن مجید کا منظوم ترجمہ ہے جس کے تین پارے شائع ہوئے باقی غیر مطبوعہ ہے۔

آغا شاعر مذہبی و اخلاقی اقدار کے آدمی تھے چنانچہ انھوں نے لوگوں کے لیے عام فہم اور سادہ زبان میں قرآنِ مجید کا منظوم ترجمہ کی صورت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔قرآن پاک کے منظوم ترجمہ کی وجہ جمیل الدین صدیقی اس طرح بیان کرتے ہیں:

''رات کو خواب میں دیکھتے ہیں کہ مسجد میں حوض کے کنارے وضو کر رہے ہیں کلی کرتے ہوئے بجائے پانی کے منہ سے ننھی ننھی سرخ سپید سبز رنگ کے چڑیاں نکل کر اڑ رہی ہیں اور خوش الحانی سے مترنم ہیں۔اس کی تعبیر انھوں نے یہ کی کہ فال نیک ہے اور بسم اللہ کہہ کر کلام پاک نظم میں ترجمہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔''(۳)

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہے نام سے خدا کے آغاز کا (اجالا)

جو مہربان بڑا ہے بے حد جو رحم والا

مالک یوم الدین ایاک نعبدو وایاک نستعین

محشر کے دن کا مالک (روز جزا کا والی)

تجھ ہی کو پوجتے ہیں ہم تیرے ہی سوالی

اس ترجمے کو آغا شاعر نے اپنی زندگی میں ہی مکمل کیا اس کی ترتیب کچھ اس طرح رکھی کہ عربی آیت کے بعد شاہ عبدالقادر کا نثری ترجمہ اس کے بعد منظوم ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری کے چند نمونے درج ذیل ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

مجھ کو آتا ہے تیمّم نہ وضو آتا ہے
سجدہ کر لیتا ہوں جب سامنے تو آتا ہے

مٹتے مٹتے بھی محبت کا نشان رہتا ہے
بجھتے بجھتے بھی سر شمع دھواں رہتا ہے

مسافران عدم کس زمیں پہ جاتے ہیں
کسی کو گور کے آگے پتہ نہیں چلتا (۴)

اپنے استاد داغ دہلوی کی وفات کو انھوں نے شدت سے محسوس کیا جس کا اظہار ان کے اس شعر سے ہوتا ہے:

شاعر کسے دکھاؤں غزل ہائے کیا کروں
میرے تو دل سے جا نہیں سکتا ہے داغ داغ

قرآن پاک کے منظوم ترجمے کے متعلق کچھ اہل علم و ادب کی آرا ملاحظہ فرمائیے۔

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''آپ کا پہلا خط اور پارہ سیقول کا منظوم ترجمہ پہنچ گیا جواب اس لیے ابھی تک نہیں دیا تھا کہ میں ترجمے کو پڑھ لوں تو لکھوں اب میں نے وہ منظوم ترجمہ دیکھ لیا۔ بے شک ترجمہ اچھا ہے اور بہت احتیاط سے کیا گیا ہے۔''(۵)

خواجہ حسن نظامی دہلوی کے بقول:

''آج جناب آغا شاعر نے ایک عجیب و غریب چیز سنائی یعنی قرآن پاک کا منظوم اردو ترجمہ۔ نہایت شریں، با محاورہ اور موثر فقرے ہیں لیکن بعض مقامات پر سیاق عبارت الٰہی کی پیروی میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ جن کے لیے میں نثر کا ترجمہ شامل کرنے کی صلاح دیتا ہوں۔''(۶)

مفتی عبدالقدیر قادری بدایونی لکھتے ہیں:

''آغا شاعر صاحب دہلوی جنھوں نے منظوم ترجمہ ''کلام مجید'' کیا ہے اردو شاعری میں بلند پایہ رکھتے ہیں۔ وہ محتاج بیان نہیں مجھے امید ہے کہ وہ اس سے ضرور کامیاب ہوں گے۔''(۷)

منظوم ترجمہ کے علاوہ ان کی تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ تیر و نشتر

۲۔ حکمدہ قیام

۳۔ گلگونہ شہادت واقعہ کربلا پر ایک نثری تصنیف، مطبوعہ یوسفی پریس دہلی ۱۹۱۵ء

۴۔ خمارستان، مجموعہ نثر، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

۵۔ ہمارا آسماں شائع کردہ فیروز سنز لاہور

۶۔ بلیدنِ فارس (ایرانی شعرا کے کلام کا ترجمہ) از فیروز سنز لاہور

۷۔ آویزش گوش، خواتین کے لیے

۸۔ شعلہ جوالہ (ناول)

۹۔ قتل بے نظیر (ڈرامہ)

۱۰۔ حورِ جنت (ڈرامہ)

۱۱۔ روح نغمہ غزلیات گیت وغیرہ

۱۲۔ انورو رقیہ

۱۳۔ پہلی دمشق آزاد بک ڈپو لاہور

۱۴۔ ارمان (ناول)

اس کے علاوہ وہ کئی ایک اخبارات و رسائل کے مدیر بھی رہے۔مولانا حالی سے جب انھوں نے کسی علمی و ادبی نقطہ کی وضاحت کی استدعا کی تو مولانا نے جو خط لکھا وہ درج ذیل ہے:

آغا صاحب!

''میری بینائی نے مجھے جواب دے دیا ہے جو کچھ لکھواتا پڑھواتا ہوں وہ بھی دوسروں کی مدد سے دوسرے میں ایک دیہاتی قصباتی آدمی اور آپ دہلی کے رہنے والے دریافت فرماتے ہیں مجھ سے آپ خود اہلِ زبان ہیں۔ بنی و بین اللہ۔

خاکسار

الطاف حسین حالی

پانی پت (۸)

جمیل احمد صدیقی ان کی وفات کے متعلق لکھتے ہیں:

''۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو دلی میں عصر و مغرب کے درمیان واصل بحق ہوئے اور آبائی قبرستان متصل صفدر جنگ میں مدفون ہوئے۔''(۹)

جبکہ ڈاکٹر وحید قریشی کے مطابق ان کی تاریخ وفات ۱۹۴۱ء ہے۔ لکھتے ہیں:

''آخری عمر دلی میں گزاری اور وہیں ۱۹۴۱ء میں انتقال کیا۔''(۱۰)

احمد بابا مخدومی، مولوی

مولوی احمد بابا مخدومی ۱۵ جون ۱۸۶۵ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام غیاث الدین تھا جو کشمیر سے نقل مکانی کر کے آئے تھے۔ مولوی احمد بابا مخدومی کو علم و ادب سے خاص لگاؤ تھا اور علم و ادب سے وابستہ افراد کی بہت قدر کیا کرتے تھے۔ آپ انجمنِ حمایتِ اسلام کے بانی ارکان میں شامل تھے اور انجمن کے کئی بڑے اہم عہدوں پر بھی فائز رہے۔ اپنی عمر کی مشہور شخصیات کے ساتھ خط و کتابت تھی جن میں مولانا حالی بھی شامل تھے۔ انھوں نے مولوی امام الدین گجراتی کے ساتھ مل کر ایک کتاب الفتح فی ولادت مع کے نام سے لکھی۔ ۸ جون ۱۹۳۱ء کو ۶۳ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔

امیر مینائی

منشی امیر احمد مینائی اردو کے نامور ادیب اور شاعر تھے۔ غزل، نظم کے علاوہ نعتیہ کلام لکھنے میں بھی شہرت رکھتے تھے۔ ۱۸۲۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ یہ دور نصیر الدین حیدر کا تھا۔ والد کا نام مولوی کرم محمد مینائی تھا۔ آپ کا تعلق مخدوم شاہ مینا کے خاندان سے تھا جن کا مزار لکھنؤ میں ہے اور ہر خاص و عام کے لیے چشمہ فیض ہے۔ اسی نسبت سے مینائی کہلائے۔

میر کہ خواہند چشم! بینا کنند
سرمہ خاک در مینا کنند

ابتدائی تعلیم مفتی سعد اللہ مرحوم سے حاصل کی۔ مفتی سعد اللہ عربی، فارسی میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ وہ خاندان صابریہ چشتیہ کے سجادہ نشین امیر شاہ صاحب کے مرید تھے۔ منشی امیر مینائی صوفی منش نہایت سادہ اور منکسر المزاج تھے۔ اس کے ساتھ وضع داری اور علم و فضل کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں سے ممتاز تھے۔ علم طب نجوم سے بھی واقفیت رکھتے۔ شاعری میں منشی مظفر علی اسیر سے اصلاح لیتے تھے انھوں نے جلد ہی اپنی لیاقت اور طبیعت کی روانی کی بنا پر شعراء لکھنؤ میں ممتاز مقام حاصل کر لیا تھا۔ ۱۸۵۲ء میں واجد علی شاہ نے ان کو اپنے دربار میں بلایا اور ان کا کلام سنا۔ انھیں کے حکم سے دو کتابیں ''ارشاد السلطان'' اور ''ہدایت السلطان'' لکھیں اور سلطان سے خلعتِ اور انعام حاصل کیا۔ ۱۸۵۹ء میں رام پور آ گئے۔ بقول سعود الحسن روہیلہ:

''نواب رام پور نے ان سے اپنے شعروں کی اصلاح کرائی۔ امیر مینائی نے میاں امیر شاہ سے سلسلہ چشتیہ صابریہ سے بیعت کی۔ ۱۸۵۷ء سے قبل ایک دیوان تیار ہو گیا تھا جو جنگ میں ضائع ہو گیا اور بعد کا سارا کلام محفوظ ہے۔''(۱۱)

شاعر، ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اردو کے مکتوب نگار بھی تھے ان کے مکتوبات کا مجموعہ ان کے شاگرد احسن اللہ خاں ثاقب مدیر قندِ فارسی نے مرتب کیا۔ یہ خطوط ۱۹۰۱ء میں باہتمام ''دائرہ ادبیہ لکھنؤ''(۱۲) شائع ہوئے۔ جن پر مولانا الطاف حسین حالؔی نے تبصرہ لکھا۔ اقتباس دیکھیے:

''میں کہتا ہوں جب اس کا وجود عنصری خاک میں پنہاں ہو گیا اور اس کے ملنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا۔ اس کی ملاقات محض اس کی خط و کتابت پر منحصر ہے اور بس۔ پس اس کی وفات کے بعد اس کے مکتوبات فراہم کرنا درحقیقت اس کی سوانح عمری کا ایک مہتم بالشان حصہ قلم بند کر دینا ہے۔''(۱۳)

نعت لکھنے کا ان کا ایک منفرد انداز تھا۔

جب مدینے کا مسافر کوئی پاتا ہوں
حسرت آتی ہے وہ جاتا میں رہا جاتا ہوں

امیر مینائی کا رام پور کا زمانہ بڑا یادگار تھا جس کے متعلق رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں۔

''امیر کے قیام رام پور کا زمانہ ان کی شاعری اور اقبال دونوں کے عروج کا زمانہ تھا اس میں ان کو نواب کی استادی کا فخر حاصل ہوا۔ رام پور میں ان کو بڑی عزت حاصل تھی اور وہ ایک بڑی ادبی اور سوشل ہستی سمجھے جاتے تھے۔ تنخواہ بھی معقول تھی جس کی وجہ سے بڑے مزے سے آزادانہ زندگی بسر کرتے اوور شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے۔''(۱۴)

ان کی مشہور تصانیف میں ''انتخاب یادگار خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو رام پور کے اردو شعرا کا تذکرہ ہے۔ اس کے علاوہ وہ ''امیر اللغات'' پر کام کر رہے تھے مگر مکمل نہ ہو سکا اور فرشتہ اجل آ پہنچا۔ ۱۹۱۰ء میں حیدر آباد میں وفات پائی۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۷۳ برس اور دس مہینے تھی۔

درگاہ حضرت یوسف صاحب شریف صاحب کے احاطے میں دفن ہوئے۔ قطعۂ تاریخ ان کے شاگرد جلیل نے لکھا۔

''امیر کشورِ معنٰے امیر مینائی
خدا کے عاشقِ صادق در نبیؐ کے فقیر
گے جو خلد بریں کو تو ان کی تربت پر
لکھا جلیل نے ''روضہ جناب امیر''   (۱۵)

اس کے علاوہ نور تجلی، ابرِ کرم، ذکرِ شاہ، صبح ازل، شامِ ابد، جوہر انتخاب، مجاہد خاتم النبینؐ، خیابانِ آفرینش، صنم خانہ، مراۃ الغیب، خطوط وغیرہ اہم تصانیف ہیں۔

امیر کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں میں بیان کی جاتی ہے جن میں چند ایک یہ ہیں:

محسن کاکوروی، کوثر خیر آبادی، ثاقب، مظفر، حفیظ جونپوری، ناظم، عابد، سرشار، اختر، قمر، اصغر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولوی

مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی بھیکم پور علی گڑھ میں ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے وہ آگرہ کالج کے فارغ التحصیل تھے تعلیم سے فراغت کے بعد تصنیف و تالیف سے منسلک ہو گئے۔ وہ کئی ایک اخبارات اور رسائل میں لکھتے تھے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ تھا جس میں بہت سی نادر و نایاب کتابیں موجود تھیں۔ شروانی صاحب نہایت وجیہہ اور خوبصورت شکل وصورت کے مالک تھے۔ مالک رام نے ان کے حلیے کی تصویر کچھ اس طرح کھینچی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''بہت لانبا قد کوئی چھ فٹ کے قریب، کسرتی جسم، سرخ وسفید رنگت، بڑی بڑی روشن آنکھیں لمبی ستوان ناک خضاب لگی ہوئی بھرواں ڈاڑھی۔ خضاب لگے کچھ دن ہو چکے تھے کیونکہ جڑوں سے سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی جس سے سامنے کے دانت نمایاں ہو گئے تھے اور ان کے پان کے شوق کے غماز تھے۔ جسم پر بند گلے کا شیروانی نما گرم کوٹ اور نیچے غالباً اسی کپڑے کا پاجامہ تھا۔ سر پر ٹوپی تھی اور اس کے اوپر منڈاسے کی شکل میں سپید شال اوڑھے تھے۔ ایسے خوبصورت اور جامہ زیب آدمی میں نے پہلے کم دیکھے تھے۔''(۱۶)

شروانی صاحب نے تین شادیاں کیں تھیں۔ پہلی شادی ان کے چچا عبدالشکور خاں کی صاحب زادی سے ہوئی۔ دوسری شادی ان کے خاندان میں ہوئی جبکہ تیسری شادی عبدالغنی صاحب کی ہمشیرہ سے فرخ آباد میں ہوئی تھی۔ مولانا عبدالغنی صاحب نواب صاحب کے استاد بھی رہے ہیں۔ نواب صاحب نہایت علمی اور ادبی مزاج رکھتے تھے۔ اور اپنے عہد کے تمام اہل علم وادب کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ انھوں نے ''الندوہ'' لکھنؤ کے ایڈیٹر کے طور پر بھی کافی عرصہ کام کیا۔

وہ حیدر آباد میں صدور الصدور امور مذہب بھی رہے۔ مولانا سید سلمان ندوی نے جب حیات شبلی لکھی تو

اس کے مسودے کو دیکھنے کے بعد جابجا اضافے کیے۔ ان کی تصانیف کی تعداد ۲۴ کے قریب ہے۔ ۱۹۲۲ء میں ان کی خدمات کے عوض سرکار نظام سے نواب صدر یار جنگ بہادر کا خطاب ملا ڈیڑھ سال کے عرصہ کے بعد ریٹائرڈ ہو گئے۔ ''علمائے سلف'' اور نابینا علماء ان کی بہت مشہور اور یادگار کتب ہیں وہ جامع عثمانیہ کے پہلے وائس چانسلر تھے۔ مولانا حالی کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم اور خط و کتابت تھی اور آپس میں پیار و محبت کا تعلق تھا۔ مولانا حالی ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''مخدومی! مہمانِ ناخواندہ عزیز تر از مہمانِ خواندہ پہنچا۔
> باوجودیکہ آج کل ضیقِ فرصت کے سبب مطبوعات جدیدہ کے مطالعہ کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔ اُسی حالت میں قریب نصف کے رسالہ ''علمائے سلف'' دیکھ گیا۔ افسوس ہے کہ مجھے اس عمدہ تصنیف پر مفصل ریمارکس کرنے کی فرصت نہیں ہے مگر مختصر یہ ہے کہ اس رسالہ نے میرے دل میں آپ کی محبت اور عظمت بہ نسبت سابق کے اضعاف مضاعفہ کر دی ہے۔ مسلمانوں کے لٹریچر میں اپنی طرز کی یہ پہلی کتاب ہے شاید کوئی ناواقف آدمی یہ کہے مسلمانوں نے فنِ رجال میں ایسی صدہا کتابیں نہیں لکھیں۔ مگر ایسا خیال کرنا سخت غلطی کی بات ہے آپ نے درحقیقت وہ کام کیا ہے جو انگلستان کے مشہور مصنف مسٹر سموئیل نے ''سلف ہلپ'' کے لکھنے میں کیا ہے۔''(۱۷)

مولوی حبیب الرحمٰن شروانی کی یہ کتاب ''علمائے سلف'' بہت مقبول ہوئی۔

مالک رام لکھتے ہیں ''ملاقات میں انھوں نے ڈائری پر جو شعر لکھا وہ کچھ اس طرح تھا:

اے آمدِ تت باعثِ آبادیٔ ما
ذکر تو بود زمزمہ شادیٔ ما (۱۸)

بفرمائش مالک رام صاحب ہر وقت ورودِ مکرر مقام حبیب گنج مجیب الرحمٰن صدر یا جنگ، ۲۷ جنوری ۱۹۰۷ء۔انھوں نے ۸۴ برس عمر پائی اور ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء میں جمعہ کے دن صبح سات بجے وفات پائی

سید احمد دہلوی، مولوی

مولوی سید احمد دہلوی مؤلف ''فرہنگ آصفیہ'' ۱۸۴۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔والد کا نام حافظ سید عبدالرحمٰن تھا جو سادات میں تھے۔اپنی پیدائش کے بارے میں سید احمد دہلوی لکھتے ہیں:

> ''ہم ۹ محرم الحرام ۱۲۶۲ھ بمطابق جنوری ۱۸۴۶ء یوم سہ شنبہ شب شہادت کو بلاقی بیگم کے کوچے میں پیدا ہوئے۔وہیں ہمارا نال گڑا۔اس وقت تک حافظ بہاء الدین صاحب ایک معزز رئیس و ملازم شاہی کے مکان میں ہمارے والدین سکونت پذیر تھے۔چھ سات مہینے بعد شاہ صابر بخش صاحب کے باغ میں موتی بیگم زوجہ میر ظہور علی سے ذاتی مکان خرید کر آن رہے۔''(۱۹)

ابتدائی تعلیم اس وقت کے مشہور اساتذہ سے حاصل کی اور پھر نارمل سکول دہلی میں داخل ہوئے اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئے۔مولوی صاحب کو شروع سے ہی تصنیف و تالیف کا شوق تھا وہ اپنے زمانے کے مشہور اہلِ علم و ادب سے مستفید ہوئے۔۱۸۶۸ء اپنی مشہور تالیف، فرہنگ آصفیہ کا آغاز کیا۔ابھی آپ اس کتاب کی تیاری میں مصروف تھے کہ مسٹر فیلن نے بلا لیا انھوں نے سات برس کی محنت کے بعد فلن کی لغت تیار کی اس کے بعد اپنا کام مکمل کیا۔۱۸۸۰ء میں انھوں نے راجہ الور کا سفر نامہ مرتب کیا۔پھر لاہور آ گئے اور گورنمنٹ بک ڈپو میں نائب مترجم کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔مولوی سید احمد دہلوی ایک محنتی اور محنت پر یقین رکھنے والے انسان تھے۔انھوں نے لاہور، شملہ اور دہلی کے سرکاری سکولوں میں بھی ملازمت کی۔وہ اپنی محنت اور لیاقت کے بل بوتے پر پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن اور فیلو بھی منتخب ہوئے۔۱۱ مئی ۱۹۱۸ء کو دہلی میں وفات پائی۔ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۳۶ کے لگ بھگ ہے لیکن ان کا اصل کارنامہ

''فرہنگ آصفیہ''ہی ہے جس پر انھوں نے اپنی عمر کے پچاس برس صرف کیے۔ان کی ایک اور مشہور تصنیف ''کنز الفوائد'' ہے جس پر انھیں ۲۰۰ (دوصد) روپے انعام ملا جو انھوں نے ''فرہنگ آصفیہ'' کی اشاعت پر صرف کیا۔ فرہنگ آصفیہ کی تالیف کے دوران جو مشکلات ان کو جھیلنا پڑی ان کا ذکر وہ کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''خود ہماری آٹھوں پہر کی روزانہ جھول نشست نے مصائب کے ضمن میں یہ مزید عنائت فرمائی کہ پیٹ بڑھا کر توندل بنا دیا۔ریاحی، بواسیر، ضعفِ مثانہ بہم پہنچا دیا۔معدہ بگاڑ دیا اعصاب کو ڈھیلا کر دیا جس سے چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے گویا تندرست جان کو ایک روگ لگا دیا۔''(۲۰)

سید سلیمان ندوی

سید سلیمان ندوی ضلع پٹنہ کے مشہور قصبہ دیسنہ میں ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم پھلواری اور دربھنگہ کے مدارس میں حاصل کی۔اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا۔مولانا سلیمان ندوی ندوۃ کے قابل اور مشہور طلبا میں شمار ہوتے تھے۔انھوں نے عربی فارسی کے علاوہ مشرقی علوم میں دسترس حاصل کی۔ندوۃ العلماء سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ندوۃ العلماء میں ہی مدرس مقرر ہو گئے۔انھوں نے مولانا شبلی نعمانی کی تربیت خاص میں مختلف علوم حاصل کیے بلکہ وہ شبلی کے جانشین کے طور پر مشہور ہوئے۔ندوۃ العلماء کی مدرسی کے بعد پونہ کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔رام بابو سکسینہ کے بقول:

''مولانا شبلی مرحوم ان سے اپنی زندگی میں بہت محبت رکھتے اور ایک خاص نظر شفقت وعنایت ان پر رکھتے تھے اور اسی وقت وہ اپنی ذہانت اور قابلیت وطباعی کے تمام شاگردوں سے ممتاز تھے۔''(۲۱)

اعظم گڑھ کے دارالمصنفین جن کی بنیاد علامہ شبلی نے رکھی تھی اس کی تعمیر میں علامہ سید سلیمان ندوی نے بھرپور حصہ لیا۔علامہ شبلی نے سیرت النبی کی دو جلدوں کی تکمیل کی ذمہ داری سید سلیمان ندوی کے سپرد کی تھی۔

علامہ ندوی اس خلافت وفد میں بھی شامل تھے جو ۱۹۲۰ء میں انگلینڈ گیا تھا علاوہ ازیں انھوں نے سر راس مسعود اور علامہ اقبال کے ہمراہ کابل کا دورہ بھی کیا۔انھوں نے تعلیمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی حوالے سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔وہ 'الہلال' اور 'ندوۃ' کے ساتھ بھی منسلک رہے۔ان کی تحریریں بڑی جانداری اور اعلیٰ معیار کی حامل ہوتی تھیں۔مولانا ندوی کا مرتبہ بحیثیت مورخ بھی بہت بلند ہے۔

انھوں نے کئی ایک مشہور اور یادگار کتب لکھیں ان کی کتب مذہبی، علمی اور ادبی حوالے سے مستند سمجھی جاتی ہیں۔انھیں عربی، فارسی زبانوں کے علاوہ دیگر علوم پر بھی قدرت حاصل تھی۔ان کی مشہور تصانیف ہیں:

سیرۃ النبیؐ جلد تین سے لے کر چھ تک۔حیات امام مالک، سیرت عائشہؓ، نقشِ سلیمانی، حیات شبلی، خیام، ارض القران کے علاوہ ان کے کئی مقالات، خطبات اور تقاریر اہم ہیں۔۱۳۵۳ھ میں وفات پائی۔

ان کی اپنی کتاب ارض القران کو اہل علم سے بہت زیادہ پذیرائی ملی جس کی اہمیت مشہور ادیب مہدی افادی کے ۹۔دسمبر ۱۹۱۷ء کے لکھے ہوئے خط سے واضح ہوتی ہے:

> ''مجھے حیرت ہے کہ ایک کام جو علمِ آثار کے ایک زبردست ماہر فن کے کرنے کا تھا وہ بھی ساٹھ برس کے بعد کسی یورپ کی اکیڈمی میں بیٹھ کر آپ اس پر کیونکر قابو حاصل کر سکے ہیں عربیت سے زیادہ آپ کی ادبیت سے مرعوب ہو رہا ہوں۔ زبان نفسِ موضوع کے لحاظ سے قطعاً لائق شکایت نہیں یعنی کہیں سے بے جوڑ نہیں ہے اور جب تناسب میں کہیں سے کوئی کسر نہیں تو حسن کی جامعیت میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔''(۲۲)

شبلی نعمانی، علامہ

اردو کے نامور ادیب، سوانح نگار، مورخ، شاعر اور مکتوب نگار علامہ شبلی نعمانی بندول ضلع اعظم گڑھ (یو۔پی) میں ۱۸۸۷ء پیدا ہوئے۔والد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا۔آپ کا نام محمد شبلی رکھا گیا۔بعد میں انھوں نے

شبلی نعمانی اختیار کیا۔ نام میں نعمانی کا اضافہ ان کے استاد مولانا فاروق چڑیا کوٹی نے کیا۔

ابتدائی تعلیم حکیم عبداللہ بیراج پوری سے حاصل کی جو مفتی محمد یوسف اور مولوی سید نذیر حسین دہلوی کے شاگردوں میں سے تھے بعد ازاں مدرسہ عربیہ اعظم گڑھ میں داخل ہوئے۔ یہاں پر انھوں نے مولوی فیض الحسن سہارنپوری اور سخاوت علی جونپوری سے فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد غازی پور میں چلے گئے اور مولانا فاروق چڑیا کوٹی کی شاگردی اختیار کی جو اپنے زمانے کے مشہور شاعر ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفی بھی تھے۔ مولانا شبلی ان کے ذہین اور قابل شاگردوں میں شمار ہوتے تھے اور آپ کے استاد آپ کو بقول سید صباح الدین عبدالرحمٰن اس طرح پکارا کرتے تھے۔

"انا اسد وانت شبلی ...... یعنی میں شیر ہوں تو بچہ شیر" (۲۳)

آپ کو مولانا ارشاد حسین کی شاگردی کا شرف بھی حاصل رہا جو اپنے زمانے کے وسیع النظر اور صاحب کمال بزرگ تھے وہ حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں سے تھے۔ مولانا احمد علی سے حدیث کا درس لیا۔ ۱۸۸۰ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور وکالت کرنے لگے لیکن یہ کام آپ کی طبیعت کے موافق نہ تھا اس لیے چھوڑ کر سرکاری ملازمت اختیار کر لی اس دوران درس وتدریس سے بھی منسلک رہے۔ ۱۸۸۱ء میں وہ اپنے والد کے ہمراہ علی گڑھ گئے جہاں ان کے بھائی مہدی حسن زیر تعلیم تھے۔ علی گڑھ میں سرسید سے ملاقات ہوئی اور علی گڑھ کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ یہ زمانہ ۱۸۹۲ء کا تھا۔ علی گڑھ میں وہ سرسید کی صحبت سے مستفید ہوئے اور سرسید کے ذاتی کتب خانے سے استفادہ کرنے کا موقع بھی ملا۔ سرسید کی وفات کے بعد علی گڑھ کالج سے مستعفی ہو گئے۔ ۱۸۹۳ء میں انھوں نے اعظم گڑھ میں شبلی نیشنل سکول قائم کیا جو بعد میں ڈگری کالج بنا۔ ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی اور بقول ڈاکٹر وحید قریشی:

"۱۹۱۳ء میں علماء کی مخالف کی وجہ سے ندوہ کو چھوڑ دیا۔" (۲۴)

علی گڑھ کالج میں ان کی پروفیسر آرنلڈ (جو بعد میں اقبال کے استاد ہوئے) سے ملاقات ہوئی۔ اس سلسلہ میں رام بابو سکسینہ اپنی کتاب "تاریخ ادب اردو" میں لکھتے ہیں:

''علی گڑھ کے مشہور اسلام دوست پروفیسر آرنلڈ سے ملاقات ہوگئی۔مولانا نے ان سے فرنچ سیکھی اوران کو عربی سکھائی،جس طرح سے مولانا نے نکات بطرز اہل مغرب آرنلڈ صاحب سے حاصل کیے ہوں گے اسی طرح اتفاقاً یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر صاحب اپنی کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' کی اکثر باتوں کے لیے مولانا کے ممنون ہیں۔''(۲۵)

علامہ شبلی نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور بڑی کامیابی کے ساتھ ہر موضوع پر اپنے علمی کمالات دکھائے۔ان کا کمال یہ بھی تھا کہ انھوں نے اسلام کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے کے لیے شاندار خدمات انجام دیں۔ڈاکٹر اے ایچ کوثر رقمطراز ہیں:

''شبلی نے نہ صرف اردو میں تاریخ اور سوانح کے موضوع پر اعلی اور معیاری کتابیں تصنیف کیں بلکہ تنقیدی اور تحقیقی پہلوؤں پر بھی انھوں نے توجہ دی۔قوم کی تباہی کا احساس تو انھیں بھی تھا۔انھوں نے اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لیے ہیروز آف اسلام کا سلسلہ شروع کیا تا کہ مغربی معترضین کے الزامات کا جواب دیا جا سکے۔''(۲۶)

علی گڑھ سے علیحدگی کے بعد انھوں نے ساری زندگی تصنیف تالیف میں گزاری۔ان کی تصانیف و تالیفات کی ایک لمبی فہرست ہے جس میں درج ذیل مشہور اور قابل ذکر ہیں:

سیرت النبیؐ دو جلدیں، الفاروق، سیرۃ النعمان، المامون الغزالی، سوانح مولانا روم، علم الکلام، الکلام، شعر العجم، موازنہ انیس دبیر، مکاتیبِ شبلی (۳ حصے) مقالاتِ شبلی، کلیات شبلی (فارسی) خطوطِ شبلی، دیوانِ شبلی، دستہ گل (شاعری)، امیر خسرو (حیات خسرو) حیاتِ حافظ، بوئے گل، برگ گل، زیب النساء وغیرہ شامل ہیں۔

۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کوراہی ملک عدم ہوئے۔آپ کے شاگردوں میں مولانا ظفر علی خاں، مولوی عبدالحق، سجاد حیدر یلدرم، عزیز مرزا، خواجہ غلام الثقلین، خوشی محمد ناظر، مولوی ہدایت اللہ، سید محفوظ علی بدایونی، عنایت اللہ دہلوی

قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا شبلی اور مولانا حالی ہم عصر تھے اور حالی کے ساتھ ہم عصرانہ چشمک بھی رکھتے تھے جس کا اظہار ان کے اس بیان سے ہوتا ہے:

> ''میں دریا ہوں اور حالی کنواں میرا علم دریا کی طرح وسیع ہے اور حالؔی کے پاس معلومات اگر چہ کم ہیں مگر وہ گہرے ہیں جب تک کافی موادِ تحریر نہ ہو میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔''(۲۷)

لیکن مولانا حالی ہمیشہ ان سے خندہ پیشانی سے پیش آتے اور ان کی قدر کرتے تھے۔

شمس العلماء خاں بہادر مولوی ذکا اللہ

شمس العلماء مولوی ذکا اللہ ۲۰ اپریل ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کا خاندان کئی نسلوں سے علم و ادب کے حوالے سے اپنی شناخت رکھتا ہے۔ بقول سی۔ایف۔اینڈ ریوز:

> ''منشی ذکا اللہ ۲۰ اپریل ۱۸۳۲ء کو ایک ایسے مکان میں پیدا ہوئے جو جامع مسجد دہلی اور قلعہ معلّی کے بیچوں بیچ واقع تھا۔جس خاندان میں وہ پیدا ہوئے تھے وہ کئی نسلوں سے تیمور کے شاہی گھرانے کے لیے قابلِ اعتماد اساتذہ مہیا کرتا رہا تھا۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکرؓ سے جا ملتا تھا جو آنحضرت کے پہلے خلیفہ تھے۔''(۲۸)

مولوی ذکا اللہ کے والد کا نام حافظ ثناء اللہ تھا جبکہ ان کے دادا کا نام حافظ محمد بقا اللہ تھا جو اسلامی علوم میں دسترس رکھتے تھے اور حافظ قرآن تھے۔انھوں نے مولوی ذکا اللہ کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی ان کی توجہ اور خصوصی شفقت کے باعث مولوی ذکا اللہ کو مختلف علوم سے لگاؤ پیدا ہوا۔

سی۔ایف اینڈ ریو حافظ بقا اللہ جو ذکا اللہ کے دادا تھے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حافظ بقا اللہ دہلی بھر میں اپنی دین داری اور تقویٰ کے لیے مشہور تھے۔ بہتر برس تک انھوں نے ایک دن بھی شاہی مسجد کی نماز با جماعت ناغہ نہیں کی۔ آخر میں وہ جامع مسجد میں نماز میں مشغول تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا اس بنا پر لوگ انھیں ولی سمجھنے لگے تھے اور ان کی وفات کے بعد ان کی یاد عرصہ دراز تک قائم رہی۔''(۲۹)

مولوی ذکاءاللہ بارہ برس کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے دہلی کالج میں ان کے ہم عصروں میں مولوی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد شامل تھے۔ دہلی کالج میں انھوں عربی اور فارسی اس زمانے کے مشہور استاد امام بخش صہبائی سے پڑی جبکہ ریاضی میں ان کے استاد ماسٹر رام چندر تھے جن سے ان کو خاص عقیدت تھی اور وہ بڑے احترام اور محبت کے ساتھ ان اساتذہ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ امام بخش صہبائی جب سر سید احمد خاں ''آثار الصنادید'' لکھ رہے تھے تو ان معاونت کرتے تھے دہلی کالج میں مولوی ذکاءاللہ نے ریاضیات میں خاص مہارت حاصل کر لی وہ پروفیسر رام چندر کے نہایت ہونہار اور ممتاز شاگردوں میں شمار ہونے لگے۔ پروفیسر رام چندر کو بھی ان سے خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے سترہ سال کی عمر میں اردو میں ریاضی پر پہلی کتاب لکھکر شائع کی اور دہلی کے لوگوں کو حیران کر دیا اس کا پہلا ایڈیشن پر صرف چار دنوں میں بک گیا اور اس پر بتیس ۳۲ روپے حاصل ہوئے جو ان کو اپنی تحریروں سے حاصل ہونے والی پہلی رقم تھی اور یہ ان کی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہے وہ اپنی ریاضی دانی کی وجہ سے ہندوستان میں مشہور تھے۔

اس سلسلے میں شمس العلماء ماسٹر مولوی نذیر احمد جو دہلی کالج میں مولوی ذکاءاللہ کے ہم جماعت تھے کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں:

''مولوی ذکاءاللہ کے ساتھ میرا ربط و ضبط بچپن سے شروع ہوا، جبکہ وہ دہلی کالج (یادش بخیر) کی فارسی جماعت میں تھے اور میں عربی میں۔ بایں ہمہ ہم ریاضیات میں بھی ہم سبق تھے۔ ماسٹر رام چندر مرحوم کے شاگردوں میں مولوی ذکاءاللہ کی طبیعت کو ریاضیات کے ساتھ خداداد مناسبت تھی اور وہ جماعت میں سب سے

پیش پیش رہتے تھے اور اسی وجہ سے وہ ماسٹر صاحب کے (جو اپنے دور کے سب
سے بڑے ریاضی دان تھے) منظور نظر بھی تھے۔''(۳۰)

مولوی ذکاءاللہ کالج سے فارغ ہونے کے بعد اسی کالج میں ریاضی کے استاد مقرر ہوئے۔ بعد ازاں وہ آگرہ کالج میں سات سال تک اردو اور فارسی کے پروفیسر رہے۔ وہ علم ریاضی کے ساتھ ساتھ اردو اور فارسی میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز ہوئے اور تقریباً گیارہ سال تک اس عہدے پر کام کرتے رہے۔

تسخیر دلی کے وقت میں دہلی میں تھے مولوی امام بخش صہبائی جوان کے استاد تھے اور جنھوں نے دہلی کی نشاۃ ثانیہ اور علمی ترقی میں بھرپور حصہ لیا تھا کے قتل کا واقعہ بڑا افسوس ناک اور دردانگیز تھا یہ صدمہ مولوی ذکاءاللہ بڑی شدت سے محسوس کرتے تھے۔ لیکن وہ خود محفوظ رہے۔ ۱۸۶۶ء میں اورینٹل کالج لاہور کے لیے بھی نامزد ہوئے لیکن انھوں نے میور سنٹرل کالج الہ آباد میں پروفیسر برائے عربی و فارسی کی حیثیت تعیناتی کو ترجیح دی۔ تقریباً ۲۹ برس ملازمت کرنے کے بعد ریٹائرڈ ہوئے اور بقیہ عمر تصنیف و تالیف میں گزاری۔

انھوں نے بغیر کسی استاد کے انگریزی میں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ ایک ریاضی دان، مورخ، مترجم اور استاد کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ انھیں مختلف علوم میں دسترس حاصل تھی۔ بقول ڈاکٹر سید سجاد احمد دہلوی:

''منشی ذکاءاللہ نے ایسے زمانے میں آنکھ کھولی تھی جبکہ پرانے تمدن اور پرانے علوم و
فن کا چراغ گل ہو رہا تھا اور نئے دور کی تعلیم و ضوابط کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔
اس لحاظ سے ان کی سیرت اور احوالِ زندگی میں قدیم و جدید دونوں دوروں کی
ایک دل فریب اور نادر تصویر نظر آتی ہے۔''(۳۱)

اپنی زندگی کے آخری ایام میں بہت زیادہ کمزوری محسوس کرتے تھے۔ دسمبر ۱۹۱۰ء میں دہلی میں وفات پائی۔
ان کی تصانیف کی تعداد کم و بیش ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہے۔ ان کی مشہور کتاب ''تاریخ ہندوستان'' دس

جلدوں پر مشتمل ہے۔ڈاکٹر اے اچ کوثر کے مطابق:

''محمد یحییٰ تنہا اور حامد حسن قادری نے ذکا اللہ کی کتابوں کی تعداد ۱۴۳ بتائی ہے حالانکہ کتابوں کی کم از کم تعداد ایک سو ساٹھ تھی:

مضمون	مطبوعہ	غیر مطبوعہ	جملہ
ریاضیات	۸۱	٦	۸۷
تاریخ وجغرافیہ	۱۷	۱	۱۸
علم وادب	۱٦	x	۱٦
طبیعات و ہیت	۷	۲	۹
سیاست ۲	۵		۷'' (۳۲)

زندگی کے آخری ایام میں تاریخ اسلام لکھ رہے تھے کہ ملک عدم سے بلاوا آ گیا۔

شیخ اسماعیل پانی پتی کے بقول:

''نثر اردو کی درستی میں سرسید کے ساتھ شمس العلماء مولانا ذکا اللہ ان کے لائق فرزند مولوی عنایت اللہ، شمس العلماء مولانا نذیر احمد، شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی، نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی اور مولوی سید وحید الدین سلیم ان بزرگوں نے جو بہترین ادب پیدا کیا اور جو بے مثال کتابیں مختلف علوم وفنون کی لکھیں وہ آج بھی ہر شخص سے خراج تحسین وصول کر رہی ہیں۔ شمس العلماء مولانا حالی کی نثری تصانیف بھی انہی باکمال انشا پردازوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں۔'' (۳۳)

ڈاکٹر اینڈر یوز کے بقول:

''منشی ذکا اللہ کی وفات سے تقریباً تین ہفتے پیشتر ان کے ایک اور دوست خواجہ الطاف حسین حالی جو دہلی کی نشاۃ ثانیہ میں اردو شعراء کی جماعت میں سب سے

آگئے تھے ان سے ملنے کے لیے پانی پت سے دہلی آئے۔ ذکا اللہ سے بغل گیر ہوئے اور نہایت شفقت کا برتاؤ کیا۔ دونوں بوڑھے دوست بہت دیر تک ساتھ بیٹھ کر بات چیت کرتے رہے اور اسی اثنا میں انھوں نے حالی کے سامنے مولوی سمیع اللہ خاں کا تذکرہ پیش کیا جو ان دونوں کے بہت گہرے گہرے دوست تھے۔ حالیؔ سے مخاطب ہوکر انھوں نے فرمایا ''یہ تذکرہ میری آخری تصنیف اس نے مجھے مار ڈالا ہے......

یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور دونوں دوست اس دنیا میں پھر کبھی نہیں ملے۔''(۴۴)

مولوی ذکا اللہ نے تمام عمر اچھی صحت کے ساتھ گزاری نیز ان کے معمولاتِ زندگی بڑے زبردست تھے۔ بقول عبدالرزاق کانپوری:

''چراغ یا شمع کی روشنی میں تمام عمر ایک صفحہ بھی نہیں لکھا ٹھیک ۹ بجے سو جاتے تھے ان کی طویل حیات اور بہترین صحت کا یہی راز تھا کیونکہ تمام عمر ان کو بخار تک نہیں آیا اور ان کی یہ صحت دوستوں کے لیے قابلِ رشک تھی۔ آخیر عمر تک زندہ دل اور ظریف رہے۔ گفتگو نہایت خندہ پیشانی سے کرتے تھے۔ سال میں دو ایک مرتبہ قوالی بھی سنتے تھے یہ تصوف کا رنگ تھا۔''(۴۵)

مزید لکھتے ہیں:

''مجھ پر ہمیشہ مہربان رہے اور ۱۸۹۷ء میں ''البرامکہ'' پر سب سے پہلے ایک ریویو لکھا جو ان کی بہترین یادگار ہے جس کا شکریہ ادا نہیں ہوسکتا۔''

شمس العلماء سید ممتاز علی

مولوی سید ممتاز علی ۲۷ ستمبر ۱۸۶۰ء میں دیوبند اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم اس وقت کے مشہور علماء کرام مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب سے حاصل کی۔ جو اپنے زمانے کے مستند اور ماہر استاد تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن آپ کے ہم مکتب تھے۔ ۱۸۷۴ء میں لاہور آ گئے۔ پہلے گورنمنٹ ہائی سکول اور اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ بقول ڈاکٹر گوہر نوشاہی:

> ''ایف اے پاس کرنے کے بعد بی اے کے امتحان میں ناکام ہوئے اور ۱۸۸۴ء میں پنجاب چیف کورٹ میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۹۱ء میں علالت کے سبب ملازمت سے مستعفی ہو گئے......''(۳۶)

مولوی سید ممتاز علی نے تقریباً دس سال ہائی کورٹ میں ملازمت کی پھر صحافت کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ انھوں نے بچوں کے لیے ''پھول'' اور عورتوں کے لیے ''تہذیب نسواں'' جیسے مشہور اخبار نکالے۔ ''تہذیب نسواں'' مشہور اخبار تھا جس میں عورتوں کے مسائل بیان کیے جاتے تھے۔ عورتوں کی تخلیقات اس میں شامل ہوتی تھیں۔ ۱۸۸۸ء میں مولوی سید ممتاز علی کی شادی مولوی معراج الدین کی بیٹی حمیدہ بیگم سے ہوئی جو کہ لاہور کے رہنے والے تھے اور شعر و شاعری کا مزاج رکھتے تھے۔ حمیدہ بیگم سے ایک بیٹی اور ایک بیٹا پیدا ہوا۔ بیٹی کا نام وحیدہ بیگم اور بیٹے کا نام سید حمید علی تھا۔ حمیدہ بیگم ۱۸۹۵ء میں تپ دق کے مرض سے انتقال کر گئیں اس وقت ان کے بچے کم سن تھے چنانچہ مولوی ممتاز علی نے دوسری شادی مولوی سید احمد شفیع کی بیٹی سیدہ محمدی بیگم سے کی جو سر سید احمد خاں کے دوستوں میں سے تھے۔ جب مولوی سید ممتاز علی نے ''تہذیب نسواں'' جاری کیا تو سیدہ محمدی بیگم اس کی مدیرہ مقرر ہوئیں کیونکہ وہ ایک پڑھی لکھی اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ ''تہذیب نسواں'' کا پہلا شمارہ جولائی ۱۸۹۸ء کو شائع ہوا۔ سید ممتاز علی نے ۱۸۹۸ء میں دارالاشاعت پنجاب کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ لاہور میں قائم کیا جہاں سے کئی بلند پایہ کتب شائع ہوئیں جو مختلف موضوعات پر تھیں۔ مولانا سید ممتاز علی عربی فارسی کے ساتھ انگریزی زبان سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ وہ آزاد کے اسلوب خاص سے متاثر تھے اور مولانا آزاد کو استاد

مانتے تھے۔مولوی سید ممتاز علی ایک انسان دوست اور ہمدرد انسان تھے۔اپنی اولاد سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> ''ان کے بڑے صاحب زادے سید حمید علی ایک مرتبہ بیمار ہو گئے۔ بیماری نے طول کھینچا تو مولوی صاحب نے ان کے سرہانے بیٹھ کر ایک سو اٹھاسی مرتبہ قرآن مجید ختم کر کے ان پر دم کیا۔''(۴۷)

مولوی سید ممتاز علی اعلیٰ پایے کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین صحافی اور مختلف علوم کے ماہر تھے۔آپ کی کئی ایک یادگار تصانیف ہیں جن میں ''تفصیل البیان فی مقاصد القرآن'' نہایت اہم ہے۔کتاب میں اخلاق، عقائد اور جن جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے، مفصل ذکر بیان کیا گیا ہے۔مختلف موضوعات پر جتنی قرآنی آیات نازل ہوئیں ان کو اکٹھا کر کے وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔یہ کام انھوں نے کئی سالوں کی محنت کے بعد مکمل کیا۔کتاب سات حصوں پر مشتمل ہے۔مولوی صاحب کی لکھی ہوئی دیگر تصانیف میں تذکرۃ الانبیاء، حقوقِ نسواں، ولادت مسیح، فارسی آموز، سبیل الرشاد، پرائمری کے طلبا کے لیے اردو ریڈیں۔

مڈل کے طلبا کے لیے اردو کی نصابی کتابیں وغیرہ شامل ہیں۔آپ کئی سال تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کمیٹی برائے اصلاح کتب درسیہ کے رکن اور پنجاب یونیورسٹی سینٹ کے ممبر بھی رہے۔حکومت نے ان کی علمی و ادبی خدمات کے عوض انھیں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔آپ ۵ جون ۱۹۳۵ء کو فوت ہوئے۔آپ کا جسد خاکی لاہور سے دیوبند لے جایا گیا اور وہیں دفن ہوئے۔مشہور ادیب سید امتیاز علی تاج ان کے سب سے چھوٹے صاحب زادے تھے جو ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔مولوی ممتاز علی کے سلسلے میں بیشتر معلومات ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی کتاب ''سید امتیاز علی تاج شخصیت اور فن'' سے حاصل کی گئی ہیں۔

ظفر علی خاں، مولانا

مولانا ظفر علی خاں ۸ جنوری ۱۸۷۳ء میرتھ متصل ریلوے اسٹیشن سوہدرہ تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ

میں پیدا ہوئے بقول زاہد منیر عامر:

''شروع میں مولانا ظفر علی خاں کا نام خدا داد خاں رکھا گیا جسے جلد ہی ظفر علی خان سے بدل دیا گیا۔''(۴۸)

آپ کے والد کا نام مولوی سراج الدین احمد تھا جو علم و ادب سے دلچسپی رکھتے تھے اور محکمہ ڈاک میں ملازم تھے۔انھوں نے ۱۹۰۳ء میں ''زمیندار'' کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار جاری کیا جو کسانوں اور غریب طبقے کے مسائل اور ان کی حالت بہتر کرنے کے لیے نہایت اہم کردار ادا کرتا رہا۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔مشن ہائی سکول وزیر آباد سے مڈل کا امتحان پاس کیا ازاں بعد ''عربی مہندر کالج پٹیالہ'' چلے گئے جہاں پر ان کے پھوپھا پروفیسر عبداللہ خاں استاد تھے۔وہاں سے انھوں نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔۱۸۹۳ء میں علی گڑھ سے انٹرمیڈیٹ اور ۱۸۹۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی گریجویشن کی۔

علی گڑھ میں ان کو علامہ شبلی نعمانی اور پروفیسر آرنلڈ جو اقبال کے بھی استاد تھے کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔یہیں سے ان کی شخصیت میں نکھار پیدا ہوا وہ کالج کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں باقاعدہ حصہ لینے لگے۔نیز علامہ شبلی کی شاگردی نے ان پر گہرے اثرات مرتب کیے جس کا اعتراف ان کے اس شعر سے بخوبی ہوتا ہے۔

بہ فیض صحبت علامہ شبلی کا صدقہ ہے
کہ دنیائے ادب میں دھوم ہے میرے مقالوں کی (۴۹)

بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے استاد شبلی کی سفارش پر نواب محسن الملک کے پرئیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے لیکن جلد ہی صحافت سے وابستہ ہو گئے۔ابتدا میں ''دکن ریویو'' نکالا بعد ازاں ''زمیندار'' کی ادارت سنبھالی۔قیام حیدر آباد کے دوران وہ ولی عہد میر عثمان علی خاں کے اتالیق بھی رہے۔

مولانا ظفر علی خاں ایک قادر الکلام شاعر تھے۔''زمیندار'' میں ہر روز ایک نظم لکھتے تھے۔ان کے اخبار ''زمیندار'' نے برطانوی سامراج کے خلاف بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔مولانا ظفر علی خان کی شاعری اور نظم نگاری

کے حوالے سے مجیب الرحمان شامی لکھتے ہیں:

''مولانا کی شاعری برصغیر پاک و ہند کی عظیم الشان تحریک آزادی کی تاریخ ہے۔ حالات حاضرہ پر ان کی نظمیں ''زمیندار'' کے صفحہ اول پر شائع ہوتی تھیں اور زبان زد خاص و عام ہو جاتیں۔ انھیں منظوم اداریے کہا جاتا اور اس فن کے مولانا موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔''(۴۰)

وہ اردو کی نعتیہ شاعری میں بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ نبی اکرمؐ کے عشق میں ڈوب کر نعت لکھا کرتے تھے۔

دنیا میں رحمتِ دو جہاں اور کون ہے
اے تاجدار یثرب و بطحا تمہیں تو ہو

انھوں نے ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر کی کتاب:

"A History of Conflect between Religion and Scionce." کا اردو ترجمہ کیا جو بعد میں ''معرکہ مذہب و سائنس'' کے نام سے شائع ہوا۔ انھوں نے علامہ شبلی کی تصنیف: ''الفاروق کا انگریزی ترجمہ: Umer the Great کے نام سے کیا۔''(۴۱)

مولانا ظفر علی خان نے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا۔

نگارستاں، خیالستان، بہارستان، چمنستان اہم تصانیف ہیں۔

قائداعظم محمد علی جناح نے ظفر علی خاں کے بارے میں فرمایا تھا۔

''مجھے اپنے صوبے میں مولانا ظفر علی خاں جیسے دو چار آدمی دے دیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پھر مسلمانوں کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔''(۴۲)

داغ دہلوی مولانا ظفر علی خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ظفر علی خاں میرے شاگردوں میں سے پنجابی نژاد ہیں اور خوب لکھتے ہیں انھیں
نظم ونثر دونوں پر قدرت حاصل ہے۔''(۴۳)

۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو صبح کے وقت وفات پائی اور اپنے آبائی گاؤں کرم آباد نزد (وزیر آباد) میں دفن ہوئے۔

عبدالحق، مولوی

اردو زبان کے مشہور مصنف مولوی عبدالحق مشہور قصبہ سراوہ ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ کالج سے بی اے کرنے کے بعد حیدر آباد دکن چلے گئے اور مدرسہ آصفیہ میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے منسلک ہو گئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی قائم کروانے کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ وہ دارالترجمہ عثمانیہ کے پہلے ناظم بھی رہے۔ انھوں نے اردو زبان کی ترویج میں نہایت اہم کردار ادا کیا اور اپنی ذہانت سے اردو کو سارے ہندوستان کا مرکز بنا دیا۔ حیدر آباد کے وزیر اعظم کے ساتھ بھی ان کا تعلق تھا۔ انجمن ترقی اردو کی تکمیل ان ہی کی مرہونِ منت ہے۔ انھوں نے ساری زندگی جدوجہد کی اور اپنی ساری جائیداد اور اثاثے بھی انجمن کے نام وقف کر دیے۔ قائداعظم نے انھیں بابائے اردو کا خطاب دیا۔

اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ، اردو کی نشو ونما میں صوفیا کرام کا حصہ، مرحوم دلی کالج، نصرتی، ملک الشعراء بیجاپور کے حالات و کلام پر تبصرہ، چند ہم عصر اور افکار حالی ان کی یادگار تصانیف ہیں اس کے علاوہ انھوں نے بے شمار کتابوں پر نہ صرف مقدمے اور تبصرے لکھے بلکہ اردو میں مقدمہ نگاری کا با قاعدہ آغاز بھی کیا۔ مکتوبات حالؔی پر ان کا لکھا ہوا مقدمہ نہ صرف اہم ہے بلکہ حوالہ کی چیز بن گئی ہے۔ ڈاکٹر مجیب الاسلام کے بقول:

''بابائے اردو ایک فرد نہیں انجمن تھے ایک پورا عہد ان سے وابستہ تھا۔ ۱۶ اگست
۱۹۶۱ء میں پاکستان کے شہر کراچی میں وفات پائی۔''(۴۴)

مولوی عبدالحق اردو کے محقق کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔ اردو کی ابتدا کی نشو نما میں صوفیا کرام کا

حصہ ان کا بہترین تحقیقی کارنامہ ہے جس کے متعلق ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں:

"مولوی صاحب کی یہ تصنیف اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاء کرام کا کام بیک وقت سیرت بھی ہے۔تذکرہ بھی ہے اور ٹھوس تحقیق بھی ہے۔"(۴۵)

مولوی عبدالحق اردو کے مکتوب نگار بھی تھے۔ان کے خطوط کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں جن میں خطوطِ عبدالحق ، بنام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مرتبہ عبادت بریلوی، مکتوبات بابائے اردو بنام حکیم محمد امامی، مکتوبات عبدالحق مرتبہ جلیل قدوئی ۱۹۶۳ء

"خطوط عبدالحق" مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی ۱۹۴۴ء خطوط بنام حسام الدین ارشدی ۱۹۶۳ء خطوط عبدالحق بنام آل احمد سرور (مرتبہ آل احمد سرور ۱۹۸۸ء) رقعات عبدالحق (بدر منیر الدین ۲۰۰۴ء)، مقدمات عبدالحق مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی قابل ذکر ہیں۔مولانا حالی سے ان کو خاص عقیدت تھی۔مولانا حالؔی کے مکتوبات میں سے ۱۴۱ اہم خطوط مولوی عبدالحق کے نام ملتے ہیں جو مختلف موضوعات کے متعلق ہیں۔

عبدالحلیم شرر

مولانا عبدالحلیم شرر اردو کے تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔۱۸۶۰ء لکھنو میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام حکیم تفضّل حسین تھا۔ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔انھوں نے عربی، فارسی، منطق، طب کے علاوہ انگریزی تعلیم بھی حاصل کی۔۱۸۷۸ء میں اٹھارہ سال کی عمر میں ان کی شادی ان کی ماموں زاد کے ساتھ ہوگئی۔کچھ عرصہ بعد تقریباً ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ وہ حدیث کی تعلیم کے لیے دہلی روانہ ہو گئے۔دہلی میں انھوں نے شمس العلماء میاں نذر حسین دہلوی کے زیر سایہ حدیث کی تعلیم حاصل کی۔علاوہ ازیں دہلی میں رہ کر انھوں نے انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل کیا اور واپس لکھنؤ آ گئے۔وہ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبان میں ماہر تھے۔مولانا شرر کی ادبی اور صحافتی زندگی کا آغاز مضمون نویسی سے ہوتا ہے۔
بقول خاکی قزلباش:

''مولانا شرر نے جب مضمون نویسی شروع کی تو سیاسیات کی بجائے ادبی اور علمی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ انشا پردازی پر خاص توجہ دیتے تھے اور مضمون نویسی میں انگریزی مضامین کی تقلید کرتے تھے۔ یہ رنگ چونکہ بالکل نیا تھا اس لیے مولانا کی شہرت بہت جلد عام ہوگئی۔ ۱۸۸۰ء میں منشی نولکشور نے انھیں اودھ اخبار کے ادارے میں شامل کرلیا اور یوں ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔''(۴۶)

اودھ اخبار کے علاوہ وہ کئی ایک رسائل اور اخبارات سے بھی وابستہ رہے جن میں ہفت روزہ ''محشر'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

جنوری ۱۸۸۷ء میں انھوں نے لکھنؤ سے رسالہ ''دلگداز'' جاری کیا جو ماہنامہ تھا اسی سے مولانا شرر کی ناول نویسی کا بھی آغاز ہوتا ہے۔

۱۹۱۰ء میں ''زمانہ'' کانپور نے اس وقت کے ادیبوں اور شاعروں کے ادبی رجحان جاننے کے لیے ایک سروے کیا۔ اور مولانا شرر سے بھی اس سلسلہ میں رجوع کیا گیا تو انھوں نے لکھا:

''اردو میں سرسید مرحوم، مولانا حالی مرحوم، مولانا شبلی کی تصانیف میرے مزاق میں بہترین تصانیف ہیں۔''(۴۷)

۱۸۹۰ء میں مولانا نے رسالہ ''مہذب'' بھی جاری کیا جس میں مشہور شخصیات کی زندگی کے حالات لکھے جاتے تھے لیکن یہ جلد ہی مالی مشکلات کی بنا پر بند ہوگیا۔ ۱۹۰۱ء میں ''دلگداز'' بھی بند ہوگیا اور مولانا شرر لکھنؤ سے حیدرآباد چلے گئے۔ وہ حیدرآباد میں محکمہ تعلیمات میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تعینات ہوئے۔ نواب وقار الملک کی وزات سے علیحدگی اور ان کے انتقال کے بعد ۱۹۰۲ء میں دوبارہ لکھنؤ آ گئے۔ ۱۹۰۴ء میں انھوں نے لکھنؤ سے رسالہ ''اتحاد'' جاری کیا جس کے قلمکاروں میں مولانا حالی بھی شامل تھے۔ مولانا حالی رسالہ ''اتحاد'' کے متعلق لکھتے ہیں:

''جس مقصد کے لیے یہ رسالہ جاری کیا گیا ہے اس کو میں ایسا ضروری اور اہم

جانتا ہوں کہ میرے نزدیک ہندوستان کے حق میں اس سے زیادہ مہتم بالشان کوئی اور مقصد نہیں۔،،(۴۸)

شرر کا ایک بڑا کارنامہ تاریخ اسلام ہے جو دو جلدوں میں ہے اور انھوں نے کئی سالوں کی محنت کے بعد اس کو لکھا وہ دالترجمہ دکن سے بھی وابستہ رہے۔ان کے مشہور تاریخی ناولوں میں فردوس بریں، زوال بغداد، بابک خرمی، ایام عرب، جبکہ دیگر ناولوں میں حسن کا ڈاکو، غیب دان دلہن، حسن بن صباح وغیرہ مشہور ہیں اس کے علاوہ تاریخ خلافت، خواجہ معین الدین چشتی، ابوالحسنین وغیرہ بھی ان کی تالیفات میں شامل ہیں۔مولانا شرر کی تحریریں معاشرتی اور اصلاحی ہوا کرتی تھیں۔

انھوں نے بھرپور صحافتی علمی و ادبی زندگی گزار کر دسمبر ۱۹۲۶ء میں وفات پائی۔

عبدالرحیم بیدل، مولوی

مولوی عبدالرحیم خاں بیدل مولانا حالی کے ہم عصر تھے۔وہ حالی کی شاعری کے دلدادہ اور ان کی شخصیت کے گرویدہ تھے۔لالہ سری رام نے ان کا ذکر ''خمخانہ جاوید'' میں بڑے احسن طریقے سے کیا ہے اور انھیں زندہ شخصیات میں شمار کیا ہے۔ان کا شمار اسلوب حالی کے پیروکاروں میں کیا جاتا ہے۔بقول لالہ سری رام:

''بیدل عالجناب مولوی محمد ابراہیم خان صاحب بیدل دہلوی سابق ڈپٹی اکاؤنٹ جنرل ریاست حیدرآباد دکن و رئیس دہلی مولوی محمد تقی خاں صاحب مقصود کے خلف اصغر اور سید امراؤ مرزا صاحب انور مرحوم کی ارشد تلامذہ میں ہیں۔سالک مرحوم سے بھی اصلاح لی ہے۔۳۰ برس تک ریاست حیدرآباد دکن میں عہدہ ہائے جلیلہ ممتاز رہے اب پنشن لے کر دھن میں خانہ نشین ہیں اور اپنے دلی دوست ملک الشعراء خواجہ الطاف حسین صاحب حالؔی کی طرز کے اسیر اور نئی روش کی شاعری کے دلدادہ ہیں اور حق یہ ہے کہ اس طرز خاص میں رتبہ استادی رکھتے ہیں۔کلام میں

سوز و گداز بہت ہے اور متانت، اخلاق، تہذیب اور ضعائع کی چاشنی بھی نہایت دلکش پیرایہ میں موجود ہے۔ آپ کی ذات ستودہ صفات اساتذہ وسلف کی یاد دلاتی ہے۔ خلق، شرافت، متانت، اخلاق نے ہر دلعزیز بنا رکھا ہے۔ اب ۶۵ برس کے قریب عمر اور دہلی کے باوقار روسائے میں شمار ہے۔'' (۴۹)

عبدالرزاق کانپوری، مولوی

مولوی عبدالرزاق کانپوری ۱۸۶۶ء میں انبالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام منشی الٰہی بخش تھا جو اپنے زمانے کے مشہور نجومی او راہل علم تھے۔ وہ انگریزی زبان میں مہارت کے ساتھ شعر و شاعری کا مزاج بھی رکھتے تھے۔ چونکہ مولانا کا ننھیال فتح پور میں تھا اور آپ کی والدہ زیادہ تر ننھیال میں ہی رہتی تھی اس لیے آپ کی ابتدائی تعلیم وتربیت فتح پور میں ہوئی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے چچا منشی نثار علی جو اس وقت چیف ریڈر تھے کے ساتھ کام کرتے رہے ان کی شادی ان کی چچا زاد سے ہوئی جو حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ اردو و فارسی زبان کی ماہر تھیں۔ ان کی ادبی زندگی اور علمی ذوق کا آغاز شادی کے بعد ہوا اور انھوں نے اپنا ایک ذاتی کتب خانہ بھی بنایا۔ جس پر ان کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ خرچ ہوتا تھا۔ مختلف ادبی اور تعلیمی مجالس میں حالی شبلی اور سرسید سے متعارف ہوئے۔ ان کے حلقہ احباب میں عبدالحلیم شرر اور نامی پریس کے مالک منشی رحمت اللہ رعد شامل تھے۔ اپنی کتاب ''یادِایام'' میں انھوں نے حالی شبلی اور سرسید کی محفلوں کا ذکر کیا ہے۔ ''البرامکہ'' جیسے عظیم کتاب کی تیاری میں نہ صرف سرسید کی تحریک اور تائید شامل تھی بلکہ انھوں نے سرسید کے ذاتی کتب خانہ سے استفادہ بھی کیا۔ مولانا کانپوری کا حلقہ احباب زیادہ تر ادبی وعلمی شخصیات پر مشتمل تھا جن میں سرسید، شبلی، حالی، مولانا ابوالکلام آزاد، محسن الملک، مہدی افادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بقول سعیدہ بانو:

''مولانا آزاد خاص طور پر آپ کی نکتہ سنجی اور تاریخ دانی کے معترف تھے اور کسی تاریخی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے مولانا سے مشورہ ضرور لیتے تھے۔'' (۵۰)

وہ ریاست بھوپال میں تحصیل دار اور مجسٹریٹ بھی رہے۔ بیگم بھوپال کے حکم پر تاریخ اسلام اور ''نظام الملک'' لکھی۔ ازاں بعد نواب وقار الملک کی وساطت سے ریاست حیدر آباد میں ۱۲۰۰ روپے کی پیشکش ہوئی مولانا تقرر نامہ لے کر بیگم بھوپال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حیدر آباد جانے کی خواہش کا اظہار کیا جس پر بیگم بھوپال نے فرمایا:

> ''مولانا کیا آپ ایک بیوہ کو چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ میں آپ کو صرف دو سو روپہ ماہوار دیتی ہوں وہ بڑی ریاست ہے آپ کا دل چاہیے تو آپ جا سکتے ہیں۔ سرکار سلطان جہاں کے جواب سے آپ بے حد متاثر ہوئے اور نظام دکن کو معذرت نامہ لکھ دیا۔''(۵۱)

اس سلسلہ میں مولانا الطاف حسین حالی کے لکھے ہوئے خط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جو مولانا عبدالرزاق کانپوری کے نام ہے:

> ''مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ حیدر آباد میں بھی آپ کے متعلق تحریک ہو رہی ہے اور کچھ عجب نہیں کہ نواب صاحب ممدوح آپ کو وہاں بلائیں مگر میرے نزدیک ایسی صورت پیش آئے تو بھوپال کا حق سب سے مقدم ہے۔''(۵۲)

مولانا کانپوری وسیع المطالعہ شخص تھے اور عمر بھر تصنیف و تالیف سے وابستہ رہے۔ ان کی بہترین تصانیف میں البرامکہ، سفر نامہ ناصر خسرو، نظام الملک طوسی، تاریخ یادِ ایام قابل ذکر ہیں۔ ۱۷ فروری ۱۹۴۸ء میں بھوپال میں وفات پائی۔

یادِ ایام ایک تذکرہ ہے مختلف مشاہیر کا جس کا انداز بیان بہت شگفتہ اور عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ علمی و تحقیقی ہے۔ آپ کی مشہور کتاب البرامکہ کے متعلق ڈاکٹر ایچ۔ آر۔ تیموری ڈی لٹ لکھتے ہیں:

> ''یہ مقالہ تمام کمال تاریخی ہے اور از حد دلکش، بلکہ میری رائے میں ہندوستان کی تاریخ میں یہ ایک نئے باب کا اضافہ ہے اور اب خداوند عالم سے یہ دعا ہے کہ

بقائے دوام کے دربار میں ان بزرگوں کو حسبِ حال کرسیاں ملیں اور یہ بھی دعا ہے

کہ ''مولانا البرالکہ'' جب تک زندہ رہیں ان کا قلم چلتا رہے۔آمین''۔(۵۳)

محبوب عالم،مولوی (ایڈیٹر''پیسہ اخبار'')

مشہور صحافی اور ادیب مولوی محبوب عالم ایڈیٹر ''پیسہ اخبار'' گوجرانوالہ کی تحصیل وزیر آباد کے گاؤں موضع بھروکی میں ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اپنے چچا جو برج اٹاری لاہور میں مدرس تھے کے پاس رہ کر حاصل کی۔ان کا نام مولوی احمد الدین تھا جبکہ آپ کے والد کا نام مولوی الہ دین تھا۔مڈل کا امتحان آپ نے ہائی سکول قصور سے پاس کیا جہاں ان کے دوسرے چچا ماسٹر محمد الدین ہیڈ ماسٹر تھے اس کے بعد میڈیکل کالج میں داخل ہوئے۔آپ کے ہم جماعتوں میں ڈاکٹر سی بی کیلیپ اور ڈاکٹر دلیپ سنگھ شامل تھے۔اسی دوران آپ کے والد مولوی الہ دین کا انتقال ہو گیا اور ذرائع آمدن محدود ہونے کے سبب کالج چھوڑنا پڑا۔آپ نے پرائیویٹ طور پر منشی فاضل کا امتحان دیا اور پنجاب یونیورسٹی میں اول آئے۔یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو ۱۰۰ (ایک سو) روپے کی کتابیں اور پچاس ۵۰ روپے نقد انعام ملا۔علاوہ ازیں وظیفہ بھی حاصل کیا۔

۱۸۸۷ء میں فیروزوالا سے ''پیسہ اخبار'' جاری کیا جو جلد ہی لاہور منتقل کر دیا۔یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ والد کی وفات کے بعد آپ اپنی والدہ کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے گوجرانوالہ چلے گئے اور وہاں فیروزوالا ضلع گوجرانوالہ سے ہفت وار اخبار بنام ''ہمت'' جاری کیا جس کا مقصد یا ماٹو تھا: ''ہمت مرداں مددِ خدا'' لیکن جلد ہی آپ نے محسوس کر لیا کہ صحیح معنوں میں ایک اصلی اخبار کی ضرورت زیادہ ہے۔اسی بنا پر آپ نے ''ہمت'' کو ''پیسہ اخبار'' سے بدل دیا۔یعنی نام تبدیل کر کے ''پیسہ اخبار'' رکھ دیا۔

اخبار نویسوں کے حالاتِ زندگی کے مطابق:

''اخبار ہمت (جس کا نام بعد میں پیسہ اخبار زیادہ موزوں سمجھا گیا) کے متعلق یہ

ذکر کرنا غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ جب آپ کا ارادہ اس کے جاری کرنے کا ہوا تو

آپ اور منشی عبدالعزیز صاحب آپ کے بھائی بیٹھے تھے دیوان رند کو بطور فال کھولا گیا تو یہ شعر نکلا:

عالم پسند ہو گئی جو بات تم نے کی
جو چال تم چلے وہ زمانہ میں چل گئی

واقعات اور حالات ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ شعر کہاں تک آپ کے حسب حال ہے اور کیا ہندوستان کے تمام اردو اخبارات نے ہر معاملہ میں آپ کی تقلید نہیں کی۔"(۵۴)

۱۸۸۹ء میں یہ سمجھتے ہوئے کہ لاہور پنجاب کا دارالخلافہ ہے اور یہ اخبار وہاں زیادہ کامیاب ہوگا آپ نے اخبار کو لاہور منتقل کر دیا اور آپ لاہور چلے گئے۔ انھوں نے لاہور میں اپنا پریس قائم کیا جس کے ذریعے بے شمار کتابیں شائع ہوئیں۔"پیسہ اخبار" کا دفتر انارکلی کے ساتھ ایک گلی میں تھا جو بعد میں "پیسہ اخبار" والی گلی کے نام سے مشہور ہوئی۔ ۱۸۹۵ء میں "پیسہ اخبار" کا ایک پرچہ صرف عورتوں کے لیے نکالا اس میں تمام مضامین عورتوں کے لکھے ہوئے تھے۔ مردوں کا کوئی مضمون اس میں شامل نہیں تھا۔ اس پرچے نے تعلیم نسواں کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ علاوہ ازیں ایک ماہوار رسالہ "شریف بی بی" لاہور سے جاری کیا۔ پیسہ اخبار ہفتہ وار تھا اور تقریباً آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور قیمت فی پرچہ ایک پیسہ تھی۔

"شریف بی بی" اور "پیسہ اخبار" کے علاوہ آپ نے بچوں کے لیے ایک مہینہ وار اخبار "بچوں کا اخبار" بھی نکالا۔ اس کے علاوہ "انتخاب لاجواب" بھی آپ کی تخلیق ہے۔

۱۹۰۰ء میں یورپ کے اخباری سسٹم کے مطالعہ کے لیے یورپ گئے۔ آپ اردو اخبارات کے پہلے ایڈیٹر تھے جو فنِ اخبار نویسی کے حوالہ سے یورپ گئے۔ چنانچہ آپ ولایت سے جو مضامین اخبار کے لیے چھپا کرتے تھے وہ بہت دلچسپ اور معلوماتی ہوتے تھے۔

آپ اردو، انگریزی، عربی، فرانسیسی اور ترکی زبان بھی جانتے تھے۔ آپ بڑے بااخلاق اور عاجزانہ مزاج

رکھنے والے انسان تھے۔انھوں نے حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی۔ ۱۹۳۷ء میں وفات پائی۔
آپ کئی کتابوں کے مصنف،مولف اور مترجم ہیں۔

محمد حسین آزاد،مولانا

مولانا محمد حسین آزاد دہلی کالج کے فارغ التحصیل تھے۔ دادا کا نام مولانا محمد اکبر تھا جو اپنے زمانے کے نامور مجتہد تھے اور اپنے گھر دلی میں دینی علوم پڑھایا کرتے تھے مولانا محمد باقر آزاد کے والد ان کے اکلوتے فرزند تھے۔جنھوں نے دہلی سے پہلا اردو اخبار نکالا۔ ۱۸۳۶ء کے لگ بھگ انھوں نے دہلی میں ایک پریس قائم کیا جن کا نام پہلے مطبع جعفریہ اور بعد میں اردو اخبار پریس رکھا گیا۔مولانا آزاد ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ وہ بھی مولوی محمد باقر کے اکلوتے فرزند تھے۔مولوی محمد باقر کے دوست اور معروف شاعر شیخ ابراہیم ذوق نے ان کا نام محمد حسین رکھا۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس کے بعد مسٹر ٹیلر پرنسپل دہلی کالج جو مولوی محمد باقر کے دوستوں میں تھے کے مشورے سے دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ دہلی کالج کے زمانے میں ہی ان کی مضمون نویسی کا آغاز ہوتا ہے۔وہ اکثر مضامین نویسی کے مقابلوں میں اول پوزیشن حاصل کرتے۔ دلی کالج میں ان کے دوستوں میں منشی ذکاالله،ڈپٹی نذیر احمد، پیارے لال آشوب شامل تھے۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد آزاد اپنے والد کے پریس کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور اپنی تحریروں سے اردو اخبار کو مقبول بنایا۔ یہ اخبار ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک نکلتا رہا اس کے بعد بند کر دیا گیا اور اس کی تمام کاپیاں حکومت نے ضبط کر لیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں آزاد نے بڑے مصائب اور صعوبتیں جھیلیں ان کے والد کو بغاوت کے جرم میں گولی مار کر شہید کر دیا گیا وہ خود بھی پریشان حال دلی سے نکلے۔اس سلسلہ میں آغا محمد باقر لکھتے ہیں۔

> ”مولانا روتے دھوتے،صبر کی سل سینے پر رکھے۔ پریشان حال دہلی سے روانہ ہو
> گئے۔سر پر استاد کے کلام کا پلندہ تھا۔ یہی بھرے گھر میں سے اٹھایا تھا کہ اگر ان کا

کلام برباد ہوگیا تو ان کا نام بھی باقی نہ رہے گا۔دریا کے پل کے قریب پہنچے تھے کہ ایک گورے نے للکارا او بڈھا! ادھر آؤ" پلندہ کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا "اس میں کیا ہے؟ مولانا ابھی جواب بھی نہ دینے پائے تھے کہ اس نے سنگین سے پلندہ اتار پھینکا کاغذات تتر بتر ہو گئے۔اس نے دیکھ کر کہا جاؤ بھاگ جاؤ۔مولانا نے جلدی جلدی منتشر کاغذات اکٹھے کیے اور پلندہ سر پر رکھ دریا پار اتر گئے۔"(۵۵)

اور یہی پلندہ جب آزاد گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسری پر مامور ہوئے تو انھوں نے اپنے استاد ذوق کا دیوان مرتب کر کے ۱۸۹۰ میں شائع کیا۔مکتوبات آزاد صفحہ۱۲ پر لکھتے ہیں۔

"جب خداوند تعالیٰ کی مہربانی سے انھیں امانِ جان کے ساتھ پروفیسری کا رتبہ ملا تو آپ نے اپنے استاد کا دیوان مرتب کر کے شائع کر دیا۔اور استاد کے اشعار کی جابجا شرح اس طرح لکھی جس طرح اہل عقیدت نے قرآن کی تفسیریں اور شانِ نزول لکھی ہے۔"(۵۶)

آزاد جب دہلی سے نکلے تو چھپتے چھپاتے پریشانی کے عالم میں پہلے سیالکوٹ جہاں ان کے بہنوئی رہتے تھے اور بعد ازاں لاہور پہنچے۔اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے آغا محمد باقر لکھتے ہیں:

"مولانا کے بہنوئی سیالکوٹ میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ کچھ عرصہ کے لیے وہ سیالکوٹ آئے اور وہاں سے ایک دم کشمیر جنت نظیر کی سیر کا اردہ کرلیا۔کشمیر کی سیر کر کے آئے تو سیالکوٹ ہی میں مقیم ہو گئے۔ یہاں پرانی اور نایاب کتابوں کی تجارت شروع کر دی۔ جہاں کوئی اچھی کتاب ملتی خرید لیتے پھر بڑے بڑے افسروں کو خطوط کے ذریعے اطلاع دیتے کہ میرے پاس فلاں فلاں کتاب برائے فروخت موجود ہے۔ابھی یہ سلسلہ اچھی طرح چلنے بھی نہ پایا تھا کہ ان کے

بہنوئی لاہور تبدیل ہو گئے۔ ان کے ساتھ مولانا بھی لاہور آ گئے۔"(۵۷)

لاہور میں مولانا آزاد مختلف جگہوں اور دفاتر میں چھوٹے بڑے عہدوں پر کام کرتے رہے۔ اس وقت کے پوسٹ ماسٹر جنرل کی وساطت سے میجر فلر ڈائریکٹر تعلیم سے ملاقات ہوئی اور محکمہ تعلیم میں ۲۵ روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ اسی زمانے میں مولانا کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔

۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائڈ ڈائریکٹر تعلیم بنے وہ اردو زبان کی ترویج اور ترقی میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہی کی دلچسپی کی وجہ سے انجمن پنجاب کے شاعروں کی بنیاد پڑی جن میں آزاد کے ساتھ مولانا حالی اور اقبال بھی شرکت کرتے تھے۔

۱۸۶۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ۱۸۸۴ء میں اورنیٹل کالج تبدیل ہو کر چلے گئے۔ مولانا آزاد جدید اردو نظم کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

مولانا آزاد کی مشہور تصانیف میں۔ آبِ حیات، نیرنگِ خیال سخندان فارس، دربار اکبری، دیوانِ ذوق، قصص ہند، اردو کا قاعدہ اور قواعد، نظم آزاد، نگارستان، جانورستان، بہت اہم ہیں۔ مولانا آزاد کو ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی کو جوبلی کے موقع پر شمس العلماء کا خطاب ملا۔ آخری عمر میں بیٹی کی وفات اور بیماری کے سبب دماغ مختل ہو گیا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں لاہور میں فوت ہوئے اور کربلا گامے شاہ میں دفن ہوئے۔ آزاد اپنے مکتوبات کے حوالے سے بھی مقبولیت اور شہرت رکھتے ہیں ان کے مکتوبات ادب پاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ بقول طاہر نبیرہ:

> "مکتوبات آزاد قومی تعلیم کے آزاد مکاتب و مدارس میں نصاب کے طور پر پڑھائے جائیں تو لڑکوں کو لکھنے اور ایک دوسرے کو مخاطب کرنے اور دل کا مطلب صحیح طور پر ادا کر سکنے کا سلیقہ ہو جائے۔"(۵۸)

آزاد کی قندِ فارسی اور سخندان فارس کے متعلق عبدالرزاق کانپوری اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> "سررشتہ تعلم کے قندِ فارسی کو بہت پسند کیا تب آزاد نے دوسری کتاب "سخندانِ فارس" شائع کی، سبحان اللہ! سخندانِ فارس نے ایسی لے سے بربط بجایا کہ قدیم

ایرانی راگنیاں بادنو روزاورنوائے خارکش زندہ ہوگئیں اور جوان اور بوڑھے دونوں محوطرب ہو کر رہ گئے۔ یہ کتاب تھی جس کے ہر ہر لفظ سے آبِ حیات کی بوندیں ٹپکتی تھیں اور قدم قدم پر فارس کی تاریخ کوہ بے ستون، نقشِ رستم اور چہل مینار وغیرہ کے مناظر پیش کرتی تھیں۔ یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ قصص ہنداور سخندانِ فارس کا نسخہ برسوں مولانا شبلی نعمانی کے بکس میں (سفر وحضر) میں رہا۔" (۵۹)

محمد علی جوہر، مولانا

مولانا محمد علی جوہر کا نام محمد علی خاں اور جوہر تخلص تھا۔ والد کا نام عبدالعلی خاں تھا جبکہ والدہ کا نام عابدی بانو بیگم جن کو بی اماں کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مولانا کا آبائی وطن نجیب آباد ضلع بجنور تھا لیکن ان کی پیدائش ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء کو رام پور میں ہوئی جہاں ان کے والد ملازمت کے سلسلہ میں مقیم تھے اور جوانی میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۲۸، ۲۷ برس تھی۔ مولانا جوہر نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی علاقے میں حاصل کی۔ آپ نے دینی تعلیم کے ساتھ مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد بریلی کے ایک انگریزی سکول سے میٹرک پاس کیا پھر علی گڑھ کالج چلے گئے۔ جہاں سے انھوں نے بی اے کا امتحان امتیازی پوزیشن سے پاس کیا اس کے بعد انگلستان گئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی اے (آنرز) جدید تاریخ میں کامیابی حاصل کی۔ ہندوستان واپسی پر آپ رام پور کے ہائی سکول کے پرنسپل مقرر ہوئے اس کے بعد ریاست کے چیف ایجوکیشن آفیسر تعینات ہوئے مولانا کی طبیعت میں قوم وملت کی خدمت کا جذبہ تھا چنانچہ ملازمت چھوڑ کر صحافت اور سیاست کے میدان میں قدم رکھا اور ایک انگریزی اخبار نکالنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو کلکتہ سے "کامریڈ" جاری کیا جو ہفت روزہ تھا۔ اس زمانے میں کلکتہ دراالسلطنت تھا۔ جلد ہی کامریڈ نے ایک معروف انگریزی اخبار کے طور پر اپنی جگہ بنالی۔ اس کے لکھنے والوں میں مولانا کے دو دوست مسٹر ولایت حسین عبوقی اور راجہ غلام حسین خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو اچھے انگریزی دان تھے۔ انگریز بھی اس پرچے کو پسند کرتے تھے اور

اس کے ممبر رہے لیکن کچھ عرصہ بعد ''کامریڈ'' بند ہو گیا اس کی وجہ مولانا جوہر کی سیاسی مصروفیات اور درالسلطنت کلکتہ سے دہلی منتقل ہونا تھا۔فروری ۱۹۱۳ء میں مولانا محمد علی جوہر نے دہلی سے اردو روزنامہ ''ہمدرد'' کے نام سے جاری کیا جو کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا۔مولانا محمد علی جوہر کی ذہانت اور حاضر جوابی سے سب لوگ قائل تھے۔وہ ایک بہترین صحافی، مقرر اور سیاست دان کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔۱۹۱۳ء میں جب ''ہمدرد'' شائع ہوا تھا انھوں نے مولانا حالی کو بذریعہ تار درخواست کی کہ اپنے تاثرات لکھ کر روانہ کریں۔

ہمدرد کے اجراء پر مولانا حالی نے مسرت کا اظہار کیا اور دو رباعیاں لکھ کر مولانا جوہر کو بھیجی جو درج ذیل ہیں:

تمغوں کی ہوس نہ ہے خطابوں کی طلب
اک ملک کی خدمت کا ہے سودا یا رب

''ہمدرد'' کو اسمِ بامسمّیٰ کیجیو!
اس نام کی لاج تیرے ہی ہاتھ ہے اب

اقوام میں زندگی کی ہے روح جہاں
چونک اٹھتے ہیں ایک ہاں پہ واں پیر و جواں

کرتی نہیں وحی مردہ قوموں میں وہ کام
جو کام ایک کارٹون کرتا ہے وہاں (۶۰)

مولانا جذباتی شخصیت کے مالک تھے۔وہ اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے انگریزوں کی مخالفت کرتے تھے۔وہ علی گڑھ کالج کے مقبول اور مشہور طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔ان کے دوستوں میں سجاد حیدر یلدرم بھی شامل تھے۔وہ شاعر بھی تھے۔انھوں نے شاعری میں داغ دہلوی سے استفادہ کیا۔

ڈاکٹر مشرف علی آپ کی شخصیت کے متعلق کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

''انگلستان کا شہرہ آفاق مصنف ایچ جی ویلز کا مولانا کے متعلق یہ بیان تھا کہ:

محمد علی نپولین کے دل، مکالے کے قلم اور بروک کی خطابت کا جامع تھا۔''(۶۱)

مولانا جوہر تحریک خلافت کے روح رواں تھے۔ انھوں نے سیاست میں سرگرم حصہ لیا۔ ان کے گاندھی کے ساتھ بھی قریبی تعلقات تھے۔ زندگی کے آخری ایام انھوں نے لندن میں گذارے۔ ان کا عزم تھا کہ وہ ہندوستان آزادی کا پروانہ لیے بغیر نہیں جائیں گے۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ انھوں نے ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں انتقال کیا اور ان کی وصیت کے مطابق بیت المقدس میں دفن کیا گیا۔

محمد علی مہمان

محمد علی مہمان انڈین سول سروسز میں تھے اور مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد بطور ڈپٹی کمشنر ریٹائرڈ ہوئے۔ ۱۸۲۸ء میں بنگلور میں پیدا ہوئے ان کا سلسلہ نسب حضرت ابوایوب انصاری سے ملتا ہے۔ ان کو دربار مہاراجہ چامراج وڈیر بہادر سے جواہر مجلس کے خطاب کے ساتھ جواہر کی مالا اور خلعت عطا ہوئی تھی۔ یہ اعزازات نہایت معزز اور ممتاز لوگوں کو دیے جاتے تھے۔ جب مہاراجہ وڈیر بہادر نے پورے ہندوستان کا سفر کیا تو محمد علی مہمان بھی اس سفر میں ان کے ساتھ تھے۔ یہ لوگ ۱۸ جنوری ۱۸۸۷ء کو علی گڑھ پہنچے تھے۔ سرسید احمد خاں نے ان کے استقبال کے لیے علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر ایک گاڑی اور دو گھوڑوں کے ساتھ آدمی بھیجے تھے۔ انھوں نے سرسید کے مکان پر قیام کیا۔ ۲۸ جنوری ۱۸۸۷ء کو خواجہ الطاف حسین حالی اور مولوی ذکا اللہ کے ساتھ ملاقات ہوئی۔

خواجہ الطاف حسین حالی کا ایک خط محمد علی مہمان کے نام ہے جس میں انھوں نے ان کی آمد اور مشکلات کا ذکر کیا ہے کہ جب وہ علی گڑھ آئے تو اس وقت بارش ہو رہی تھی یوں آپ کو قافلے کے ہمراہ بارش اور کیچڑ کی دقتیں برداشت کرنا پڑیں۔

محمد علی مہمان شاعر بھی تھے ان کے کلام کا مجموعہ ''ہدیہ مہمان'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔انھوں نے ۱۸۹۳ء میں وفات پائی۔

محمد یعقوب مجددی، حافظ

حافظ محمد یعقوب مجددی مولانا حالؔی کے قریبی دوست اور ہم وطن تھے وہ زیادہ تر وقت مولانا حالؔی کے پاس گزارتے تھے۔مولانا حالی کو بھی ان سے لگاؤ تھا ان کے والد کا نام حافظ غلام مجدد تھا جو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ کی اولاد میں سے تھے اور آٹھویں پشت سے ان کا سلسلہ نسب ان سے ملتا ہے۔مولانا حالؔی اپنی ہرنئی کتاب مجددی صاحب کو پیش کرتے تھے۔بقول شیخ محمد اسماعیل پانی پتی:

> ''مولانا کی بعض کتابوں کے اولین ایڈیشن ان سے ہی خریدے تھے خواجہ سجاد حسین صاحب مرحوم بھی اپنے والد مرحوم کی بعض نادر کتب جو عام طور پر نہیں ملتی تھیں ان ہی سے خرید فرمایا کرتے تھے چنانچہ میں نے بھی ''مناجات بیوہ'' کی ایک پہلے ایڈیشن کی کاپی ان ہی سے خرید ہوئی خواجہ صاحب کے پاس دیکھی جس پر یہ الفاظ لکھے تھے۔
>
> ''ہدیہ بخدمت حافظ محمد یعقوب صاحب مجددی ۲۸ ستمبر ۱۸۸۴ء منجانب''(۶۲)
>
> خاکسار
>
> الطاف حسین حالی

مولانا حالؔی کے مکتوبات کے تین مجموعوں کے مطابق پہلا خط ان ہی کے نام ملتا ہے۔حافظ محمد یعقوب مجددی ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو فوت ہوئے۔مجددی صاحب نہایت نیک خصلت انسان تھے یہی وجہ ہے لوگ ان کی تعظیم کرتے تھے۔ان کا شمار نیک اور صالح لوگوں میں ہوتا تھا۔مولانا حالؔی کے ایک خط کا اقتباس دیکھیے۔جو

انھوں نے ۱۷ جنوری ۱۸۸۷ء کو چیف کالج لاہور سے لکھا۔

''مکرمی! عنائت نامہ پہنچا۔ واقعی مجھ سے بڑی فروگذاشت ہوئی کہ چلتے وقت آپ سے نہ مل سکا۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے جس قدر میری بداخلاقیاں اور نالائقیاں آپ پر ظاہر ہوتی جاتی ہیں۔ اس قدر آپ کی خوبیاں اور حسنِ اخلاق اور صدقِ محبت اور اخلاص مجھ پر ظاہر ہوتا جاتا ہے۔''(۶۳)

محمد یحییٰ تنہا

محمد یحییٰ نام تھا اور تنہا تخلص تھا۔ ۱۸۹۰ میں پیدا ہوئے ابتدائی زمانہ میرٹھ میں گزرا شعرسخن کا بچپن سے شوق تھا۔ مشاعروں میں شرکت کرتے تھے اور مضمون لکھا کرتے تھے۔ خود لکھتے ہیں:

''میں نویں یا دسویں کلاس میں پڑھتا تھا کہ میرا سب سے پہلا مضمون ''احسان فراموش'' ۱۹۰۴ کے عصرِ جدید میرٹھ میں چھپا جو زیرادارت خواجہ غلام الثقلین مرحوم شائع ہوتا تھا۔ اس پر خواجہ مرحوم نے یہ نوٹ دیا تھا کہ یہ ایک ہونہار طالب علم کا مضمون ہے جیسا کہ مبتدیوں کا قاعدہ ہے کہ عبارت میں رنگینی زیادہ ہے لیکن خیالات نہایت اچھے ہیں۔''(۶۴)

۱۹۰۵ء میں مولانا حالی میرٹھ آئے توان سے ملاقات کا موقع ملا یوں شاعری کا ذوق بڑھتا رہا۔ پیسہ اخبار، لاہور اور آفتاب جھالراپاٹن مین نظمیں لکھنے لگے اس کے علاوہ علی گڑھ اور زمانہ کانپور میں بھی ان کی شاعری چھپنے لگی۔

۱۹۱۱ء میں انہوں نے بی۔اے کا امتحان پاس کیا اور ایک سال بعد ۱۹۱۲ مین ان کی پہلی کتاب ''شاعرانہ خیالات'' شائع ہوئی۔ مولانا حالی، شبلی، وحیدالدین سلیم نے اس کتاب کو پسند کیا اور مصنف کی تعریف کی۔ اپنے ایک خط میں مولانا حالی شاعرانہ خیالات کے متعلق یحییٰ تنہا کو لکھتے ہیں:

''مکرمی میں پندرہ بیس روز سے علیل ہوں اس کے سوا گرمی کی شدت نے سخت پریشان کر رکھا ہے اس وجہ سے آپ کی نفیس کتاب ''شاعرانہ خیالات'' کی رسید اب تک نہیں لکھ سکا تھا حالانکہ مطالعہ بہت مدت سے ترک ہو گیا ہے اور آنکھوں کی حالت لکھنے پڑھنے کی مطلق اجازت نہیں دیتی۔مگر ''شاعرانہ خیالات'' کو جس طرح ہوسکا اول سے آخر تک غور سے پڑھا۔شاید اپنی قسم کی یہ پہلی ہی کتاب ہے جس میں انگلستان کے نامور شعراء کے پولیٹیکل خیالات ایسی صفائی اور سلاست کے ساتھ مع مختصر حالات ہر ایک شاعر کے بیان کیے گئے ہیں جو لوگ مغربی شاعری کی پیروی کا خیال رکھتے ہیں۔ان کے لیے یہ مجموعہ ایک عمدہ رہبر کا کام دے گا۔چھپائی بھی نہایت عمدہ ہے اگر چہ کہیں کہیں غلطیاں رہ گئی ہیں میں آپ کے اس عطیہ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

والسلام

خاکسار الطاف حسین حالی ۲۸ جون ۱۹۱۲ء (۶۵)

مولانا حالی اور یحییٰ تنہا کے مابین خط وکتابت کا سلسلہ تھا مکتوبات حالی حصہ اول میں ۱۳ خطوط یحییٰ تنہا کے نام ملتے ہیں۔زیادہ تر خطوط میں کسی کتاب شاعری،نظم،غزل یا کسی ادبی شخصیت کا ذکر کیا گیا ہے۔تنہا نے جہاں مختلف شاعروں کے تذکرے لکھ کر اردو ادب میں نام کمایا وہاں شاعر کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔اپنی نظموں کے حوالے سے مراۃ الشعراء میں لکھتے ہیں:

''مجھ کو شروع ہی سے بیانیہ شاعری کا شوق رہا ہے چنانچہ میں زیادہ تر ایسی نظمیں لکھتا ہوں جن میں عنوان نظم کی ہو بہو تصویر کھینچ دی جائے یا واقعات کو بیان کر دیا جائے مولانا حالی اور حضرت صفی و جوش کے سوا ہمارے یہاں کے شعراء بیانیہ نظموں کو اپنے تخیل کی پرواز سے خیالی اور فرضی بنا دیتے ہیں اور جہاں تک ممکن

ہو واقعات کے بیان کرنے میں مبالغہ اور شاعرانہ رنگینی کو نظر انداز کر دیتا ہوں

البتہ رعنائی خیال کو پسند کرتا ہوں اسے گناہ نہیں سمجھتا۔''(۶۶)

وہ کسی واقع یا صورت حال سے متاثر ہو کر نظم لکھا کرتے تھے۔ مولانا حالی ان کی شاعرانہ قابلیت کی تعریف ایک اور خط میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

''آپ کی دونوں نظمیں تضمین صبر اور تضمین غزل حافظ دیکھ کر بہت دل خوش ہوا۔

آپ میں شاعری کی عمدہ قابلیت معلوم ہوتی ہے مگر افسوس کہ مجھ سے آپ کو کچھ

مدد نہیں مل سکتی میری ایک آنکھ میں موتیا کا پانی اتر آیا ہے اور اس کی روشنی بالکل

زائل ہوگئی ہے۔ دوسری آنکھ میں بھی آمد شروع ہوگئی ہے۔''(۶۷)

یحیٰی تنہا نے کئی یادگار کتابیں لکھیں جن میں سیر المصنفین جلد اول دوم ۱۹۲۴ معرآۃ الشعراء جلد اول ۱۹۴۵ء جلد دوم ۱۹۵۰ء دونوں کتابوں میں نامور شعراء کے تذکرے اور ان کے کلام پہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس میں قدیم اور جدید شعراء شامل ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تاریخ امریکہ، شاعرانہ خیالات تاریخ مغربی یورپ وغیرہ اہم ہیں قیام پاکستان کے بعد پاکستان آگئے اور ہیلی کالج آف کامرس لاہور میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۵۰ء میں انجمن احیائے ادب پاکستان لاہور کے زیر اہتمام یوم حالی منایا گیا۔ اس میں تنہا نے سیرت حالی پر ایک مفصل مقالہ پڑھا۔ جس میں لکھتے ہیں:

''حالی کی کوئی برائی ہم کو معلوم نہیں اور ہمارے سامنے ان کی زندگی آئینے کی طرح

صاف اور مجلی ہے اور اس کا کوئی تاریک پہلو ہمارے پیش نظر نہیں ہے شاعروں کا

کمال ان کے کلیات کے صفحوں پر روشن و ہویدا ہوتا ہے اور مصنفوں کے جواہر

پارے۔ ان کی کتابوں میں ہر وقت بصیرت افروز ہوتے رہتے ہیں۔ مگر وہ

خوبیاں اور نیکیاں جو کسی انسان کے وجود سے وابستہ ہوتی ہیں اس کے انتقال کے

بعد ناپید ہو جاتی ہیں اور ان کا نمونہ آنکھوں کے سامنے باقی نہیں رہتا۔ افسوس

قضاء کی دراز دستی نے حالی کی وفات سے وہ بے بہا نمونہ گم کر دیا۔''(۶۸)

۱۹۴۷ کے بعد بقیہ زندگی یحییٰ تنہا نے لاہور میں گزاری وہ علمی وادبی محفلوں او جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے لاہور میں ہی انتقال کیا۔

محمود احمد عباسی

محمود احمد عباسی ۳۱ مارچ ۱۸۸۵ صبح کے وقت امروہہ میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام سید محمد علی عباسی تھا۔جن کے متعلق مالک رام لکھتے ہیں:

''سید محمد علی عباسی نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے پہلی بیوی سے دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہوئے سب کے نام لکھنا طوالت سے خالی نہیں البتہ دو قابل ذکر ہیں سب سے بڑے محمد داؤد عباسی جو کسی زمانے میں علی گڑھ میں طالب علم تھے اور جن کا ذکر حالی کے بعض اشعار کی تضمین کے سلسلے میں بہت لوگوں نے کیا ہے......

سید محمد علی عباسی کی دوسری بیوی شیخ غلام محمد صدیقی کی صاحب زادی (صفیر النساء) تھیں۔ان بیگم سے ایک بیٹی اور چار بیٹے ہوئے محمود احمد عباسی بیٹوں میں سب سے بڑے تھے۔''(۶۹)

محمود احمد عباسی ابتدائی تعلیم امروہہ ہائی سکول سے حاصل کی لیکن ۱۸۹۷ میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اناؤ اور رائے بریلی جہاں ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد احسن عباسی میڈیکل آفیسر تھے چلے گئے۔میٹرک تک وہاں پڑھا اس کے بعد لکھنو آ گئے لیکن بعض سیاسی صحبتوں کے باعث تعلیم ادھوری رہ گئی کچھ دیر بعد روزگار کی تلاش میں بریلی چلے گئے اور مسلم ہائی سکول میں مدرس مقرر ہو گئے۔حسن اتفاق کہ ان دنوں مولانا حالی بھی اپنے نواسے عبدالولی کے علاج کے لیے بریلی آئے ہوئے تھے۔چنانچہ محمود احمد عباسی کی ملاقات مولانا حالی سے ہوئی اس طرح ان کا ادبی ذوق پروان چڑھا اور یہیں سے ان کی مضمون نگاری کا آغاز ہوا۔مولانا حالی بھی ان کے

ساتھ محبت کے ساتھ پیش آ ئے تھے جوان کے درمیان تعلقات کا سبب بنا اس طرح مولانا حالی کے جانے کے بعد ان کے مابین خط و کتابت کا سلسلہ چل نکلا ،مکتوبات حالی حصہ اول میں

۴ خط محمود احمد عباسی کے نام میں ایک خط میں مولانا حالی لکھتے ہیں:

''عزیزی سلمہم اللہ تعالی ! جوابی کارڈ بھیجنے کی شکایت کے بعد واضح ہو کہ میری طعبیت اب کسی قدر اچھی ہے۔ جیسے کہ بڑھاپے میں اچھی رہ سکتی ہے۔عبدالولی کی طعبیت بھی بفضل تعالی پہلے کی نسبت اچھی ہے۔خدا کا شکر ہے کہ سفر میں رہنا آپ کی طعبیت کے لیے مفید پڑا اور کام بھی آپ کے مزاق اور طعبیت کے موافق ہے آپ خط بھیجا کریں تو محصول ڈاک کے ادا کرنے کی فکر نہ کیا کریں اس سے بُوئے مغائرت آتی ہے۔

خاکسار الطاف حسین حالی از پانی پت

۲۲ جولائی ۱۹۰۸(۷۰)

ایک اور خط میں مولانا حالی اس طرح لکھتے ہیں:

''یہ سن کر نہایت مسرت ہوئی (بشر طیکہ آپ بھی خوش ہوں) کہ آپ کو پرسنل اسٹنٹی پر لے لیا گیا ہے صاحب زادہ صاحب نے یہاں بھی سجاد حسین کو اس امر کی اطلاع دی تھی امید ہے کہ آپ بھی علی گڑھ کے قیام کو دورہ پر ترجیح دیں گے اور اس کو دل سے پسند کریں گے۔''(۷۱)

جیسا کہ خط ظاہر ہوتا ہے کہ عباسی صاحب کو مسلم ایجو کیشن کانفرنس علی گڑھ میں صاحب زادہ آفتاب محمد خاں کے پرسنل اسسٹنٹ کے طور پر ملازمت مل گئی تھی۔محمود احمد عباسی کا تقریباً چودہ برس ان کے ساتھ رہے صاحب زادہ صاحب ان کے کام سے خوش ہو کر ان کو درجہ بدرجہ ترقی دے کر سپر نٹنڈنٹ بنا دیا تھا۔صاحب زادہ صاحب کے یہاں سے انگلستان جانے کے بعد وہ ملازمت سے فارغ ہو گئے اور واپس اپنے وطن امروہہ چلے

گئے وہاں سماجی کاموں میں مصروف ہو گئے اسی دوران مولانا محمد علی جوہر نے جنوری ۱۹۳۱ میں دہلی سے ''ہمدرد'' جاری کیا تو انہوں نے عباسی صاحب کو ادارتی عملہ میں شامل کرلیا۔امروہہ کے قیام کے دوران وہ تصنیف وتالیف کے کاموں میں بھی مصروف رہے۔ بقول مالک رام:

> ''امروہہ کے قیام زمانے میں انہوں نے ''تاریخ امروہیہ'' جلد اول اور پھر تذکرۃ الکرام، دوسری جلد اور ''تحقیق انساب'' تین کتابیں تصنیف کیں انہوں نے جو کچھ لکھا تحقیق وتدوین اور روایت ودرائیت کی تمام شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے حق پژدہی اور حق گوئی میں کسی قسم کی رورعائت ان کے سدِ راہ نہیں ہوئی ''تاریخ امروہہ'' میں اور پھر ''تحقیق انساب'' میں کئی خاندانوں کی کچا چھٹا تھا اس سے قدرتا سب لوگوں کو رنج ہوا اور انھوں نے سخت مخالفت کی عباسی صاحب نے تکلیف برداشت کی۔نقصان اٹھایا لیکن جو بات صحیح سمجھی اس کے اعلان سے باز نہ آئے اس پر مقدمہ بازی ہوئی اور بحیثیت مدعی اور مدعا علیہ دونوں میدانوں میں وہ ہر طرح کامیاب رہے۔''(۷۲)

انھوں نے شعراء امروہہ کا تذکرہ بھی مرتب کیا جو شائع نہ ہوسکا اس کے علاوہ عملی سیاست میں بھی حصہ لیا اور امروہیہ کانگرس کمیٹی کے رکن اور پھر صدر رہے۔وہ کچھ عرصہ مونسپل کمیٹی کے صدر اور اعزازی مجسٹریٹ کے عہدے پر بھی فائز رہے۔۱۹۷۴ میں کراچی میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

مرزا اسداللہ خان غالب

مرزا اسداللہ خان غالب ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ان کے دادا مرزا قوقان بیگ کی پیدائش سے تقریباً پچاس ساٹھ سال پہلے سمرقند سے ہندوستان آئے تھے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ مرزا غالب کے والد کا نام عبداللہ بیگ تھا جن کے تین بچے مرزا اسداللہ بیگ،مرزا یوسف بیگ اور ایک بیٹی تھیں

مرزا غالب کا پورا نام اسداللہ خان بیگ تھا اور مرزا نوشہ عرف تھی۔ بچپن میں ہی آپ کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اس وقت مرزا کی عمر صرف پانچ سال تھی۔ مرزا کے والد عبداللہ بیگ کی شادی آگرہ کے ایک معزز خاندان میں خواجہ غلام حسین کمیدان کی بیٹی عزت النساء سے ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے کہ مرزا کا آبائی وطن آگرہ قرار پایا۔ مرزا عبداللہ بیگ نے تمام عمر خانہ داماد کی حیثیت سے سسرال میں گزاری اور اولاد کی پرورش بھی ننھال میں ہوئی۔ مرزا کے والد عبداللہ بیگ پہلے لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے ہاں ملازم ہوئے لیکن جلد ہی وہاں سے حیدرآباد چلے گئے اور سلطنتِ آصفہ میں ملازمت اختیار کر لی۔ مرزا کے ننھیال کا شمار آگرہ کے نامور گھرانوں میں ہوتا تھا۔ یہاں ان کا بچپن بڑے آرام سے گزرا اور ہر طرح کا عیش و آرام میسر رہا۔ مرزا غالب کے والد کی وفات کے بعد ان کی پرورش ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے کی لیکن ۱۸۰۶ء میں وہ بھی دار فانی سے رخصت ہو گئے اور مرزا اپنے نانا خواجہ غلام حسین کمیدان کی سرپرستی میں چلے گئے۔ ابتدائی تعلیم شیخ معظم سے حاصل کی جو اس زمانے کے نامور استاد مانے جاتے تھے۔ مرزا غالب کی شادی کے متعلق ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

"۱۸۱۰ء میں نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی اور نواب احمد بخش خاں جھرو کہ و جاگیردار لوہارو کی بھتیجی امراؤ بیگم سے شادی ہوئی۔"(۷۳)

شادی کے وقت مرزا کی عمر ۱۳ برس تھی۔ شادی کے بعد ان کی آمد و رفت دلی میں زیادہ ہو گئی تھی چنانچہ کچھ عرصہ بعد انھوں نے دلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ دلی میں تقریباً پچاس برس رہے لیکن کرایے کے مکانوں میں رہے یہاں تک کہ ان کا انتقال بھی کرایے کے مکان میں ہوا جو حکیم محمود خان مرحوم کے دیوان کے ساتھ مسجد کی پچھلی طرف تھا۔ مرزا نے آگرہ میں ہی شعر و شاعری میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی اور یہاں سے ہی ان کی شاعری کا آغاز ہو جاتا ہے۔ مرزا کی شعر فہمی کے متعلق حالی یادگارِ غالب میں لکھتے ہیں:

"شعر فہمی اور کتاب فہمی میں وہ ایک مستثنیٰ آدمی تھے کیسا ہی مشکل مضمون ہو وہ ایک سرسری نظر میں اس کی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔"(۷۴)

مرزا کو ابتدا میں بیدل کا طرز شاعری پسند تھا جو مشکل لکھا کرتے تھے لیکن بعد میں مرزا جب دلی آئے تو

مولانا فضل حق اور دیگر اساتذہ کے کہنے پر طرز شاعری کو بدلہ اور عام فہم اور شگفتہ انداز اپنایا۔ بقول شیخ محمد اکرام:

> ''دہلی آنے کے بعد مرزا نے جس تیزی سے اپنا اسلوب شاعری بدلہ اس کا اندازہ
> اس امر سے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا بہترین اردو قصیدہ اور ذیل کے مطلعوں والی اردو
> غزلیں ۲۴ برس کی عمر سے پہلے لکھ چکے تھے۔، مثلاً:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک
آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے (۷۵)

۲۸ برس کی عمر میں انھوں نے رسالہ ''انشائے غالب'' لکھا جس میں فارسی خط و کتابت کے قواعد جمع کیے گئے تھے۔ یہ رسالہ عام فہم اور سلیس زبان میں لکھا گیا ہے۔ بقول شیخ محمد اکرام:

> ''اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خط و کتابت کا جو نفیس اسلوب مرزا نے تیس
> برس بعد اردو زبان میں اختیار کیا اور جس سے ان کے فارسی خطوط عاری ہیں اس
> وقت بھی انھیں پسند خاطر تھا۔''(۷۶)

مرزا غالب نظم و نثر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے علاوہ ازیں ان کے اخلاق و عادات بہت وسیع تھے وہ ہر کسی سے خندہ پیشانی سے ملا کرتے تھے ان کے ملنے والے ایک کثیر تعداد میں تھے۔ وہ انھیں دیکھ کر اور مل کر بہت خوش ہوا کرتے تھے۔

۱۸۵۷ء میں دلی کی بربادی کے وقت مرزا غالب دلی میں تھے جن کا ذکر ان کے خطوط میں جا بجا ملتا ہے۔ اپنے ایک خط میں نواب انور الدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

> ''حضرت! انہدام مساکن و مساجد کا میں کیا حال گزارش کروں باقی شہر کو وہ
> اہتمام مکانات کے بنانے میں نہ ہوگا۔ جواب والیان ملک کو ڈھانے میں ہے۔

اللہ اللہ قلعے میں اکثر اور شہر میں بعض بعض وہ شاہجہانی عمارتیں ڈھائی گئی ہیں کہ کدال ٹوٹ ٹوٹ گئے ہیں بلکہ قلعہ میں تو ان آلات سے کام نہ نکلا سرنگیں کھودی گئیں اور بارود بچھائی گئی اور مکانات سنگین اڑا دیئے گئے۔''(۷۷)

غالب اردو میں استادِفن کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے تھے ان کی شاگردوں کا ایک کثیر تعداد ہے جو خود بھی علم وادب میں بڑے نامور ہوئے ہیں جن میں نواب ضیاء الدین میر مہدی مجروح، قربان علی بیگ، سالک تفتہ، علاوالدین علائی نواب شیفتہ عتریر اور خواجہ حالی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ غالب سے مولانا حالی کا شاگردی کا تعلق ۱۸۵۲ء میں قائم ہوا جس کے متعلق شیخ محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں:

''مولانا حالی نے شاگردی کا جو تعلق غالب سے ۱۸۵۲ء میں قائم کیا تھا اسے غالب کی وفات (۱۸۶۹ء) تک نہایت وفاداری اور سعادت مندی کے ساتھ نبھایا اور انتقال کے بعد بھی استاد کا نہایت پر درد مرثیہ لکھ کر حق شاگردی ادا کردیا۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:

اشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد
بلبل ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات
اس کے مرنے سے مر گئی دلی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
اہلِ ھند اب کریں گے کس پہ ناز
رشکِ شیراز و اصفہاں نہ رہا

اس نے سب کو بھلا دیا دل سے
اس کو دل سے بھلائے گا اب کون
شہر میں ناتمام ہے حالی
غزل اس کی بنائے گا اب کون' (۷۸)

مرزا اپنی تحریروں خصوصاً خطوط میں اپنی ذات کو بڑی بے تکلفی کے ساتھ پیش کرتے تھے اور دوران مطالعہ پڑھنے والا یوں محسوس کرتے تھے جیسے ان کے ربرو بیٹھ کر باتیں سن رہا ہو۔غلام رسول مہران کے مکاتیب کے مطلق لکھتے ہیں:

''اردو نثر میں ان کے صرف مکاتیب ہیں یا چند تقریریں اور دیباچے لیکن حسن کلام، لطفِ بیاں، روانی والسجام، بے ساختگی اور دل آویزی میں نثر کا ایسا جلیل الشان مجموعہ نہیں مل سکتا۔''(۷۹)

اگرچہ خطوط میں بھی مرزا نے بعض جگہ مسجّعی و مقفیٰ عبارت لکھی ہے لیکن انھیں ان کے لکھنے کا انداز بے تکلفانہ ہے۔مرزا کے زمانے میں مسجّعی و مقفیٰ عبارت لکھنے کو نثر کی خوبی سمجھا جاتا تھا شاید اس سے انھوں، بعض موقعوں پر اس طرح کی عبارت لکھنے کی طرف توجہ کی لیکن لطف یہ کہ ان کے خطوط کا انداز اور طرز خوبصورت اور منفرد ہے جس کی تقلید محال ہے۔

مثلاً خواجہ غلام غوث نے نام کے نام لکھے گئے خط کا اقتباس دیکھیے:

''قبلہ! کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیونکر جیتا ہے۔''(۸۰)

مرزا غالب ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے اس دور میں انھیں نجم الدولہ، دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب ملے۔۱۸۵۲ء میں مہر نیم روز مکمل کی۔اردو نثر میں سادہ نگاری کے بانیوں میں سے تھے۔۷۲ سال کی عمر ۱۸۶۹ء میں وفات پائی اور درگاہ نظام الدین اولیا کے قریب دفن ہوئے۔کلیات نظم فارسی،

کلیات نثر فارسی، دیوانِ اردو، جو پہلی بار ۱۸۴۲ء میں چھپا اردو معلّٰی عودی ہندی یادگار تصانیف ہیں۔

منشی پیارے لال شاکر میرٹھی

منشی پیارے لال شاکر میرٹھی ۳ مارچ ۱۸۸۰ء بمقام دہلی میں پیدا ہوئے۔آپ کے دادا نے عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا جب آپ کے والد ابھی بچپن میں تھے۔گویا آپ مذہب کے اعتبار سے مسیحی تھی۔ابتدائی تعلیم کے بعد چرچ مشن ہائی سکول میرٹھ میں داخل ہوئے بڑے بھائی کی وفات کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا، تھوڑے عرصے کے بعد آپ کی والدہ کا بھی انتقال ہوگیا۔اس وقت آپ کی عمر تقریباً دس برس تھی۔آپ والدہ کی وفات کے بعد تلاش روزگار کے لیے لاہور آ گئے اور مشن ہسپتال لاہور میں بطور کمپوڈر ملازمت اختیار کی۔ ملازمت چونکہ طبیعت کے موافق نہ تھی اس لیے وہ چھوڑ کر فیروز پور روانہ ہو گئے۔وہاں سے پٹیالہ چلے گئے اور مہندر کالج پٹیالہ میں داخل ہو گئے لیکن تعلیم میں دل نہ لگا اور وہ پٹیالہ سے مظفر نگر چلے گئے وہاں سے گجرات (پنجاب) آ گئے۔شروع سے ہی لکھنے کا شوق تھا لہٰذا مختلف موضوعات پر مضامین لکھا کرتے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ شاعری کا بھی مزاج رکھتے تھے اور شوکت میرٹھی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔کئی ایک اخبارات و رسائل کے ساتھ منسلک رہے۔پندرہ روزہ رسالہ ''مخزن مسیحی'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہے۔

رسالہ ادیب جو آلہ آباد سے نکلتا تھا کے پہلے ایڈیٹر منشی نوبت رائے کی علیحدگی کے بعد آپ نے بطور ایڈیٹر ۱۹۱۱ء میں ذمہ داری سنبھالی اور ''ادیب'' کو شہرت اور ترقی سے ہمکنار کیا۔اس کے علاوہ آلہ آباد آنے کے بعد آپ کی مضمون نویسی میں بھی وسعت پیدا ہوئی اور آپ نے ادیب، مخزن، زمانہ اور عصمت وغیرہ میں مضامین لکھنے شروع کیے۔جن کا آپ کو معقول معاوضہ بھی مل جایا کرتا تھا۔انھوں نے جو مختلف اخبارات و رسائل میں مضامین لکھے ان کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔

آپ رسالہ ''العصر'' لکھنؤ کے ایڈیٹر بھی رہے۔''العصر'' جب نکلا تو مولانا حالی نے ایک مکتوب میں اس طرح اظہار خیال کیا۔

''العصر'' کے تینوں پرچے پہونچے جن کا شکریہ ادا کرنے میں دیر ہوگئی۔ یہاں تک کہ خط لکھنے کی زحمت ہوئی ''العصر'' کو دیکھ کر بہت جی خوش ہوا۔اللہ تعالی اس کو سرسبز اور کامیاب کرے۔ضرور ایسا ہی ہوگا ''ادیب'' کے ذریعے سے آپ کی لیاقت کے جوہر کھل چکے ہیں ''العصر'' میں میرا فوٹو جس نے دیکھا نہایت پسند کیا، اور تصویریں بھی نہایت عمدہ چھپی۔

میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ شاید کوئی اس بات کا آرزومند نہ ہوگا کہ ہندوستان کے ہندو مسلمان اور مسیحی سب ایک دوسرے کے دوست ہوں۔''(۸۱)

منشی دیا نرائن نگم

منشی دیا نرائن نگم مولانا حالی کے دوستوں میں سے تھے۔وہ ۱۸۸۴ء میں بمقام کانپور پیدا ہوئے۔آپ کے دادا منشی شیو سہائے کانپور کے مشہور وکیل اور وائس چیئر مین ڈسٹرکٹ بورڈ تھے جبکہ ان کے والد کا نام کنھیا لال نگم تھا اور کچہری میں پیش کار تھے۔

نگم نے اردو فارسی کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی پھر گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہوئے اور انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔کرائسٹ چرچ کالج سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی اور اسی کالج میں استاد بھی رہے۔وہ فارسی اور اردو پڑھایا کرتے تھے۔ان کے ہم عصر ادیبوں میں ابوالکلام آزاد، پریم چند، مولانا حسرت موہانی اور علامہ اقبال شامل تھے۔

منشی دیا نرائن نگم کے زمانہ طالب علمی سے ہی علمی و ادبی رجحان رکھتے تھے۔۱۹۰۳ء میں ''زمانہ'' کی ادارت سے پہلے بھی وہ مضامین لکھا کرتے تھے اور ان کے مضامین اس وقت کے مشہور رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے تھے۔بقول شیخ عبدالقادر ایڈیٹر ''مخزن'':

''میری ان کی ملاقات دیرینہ تھی۔ جب میں نے لاہور سے رسالہ ''مخزن'' جاری کیا تو دیا نرائن صاحب ابھی کالج میں پڑھتے تھے۔ غالباً بی۔اے کی جماعت میں تھے۔ ''مخزن'' کے اولین مضمون نگاروں میں تھے۔''(۸۲)

دیا نرائن نگم نے اپنے خاندانی پیشہ وکالت کے برعکس صحافت کو اپنایا اور ساری زندگی اسی پیشے سے منسلک رہے۔ ۱۹۰۳ء میں کانپور سے رسالہ ''زمانہ'' نکالا جو اپنے عہد کا نہایت اہم علمی و ادبی مجلّہ شمار ہوتا تھا۔ اردو زبان کے بہترین شاعر اور ادیب اپنی تخلیقات زمانہ کو ہی بھیجتے تھے۔ یہ مسلسل پچاس سال تک نکلتا رہا۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ایک ہفت روزہ سیاسی اخبار ''آزاد'' بھی نکالا۔

نگم کی شادی شکنتلا دیوی سے ہوئی تھی جو بہت سلیقہ شعار اور سلجھی ہوئی عورت تھی۔ انھوں نے ساری زندگی منشی دیا نرائن نگم کا ساتھ دیا۔ اور گھریلو امور سے ان کو دور رکھا۔ نگم صاحب کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں جو تقریباً تمام اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ان کی اولاد میں سب سے بڑے سری نرائن نگم تھے جنھوں نے اپنے والد کے انتقال کے بعد سات سال تک زمانہ اور آزاد جاری رکھا۔ ۱۹۴۹ء میں نامساعد حالات کے باعث یہ دونوں بند ہو گئے۔

رسالہ زمانہ کی اشاعت پر مولانا حالی نے ایڈیٹر کے نام جو خط لکھا اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''زمانہ'' کو میں دل سے پسند کرتا ہوں اور اس کو ان معدودے رسالوں میں شمار کرتا ہوں جو اردو لٹریچر کو ناشائستگی کے خس و خاشاک سے پاک کر رہے ہیں۔ میری دلی آرزو ہے کہ ''زمانہ'' نہ صرف اشاعت میں بلکہ شائستگی اور تہذیب میں روز افزوں ترقی کرے۔''(۸۳)

زمانہ کے لکھنے والوں میں حالی، اکبر الہ آبادی، جوش، پریم چند اور اقبال شامل تھے۔ پریم چند منشی صاحب کے قریبی دوستوں میں سے تھے اور ان کی ادبی تشکیل میں منشی دیا نرائن نگم نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ بقول نامی انصاری:

''پریم چند دیا نرائن نگم کے بہت مخلص اور قریب ترین دوستوں میں تھے اور وہ ان سے اپنی ذاتی زندگی میں بھی صلاح و مشورہ کرتے تھے اور ان پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔ پریم چند کے اکثر افسانے سب سے پہلے ''زمانہ'' میں شائع ہوئے اور یہیں سے ان کی شہرت کے دروازے کھلے۔''(۸۴)

منشی دیا نرائن نگم اردو زبان کی ترقی اور ترویج کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ ان کا شمار اردو زبان کے خدمت گاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو علم و ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اردو زبان مشترکہ سرمایا ہے۔ اقبال کا ترانہ ہندی ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' سب سے پہلے ''زمانہ'' ہی میں شائع ہوا۔ اس ضمن میں نامی انصاری لکھتے ہیں:

''اقبال کا ترانہ ہندی ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' جو کہ اب ہندوستان کا قومی ترانہ بن چکا ہے۔ سب سے پہلے رسالہ ''زمانہ'' ہی میں شائع ہوا تھا اور اس وقت اس کا عنوان تھا ''ہمارا دیس'' بعد میں کچھ تبدیلیوں کے ساتھ یہ ترانہ اقبال کی پہلی کتاب ''بانگِ درا'' میں شامل ہوا۔''(۸۵)

نگم صاحب بھرپور علمی و صحافتی زندگی گزارنے کے بعد یکم نومبر ۱۹۴۲ء کو وفات پائی۔ زمانہ نے ان کے لیے یادگار نمبر فروری ۱۹۴۳ء اور یادگار جشن رسالہ نمبر ۱۹۸۲ء نکالے جس کے ایڈیٹر سری نرائن نگم تھے۔

لکھنو سے ماہنامہ نیا دور منشی دیا نرائن نگم نمبر جون جولائی ۱۹۸۲ء میں نکالا گیا جس کے ایڈیٹر امیر احمد صدیقی تھے۔

نواب کلب علی خان والیٔ رام پور

نواب کلب علی خاں ۱۲۵۰ھ میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام نواب یوسف علی خاں تھا۔ ۱۸۶۵ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد مسند نشین ہوئے۔ ان کا عہد اردو شعر و ادب کے عروج کا زمانہ تھا۔ نواب

صاحب نہ صرف خود شاعری کرتے تھے بلکہ شعراء کے بڑے قدر دان تھے۔انھوں نے اپنی فیاضی اور سخاوت سے رام پور میں اہل فن کو جمع کیا اور چھوٹی سی ریاست کو علم و ادب کا گہوارہ بنا دیا۔ان کے عہد میں نامور شعرا علماء حکماء کے علاوہ دیگر اہل فن بھی رام پور میں موجود تھے۔جن میں مظفر علی اسیر، داغ، امیر مینائی، جلال، امداد علی بحر، آتش، شاداں قلق جیسے مشاہیر ادب شامل ہیں جبکہ علماء میں علامہ عبدالحق خیر آبادی، سید حسن شاہ محدث اور مفتی سعد اللہ جیسے جید عالم بھی شامل تھے۔اس کے علاوہ سینکڑوں ایسے اہل فنون تھے جن کی پرورش ریاست کے ذمہ تھی۔نواب کلب علی خاں نے ابتدائی تعلیم مولوی فضل حق خیر آبادی سے حاصل کی تھی۔وہ اردو اور فارسی لکھنے میں مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی تھے۔اردو میں امیر مینائی سے مشورہ سخن کرتے تھے اور انھیں کلام دکھاتے تھے اور نواب تخلص کرتے تھے۔شعر ملاحظہ ہو:

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیا مسکرا کے ہاتھ (۸۶)

ترانۂ غم، قندیل حرم، شگوفۂ خسروی، بلبل نغمہ سنج مشہور تصانیف ہیں جبکہ فارسی میں تاج فرضی کے نام سے دیوان مشہور ہے۔

نواب کلب علی خاں کے دور میں ایک اہم بات جو سامنے آئی وہ یہ ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے شاعروں کے ملاپ سے ایک نئی طرز کی شاعری سامنے آئی۔اردو شاعری کے اہم چہرے جو توجہ کی طالب ہے مثلاً تسلیم اگر چہ ان کا تعلق لکھنؤ سے تھا مگر شاعری میں دہلوی رنگ جھلکتا ہے۔اسی طرح داغ کی شاعری پر جرأت کا اثر نظر آتا ہے۔اگر چہ وہ ذوق کے شاگرد تھے۔

رام پور میں ان کے عہد میں ایک مشہور میلہ باغ بے نظیر منعقد ہوتا تھا۔یہ میلہ امراء کے لیے تھا۔کلب علی خاں سنی العقیدہ مسلمان تھے ان کے عہد میں ایک نہر برائے آبپاشی نکالی گئی جو ریاست کے مختلف حصوں کو سیراب کرتی تھی۔ریونیو کا محکمہ بڑا منظم تھا۔ریاست میں ۲۵۰۰ کے لگ بھگ فوجیوں کی تعداد تھی اور جنرل سب سے بڑا عہدہ تھا۔لائبریریوں کا نظام بڑا موثر طریقے سے چلتا تھا۔۱۳۰۴ میں انتقال ہوا۔

نواب محسن الملک سید مہدی علی خان

نواب محسن الملک سید مہدی علی خاں اٹاوہ میں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔اسلامی طرز کے مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی اور اپنی خدا داد صلاحیتوں کے بل بوتے پر ترقی کرتے ہوئے تحصیل دار کے عہدے تک پہنچ گئے۔۱۸۶۳ء میں مقابلے کا امتحان پاس کرنے کے بعد مرزاپور میں ڈپٹی کلکٹر تعینات ہوئے۔۱۸۷۵ء ان کی محنت اور قابلیت کی بنا پر سر سالار جنگ نے انھیں (انسپکٹر جنرل) مالیات مقرر کیا۔بحوالہ مکاتیب:

> ''نواب محسن الملک چند مختلف خدمات انجام دینے کے بعد سر سالار جنگ اول کے ریونیو سیکرٹری ہوئے اور نواب سالار جنگ ثانی کے زمانہ وزارت میں فنانشل سیکرٹری کے عہد پر فائز ہوئے اور اپنی خداداد قابلیت اور ذہانت کی وجہ سے وزیر کے مشیر خاص اور نفسِ ناطقہ ہو گئے۔''(۸۷)

نواب محسن الملک نے اپنے عہد میں فارسی کی بجائے اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کروایا۔ ۱۸۸۸ء میں معدنیات اور ریلوے کے مشہور مقدمہ کی نگرانی اور شہادت کے لیے لندن گئے انھیں سرکار سے محسن الدولہ اور محسن الملک کے خطاب بھی عطا ہوئے۔۱۹۰۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد علی گڑھ آ گئے اور سرسید کے انتقال اور سید محمود کی سیکرٹری شپ کے بعد کالج کے اعزازی سیکرٹری مقرر ہوئے۔انھوں نے کالج کی تعمیر و ترقی کے لیے مثبت کام کیا اور کالج کی مالی حالت کو مستحکم کیا۔وہ سٹی بورڈ کے معتمد بھی رہے، ان کے زمانے میں کالج کا طالب علم ہونا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔انھوں نے ۱۹۰۰ء میں اردو ہندی تنازعہ کے دوران اردو کی حمایت میں ایک زبردست تقریر کی اور تحفظ اردو کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔مولانا حالؔی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''سید مہدی علی مسلمانوں کے دلوں کو ان کے بزرگوں کے کارنامے یاد دلا دلا کر ابھارتے تھے اور جو کچھ انھوں نے سرسید کی تائید میں لکھا وہ بڑے استدلال و استنا

سے لکھا۔ اکثر ان کے مضامین جو ایک اچھی خاصی کتاب کے برابر بڑی تلاش اور محنت سے لکھے گئے ہیں اسی طرح مولانا شبلی نعمانی بھی ان کی تعریف کرتے ہیں وہ کہتے ہیں میدانِ ادب میں کسی بڑے نثار سے پیچھے نہیں رہے ان کا ایک خاص طرز تحریر ہے۔"(۸۸)

عبدالرزاق کانپوری ان کے متعلق اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

"مہدی علی خاں، میر ضامن علی خاں رئیس اٹاوہ (شمالی ہند) کے نامور فرزند ہیں جن کا سلسلہ نسل سادات بارہا (بادشاہ) سے ملتا ہے۔ میر صاحب کا خاندان دولت اور علم سے محروم تھا مگر سید صاحب اپنے نانا مولوی محمد علی (صدر الصدور) کے آغوش میں علم و ادب کی تعلیم پائی۔ سنہ ولادت ۱۲۵۳ھ ہے غدر ۱۸۵۷ء میں ۲۰ سال کی عمر تھی، مکتبی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے اور مذہباً شیعہ تھے۔ فن مناظرہ کا ابتدا سے شوق تھا۔ لہٰذا شیعہ سنی کی مذہبی کتابوں پر عبور تھا۔ تحقیق ذوق کے بعد یکا یک اہل سنت و جماعت کے طبقے میں داخل ہو گئے اور اسی مذہب میں خاتمہ بالخیر ہوا۔

آیات بینات (ردشیعہ) لکھی جو تمام ہندوستان میں مقبول ہے۔"(۸۹)

اکتوبر ۱۹۰۷ء میں انھوں نے شملہ میں وفات پائی اور علی گڑھ میں دفن ہوئے۔

نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین

وقار الملک مولوی مشتاق حسین ضلع میرٹھ کے ایک گاؤں سراوہ میں ۱۴ مارچ ۱۸۴۱ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ فضل حسین تھا اور تعلق کمبوہ خاندان سے تھا۔ جبکہ والدہ کا تعلق امروہہ سے تھا۔ آپ کی عمر ابھی چھ برس تھی کہ والد انتقال کر گئے اور آپ کی والدہ یتیم بچے کو لے کر امروہہ چلی گئیں۔ لہٰذا یہی مولانا کا وطن قرار پایا۔ قرآن

پاک کی تعلیم کے بعد عربی، فارسی پڑھی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک سکول میں مدرس کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ بعدازاں انکم ٹیکس میں محرر کی حیثیت سے منسلک ہوئے۔ تحصیل داری کا امتحان بھی پاس کیا لیکن جلد ہی استعفٰی دے کر سرسید کی سفارش پر حیدرآباد چلے گئے اور ترقی کرتے ہوئے معتمد عدالت کے عہدے تک پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ سر آسمان جاہ، بہادر کی وزارت میں ریاست کے معاملات میں بہت زیادہ عمل دخل رہا۔ ۱۹۱۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن واپس آ گئے۔ انھیں محنت اور بہترین سرکاری خدمات انجام دینے کی بنا پر سرکار آصفیہ سے وقار الملک اور وقارالدولہ کے خطاب ملے۔ وطن واپس آنے کے بعد انھوں نے تعلیمی اور سیاسی سرگرموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ وہ مسلم لیگ کے بانیوں میں تھے۔ محسن الملک کے انتقال کے بعد وہ کالج کے سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کے سلسلے میں ان کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تہذیب الاخلاق کے مہتمم اور سائیفک سوسائٹی کے ممبر بھی رہے۔ انھوں نے انگریزی کتاب ''فرنچ ریزولیوشن اینڈ نپولین کا اردو ترجمہ کیا جو نولکشور پریس سے شائع ہوا۔

۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء میں وفات پائی اور امروہہ میں دفن ہوئے۔ ان کے انتقال پر غلام رسول مہر نے اس طرح اظہار خیال کیا:

> ''نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبر و سیاست کا ماتم کیا۔ مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا۔ مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے نقصان کا نوحہ کیا۔ مولانا حاؔلی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخن وری اور نکتہ سنجی پر آنسو بہائے لیکن نواب وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور اولوالفرمانہ اخلاق کی گم شدگی پر فریاد۔''(۹۰)

نواب وقار الملک کی ذات اور شخصیت کے حوالے سے عبدالرزاق کانپوری اپنی کتاب ''یادِ ایام'' میں لکھتے ہیں:

> ''میرا یہ دعویٰ ہے جس کی کوئی تردید نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کو نواب وقار الملک

جیسا دوسرا لیڈر (مصلح قوم) نہیں ملا، ان کی آزاد خیالی، استقلال، دین داری اور سچائی، ضرب المثل تھی۔ وہ کالج کے پہلے سیکرٹری تھے جنھوں نے یورپین پرنسپل اور پروفیسروں کا زور توڑا......

مزید لکھتے ہیں:

نواب صاحب جو رائے ایک مرتبہ قائم کر لیتے تھے پھر اس میں تجاوز نہ کرتے تھے اور نیک نیتی سے اس کام کی تکمیل میں مصروف ہو جاتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ سرسید بھی نواب صاحب سے بہت ڈرتے تھے اور ان کی کبھی مخالفت نہ کرتے تھے۔'' (۹۱)

وجاہت حسین جھنجھانوی، مولوی

مولوی وجاہت حسین جھنجھانوی جھنجھانہ ضلع مظفر گڑھ کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام مولوی محمد مخدوم تھا جو اپنے زمانے کے مشہور واعظ، حکیم، مصنف اور مناظر تھے۔ وہ فنانشل کمشنر پنجاب میں ملازم تھے۔ اس کے علاوہ بھاٹی دروازہ لاہور کی مسجد میں درس بھی دیا کرتے تھے۔ مولوی وجاہت حسین کی والدہ کا تعلق لاہور سے تھا۔ جھنجھانہ ضلع مظفر گڑھ میں ان کا خاندان حکیموں کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ان کا پنجاب سے مستقل اور مستحکم تعلق ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں کے موضع نواں کوٹ ضلع لاہور کے ایک پٹواری سید فضل حسین شاہ کی بیٹی سے شادی کر لی تھی۔

آپ نے مختلف اخبارات و رسائل میں کئی اہم موضوعات پر مضامین لکھے۔ آپ کو تحریر کا ملکہ حاصل تھا اور اپنے مضامین اور تحریروں کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان کے مشہور اخبار ''زمیندار'' میں ۱۹۱۱ء میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے منسلک ہوئے اور مولوی ظفر علی خاں جیسے صاحب علم و فضل کے ساتھ کام کرتے رہے۔ مولانا ظفر علی خاں ان کے کام سے خوش تھے اور انھوں نے مولوی وجاہت حسین جھنجھانوی کا

معقول معاوضہ مقرر رکھا تھا۔آپ کی تحریریں اور مضامین اعلیٰ درجے کی خصوصیات سے مزین ہوتی تھیں۔مولوی وجاہت حسین جھنجھانوی مولانا حالی کے قدردانوں میں سے تھے اور مولانا حالی بھی ان کو شفقت اور محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔مولانا حالی نے مولانا ظفر علی خان کے سفر مغرب کے وقت چند اشعار لکھ کر مولوی وجاہت حسین کو بھیجے جن میں چند ایک درج ذیل ہیں:

اے مالکِ دفترِ ''زمیندار''	اے نازشِ قوم و فخرِ اقراں
اے روحِ و روانِ جمع احباب	اے چشم و چراغِ بزم اخواں
پنجاب کو تجھ پہ ہے اگر فخر	ہے اس کو یہ فخر و ناز شایاں
زندہ ہے وہ ملک اور ملت	ہوں زندہ دل ایسے جس میں انساں (۹۲)

وحشت کلکتوی

رضا علی وحشت کلکتوی ۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء کو بروز جمعۃ المبارک ۱۴ کڑایہ روڈ کلکتہ میں پیدا ہوئے۔والد کا نام سید شمشاد علی تھا۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔اس کے بعد کلکتہ کی یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔انٹرنس کا امتحان کلکتہ یونیورسٹی سے پاس کیا۔شاعری کا شوق تھا اور شمس فرید پوری سے اصلاح لیتے تھے جو داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔وحشت اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبان کا گہرا شعور رکھتے تھے۔وہ صاحب مطالعہ شخص تھے ان کی شخصیت اور وضع قطع کے متعلق ان کے شاگرد ڈاکٹر وفا راشدی لکھتے ہیں:

> ''مولانا بے حد تندرست و توانا اور دراز قد تھے۔جلال و جمال کا پیکر مجسم، ان کا رنگ صاف تھا۔بڑی بڑی آنکھیں جن میں خلوص و محبت اور شرافت و مروت کے موتی چمکتے تھے۔کشادہ پیشانی ذہانیت وعظمت کا آئینہ، چہرہ کی وجاہیت سنجیدگی اور متانت میں شوخی و ظرافت کی جھلک نمایاں۔روزانہ داڑھی مونڈتے تھے۔مونچھیں ہلکی ہلکی لیکن بارعب۔گفتگو فرماتے تو منہ سے پھول جھڑتے۔چہرے پر

ہر حال میں تبسم رقصاں نظر آتا تھا۔غرض ان کی شخصیت میں ایک عجیب طرح کی
مقناطیسی کشش تھی ۔وضع داری کا یہ عالم تھا کہ زندگی وفاداری بشرطِ استواری اصل
ایمان کی تفسیر بن کر ایک ہی روش پر گامزن رہ کر گزار دی۔''(۹۳)

وحشت اگر چہ کلکتہ میں پیدا ہوئے اور زندگی بھر کلکتے میں ہی رہے لیکن ایسی فصیح اردو بولتے اور لکھتے تھے کہ اہل زبان بھی اس کا اعتراف کرتے تھے۔مثلاً مولانا احمد علی شوق قدوائی لکھنوی وحشت کی زبان کے مطلق لکھتے ہیں:

''حضرت وحشت کلکتہ کے رہنے والے ہیں لیکن انھوں نے زبان کو اس قدر
صاف درست اور بامحاورہ کیا ہے کہ گویا وہ دہلی یا لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں
رہے۔''(۹۴)

جبکہ مرزا کاظم حسین لکھنوی اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''تمام دیوان دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا اصل نمونہ ہے۔''(۹۵)

اس بات کا اعتراف خود وحشت کو بھی ہے وہ لکھتے ہیں:

وحشت میری زبان کو تو اہل زباں سے پوچھ
ماہر زبان کے ہوں فقط اہلِ زباں غلط

مولانا حالی وحشت کلکتوی کے بزرگ ہم عصر تھے۔وحشت ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے جبکہ مولانا حالی کا سنِ ولادت ۱۸۳۷ء ہے۔۱۹۱۰ء میں جب ''دیوانِ وحشت'' شائع ہوا جس کا ایک نسخہ انھوں نے مولانا حآلی کو بھیجا اس پر مولانا حالی نے وحشت کو جو خط لکھا اس کا اقتباس ملاحظہ ہو۔لکھتے ہیں:

''مولانا اگر انصاف سے دیکھیے تو مرزا کا تتبع کرنا ہم لوگوں کا حق تھا۔مگر آپ نے
یہ ہمارا حق ہم سے چھین لیا ہے سچ ہے
''دورانِ باخبر در حضور و نزدیکانِ بے خبر دور''
تکلف بر طرف اگر مرزا صاحب کے ان بلند اور اچھوتے خیالات کو جن میں وہ

اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے مستثنیٰ کرلیا جائے تو آپ کے اردو دیوان کو بلاشائبہ تصنع کے کلام کا نمونہ قرار دینا ہرگز داخل مبالغہ نہیں ہوسکتا۔اور چونکہ ایشیا کی قدیم شاعری بظاہر چراغ سحری معلوم ہوتی ہے اور فارسی زبان ہندوستان سے آہستہ آہستہ مفقود ہوتی جاتی ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ کیا اردو اور کیا فارسی دونوں زبانوں میں ایسے دیوانوں کے شائع ہونے کی بہت ہی کم امید ہے۔

خدا تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت دے۔آپ ہمارے قدیم اہل کمال کی یادگار اور ان کا نام زندہ کرنے والے ہیں۔والسلام مع الاکرام

خاکسار دعا گو

الطاف حسین حالی"(۹۶)

وحشت کی مولانا حالی کے ساتھ خط و کتابت تھی اور دونوں کا آپس میں پرخلوص تعلق تھا۔وحشت نے حآلی پر ایک مضمون "حالی بحیثیت غزل گو"مخزن لاہور ۱۹۰۸ء کے شمارہ میں لکھا۔

وحشت کے تین شعری مجموعے ہیں:

۱۔ دیوانِ وحشت،۱۹۱۰ء میں ستارۂ ہند پریس کلکتہ سے شائع ہوا

۲۔ ترانۂ وحشت،۱۹۵۳ء میں مکتبہ جدید لاہور سے طبع ہوا

۳۔ نقوش آثار،۱۹۵۷ء میں مکتبہ عارفین ڈھاکہ سے چھپا

جبکہ ان کی نثری تخلیقات میں "دیوان شمس" (جوان کے استاد تھے) پر مقدمہ لکھا اور شائع کیا۔اس کے علاوہ کئی ایک مقالات یادگار ہیں۔

۲۰ جولائی ۱۹۵۶ء میں انتقال کیا اور عظیم پورہ ڈھاکہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

آپ کے شاگردوں کی کثیر تعداد ہے۔جن میں ابو جعفر کشفی،مسرت نعمانی،ڈاکٹر اختر امام پروفیسر عباس علی،طاہر علی شاکر کلکتوی،آصف بنارسی ظفر ہاشمی اور ڈاکٹر وفا راشدی شامل ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ شاہد احمد دہلوی، پیش لفظ، آغا شاعر دہلوی، حیات و شاعری مرتبہ مجتبیٰ حسین، مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبرز وکٹوریہ روڈ، کراچی، ۱۹۷۰ء، ص ۹

۲۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، پہلو دار شخصیت، مشمولہ آغا شاعر حیات و شاعری، ص ۱۷۷

۳۔ جمیل احمد صدیقی، مشمولہ آغا شاعر حیات و شاعری، ص ۵۹۔۵۸

۴۔ اثر جلیل، حضرت آغا شاعر، مشمولہ آغا شاعر حیات و شاعری، ص ۳۲۔۳۳

۵۔ عبدالحق، مولوی، حضرت آغا شاعر، مشمولہ آغا شاعر حیات و شاعری، ص ۳۲۵

۶۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی، مشمولہ مضمون آغا شاعر حیات و شاعری، ص ۳۲۴

۷۔ عبدالقدیر بدایونی، مفتی، قادری، مشمولہ مضمون آغا شاعر حیات و شاعری، ص ۳۲۷

۸۔ حالی الطاف حسین، مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، اردو مرکز گنپت روڈ لاہور، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۰ء، ص ۸۷

۹۔ جمیل احمد صدیقی، آخری شاعر، مشمولہ مضمون آغا شاعر دہلوی، حیات و شاعری، ص ۵۹

۱۰۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، مرتب، اردو کا بہترین انشائی ادب، میری لائبریری انارکلی لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۱۳۱

۱۱۔ سعود الحسن، روہیلہ، رام پور تاریخ و ادب، ابلاغ پبلشرز، امین مارکیٹ لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۶۵

۱۲۔ امیر مینائی، خطوطِ امیر مینائی، مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقب باہتمام دائرہ ادبیہ لکھنؤ، ۱۹۰۱ء

۱۳۔ حالی الطاف حسین، خطوط امیر مینائی پر مولانا حالی کا اظہار خیال، کلیات نثر حالی، حصہ دوم، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۳۱۰

۱۴۔ سکسینہ رام بابو، تاریخ ادب اردو، عشرت پبلشنگ ہاؤس ہسپتال روڈ لاہور، س ن، ص ۴۲۲

۱۵۔ اسماعیل مینائی، امیر مینائی، نقوش، شخصیات نمبر ۲، ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۵۶ء، ص ۱۳۹

۱۶۔ مالک رام، حبیب الرحمٰن شروانی، مشمولہ نقوش شخصیات نمبر ۲، مرتب محمد طفیل، ادارہ فروغِ اردو مال روڈ لاہور، ص ۸۰۴
۱۷۔ حالی الطاف حسین، مکتوباتِ حالی، حصہ اول، مرتب خواجہ سجاد حسین، حالی پریس پانی پت، ۱۹۲۵ء، ص ۶۔۷
۱۸۔ مالک رام، حبیب الرحمٰن شروانی، مشمولہ نقوش شخصیات نمبر ۲، مرتب محمد طفیل، ص ۸۱۱
۱۹۔ سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ، جلد اول، دفتر فرہنگِ آصفیہ، دہلی، واقع گلی شاہ تارا سے شائع ہوئی، گلزارِ محمدی سٹیم پریس لاہور، میں طبع ہوئی۔ ۱۹۱۸ء، ص ۸
۲۰۔ سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ، جلد اول، ص ک
۲۱۔ رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، عشرت پبلشنگ ہاؤس ہسپتال روڈ لاہور، ص ۶۷۵
۲۲۔ صباالدین عبدالرحمٰن، سید، سلمان ندوی، مشمولہ نقوش، شخصیات نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۵۶ء، ص ۱۸۲
۲۳۔ صباالدین عبدالرحمٰن، سید، مضمون مولانا شبلی نعمانی، مشمولہ نقوش، شخصیات نمبر، ادارہ فروغِ اردو، ص ۱۸
۲۴۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، اردو کا بہترین انشائی ادب، میری لائبریری لاہور، ۱۹۵۲ء، ص ۱۰۹
۲۵۔ سکسینہ رام بابو، تاریخ ادب اردو، ص ۶۵، ۶۶
۲۶۔ اے ایچ کوثر، ڈاکٹر، اردو کی عملی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقاء کار کا حصہ، لائبریری پروموشن بیورو کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۲۹۵
۲۷۔ عبداللطیف اعظمی، مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، شبلی اکادمی نزول باغ دہلی، ۱۹۴۵ء، ص ۳، ۴
۲۸۔ اینڈریوز۔ سی۔ ایف۔ تذکرۂ مولوی ذکا اللہ دہلوی، مترجم ضیاء الدین احمد برنی بی اے مشہور پریس کراچی تعلیمی مرکز، ۱۹۵۲ء، ص ۸۱
۲۹۔ اینڈریوز۔ سی۔ ایف۔ تذکرۂ مولوی ذکا اللہ دہلوی، ۱۹۵۲ء، ص ۸۳

۳۰۔ اینڈ ریوز۔سی۔ایف۔تذکرۂ مولوی ذکا اللہ دہلوی،مترجم ضیاء الدین احمد برنی بی اے۔مقدمہ مولوی نذیر احمد دہلوی،۱۹۵۲ء،ص ۵

۳۱۔ سجاد دہلوی،سید،ڈاکٹر،پیش لفظ،تذکرۂ مولوی ذکاء اللہ،اینڈ ریوز۔سی۔ایف۔۱۹۵۲ء،ص الف

۳۲۔ اے ایچ کوثر،ڈاکٹر،اردو کی علمی ترقی میں سرسید اوران کے رفقاء کا رکا حصہ،ص ۳۸

۳۳۔ اسماعیل پانی پتی،سرسید احمد خان،مشمولہ نقوش،شخصیات نمبر۲،ادارہ فروغ اردو لاہور،۱۹۵۶ء، ص ۱۳۸۵

۳۴۔ اینڈ ریوز۔سی۔ایف۔تذکرۂ مولوی ذکا اللہ دہلوی،مترجم ضیاء الدین احمد برنی،ص ۱۰۱،۱۰۲

۳۵۔ محمد عبدالرزاق،کانپوری،یادِ ایام،عبدالحق اکیڈمی،اشاعت منزل کوچہ عبدالحق حیدر آباد دکن،۱۹۴۶ء، ص ۲۹۲

۳۶۔ گوہر نوشاہی،ڈاکٹر،سید امتیاز علی تاج شخصیت اور فن،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد،۱۹۹۹ء، ص ۱۲

۳۷۔ گوہر نوشاہی،ڈاکٹر،سید امتیاز علی تاج شخصیت اور فن،ص ۱۶

۳۸۔ ظفر علی خاں،مکاتیب ظفر علی خاں،مرتبہ زاہد منیر عامر،سنی پبلی کیشنز اردو بازار لاہور،۱۹۸۶ء،ص ۳۹

۳۹۔ ظفر علی خاں،مکاتیب ظفر علی خاں،مرتبہ زاہد منیر عامر،ص ۴۰

۴۰۔ مجیب الرحمان شامی،ابتدائیہ،مشمولہ کلیات مولانا ظفر علی خان،ترتیب زاہد علی خاں،الفیصل ناشران و تاجر کتب لاہور،ص ۱۹

۴۱۔ ایضاً،ص ۴۲

۴۲۔ عنایت اللہ نسیم سوہدروی،ظفر علی خاں اوران کا عہد،اسلامک پبلشنگ ہاؤس لاہور،ص ۴۷۳

۴۳۔ عنایت اللہ نسیم سوہدروی،ظفر علی خاں اوران کا عہد،ص ۴۷۱

۴۴۔ مجیب الاسلام، ڈاکٹر، دارالترجمہ عثمانیہ کی علمی و ادبی خدمات، ناشر مجیب الاسلام ۴۴ کیا بیاں سٹریٹ جامع مسجد دہلی، س ن، ص ۵۵

۴۵۔ رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر، ڈاکٹر عبدالحق کے تحقیقی کارنامے، مطبوعہ ماہنامہ 'مجلس' حیدر آباد دکن اکتوبر ۱۹۶۰ء مولوی عبدالحق نمبر، ص ۱۲۱

۴۶۔ خاکی قزلباش، عبدالحلیم شرر، مشمولہ نقوش، شخصیات نمبر، مرتب محمد طفیل، ادارہ فروغ اردو مال روڈ لاہور، جنوری ۱۹۵۶ء، ص ۴۵

۴۷۔ ایضاً، ص ۴۷

۴۸۔ حالی الطاف حسین، کلیات نثر حالی، حصہ دوم، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی اردو، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۳۴۶

۴۹۔ لالہ سری رام، خمخانہ جاوید، (تذکرہ ہزار دستان) مخزن پریس دہلی، پہلی جلد ۱۹۰۸ء، ص ۶۷۴

۵۰۔ سعیدہ بانو، مولانا عبدالرزاق کانپوری، مشمولہ ناموران علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جلد ۲۴، ۱۹۸۸ء، ص ۵۶

۵۱۔ ایضاً، ص ۵۶

۵۲۔ حالی الطاف حسین، مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، اردو مرکز گنپت روڈ لاہور، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۰ء، ص ۱۰۷

۵۳۔ ایچ آر تیموری، ڈاکٹر، پیش لفظ، یادِ ایام، ص ۱۰

۵۴۔ محبوب عالم، مولوی، (چیف ایڈیٹر "پیسہ اخبار")، اخبار نویسوں کے حالات (لاہور کے اخبارات و رسائل)، س ن، ص ۲

۵۵۔ محمد باقر آغا محمد حسین آزاد، مشمولہ نقوش شخصیات نمبر، ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۵۵ء، ص ۱۱

۵۶۔ آزاد، محمد حسین، مجموعہ مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر بنیرہ، حضرت آزاد میر بخش منیجر کے اہتمام کریمی پریس لاہور سے چھپا، س ن، ص ۱۱، ۱۲

۵۷۔ محمد باقر آغا محمد حسین آزاد،مشمولہ نقوش شخصیات نمبر،ص ۱۲

۵۸۔ آزاد، محمد حسین، مجموعہ مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر بنیرہ، س ن، ص ۹

۵۹۔ محمد عبدالرزاق کانپوری، یادِ ایام، عبدالحق اکیڈمی اشاعت منزل کوچہ عبدالحق حیدر آباد دکن، ۱۹۴۶ء، ص ۲۹۸، ۲۹۷

۶۰۔ حالی الطاف حسین، کلیات نثر حالی، جلد دوم، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۳۴۶

۶۱۔ مشرف علی، ڈاکٹر، محمد علی جوہر، مشمولہ ناموران علی گڑھ، جلد ۲۴، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۸۸ء ص ۳۴

۶۲۔ حالی الطاف حسین، کلیات نثر حالی، جلد اول، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلسِ ترقی ادب لاہور، ۱۸۶۷ء، ص ۵۱۹

۶۳۔ حالی الطاف حسین، مکتوبات حالی، حصہ اول، مرتبہ خواجہ سجاد حسین، حالی پریس پانی پت، ۱۹۲۵ء، ص ۱۲۱

۶۴۔ تنہا محمد یحییٰ، مراۃ الشعرا، جلد دوم، شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور، مارچ ۱۹۵۰ء، ص ۳۷۶

۶۵ حالی الطاف حسین، مکتوبات حالی، حصہ اول، مرتبہ خواجہ سجاد حسین، حالی پریس پانی پت ۱۹۲۵ء، ص ۱۳۷

۶۶ تنہا محمد یحییٰ، مراۃ الشعرا، جلد دوم شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور ۱۹۵۰ء، ص ۳۸۷

۶۷ حالی الطاف حسین، مکتوبات حالی، حصہ اول، مرتبہ خواجہ سجاد حسین، ص ۱۳۳

۶۸۔ تنہا محمد یحییٰ، پروفیسر، سیرت حالی، مقالہ مشمولہ مقالات یوم حالی، مرتبہ ناصح زاہدی، انجمن احیائے ادب پاکستان لاہور، ۱۹۵۱ء، ص ۳۲

۶۹۔ مالک رام، محمود احمد عباسی، مشمولہ ناموران علی گڑھ، جلد اول، مسلم یونیورسی علی گڑھ ۱۹۸۸ء، ص ۱۷۹

۷۰۔ حالی الطاف حسین، مکتوبات حالی، حصہ اول، مرتب خواجہ سجاد حسین، ص ۱۱۷

۷۱۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۷۲۔ مالک رام، محمود احمد عباسی، مشمولہ ناموران علی گڑھ، جلد اول، مسلم یونیورسی علی گڑھ ۱۹۸۸ء، ص ۱۷۱

۷۳۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، مطالعہ غالب، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۹

۷۴۔ حالی الطاف حسین، یادگار غالب، کشمیر کتاب گھر اردو بازار لاہور، س ن، ص ۷۰

۷۵۔ محمد اکرام شیخ، حیاتِ غالب، فیروز سنز لاہور، ص ۵۶، ۵۷

۷۶۔ محمد اکرام شیخ، حیاتِ غالب، ص ۶۲

۷۷۔ ایضاً، ص ۱۵۶

۷۸۔ اسماعیل پانی پتی، شیخ، مشمولہ مضمون غالب اور حالی کے تعلقات، صحیفہ حالی نمبر، شمارہ ۵۸، جنوری ۱۹۷۲ء، ص ۱۸، ۱۹

۷۹۔ غلام رسول مہر، مقدمہ خطوط غالب، مشمولہ تنقید غالب کے سو سال، مرتبہ گروپ کیپٹن سید فیاض محمود، مجلس یادِگار غالب، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۲۹

۸۰۔ محمد اکرام شیخ، حیاتِ غالب، فیروز سنز لاہور،

۸۱۔ حالی الطاف حسین، مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، اردو مرکز گنپت روڈ لاہور، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۰ء، ص ۱۱۰

۸۲۔ محمد حنیف شاہد، مرتب، مقالاتِ عبدالقادر، مجلسِ ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۶ء ص ۱۹۵

۸۳۔ حالی الطاف حسین، مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ص ۶۷۔۶۶

۸۴۔ نامی انصاری، منشی دیا نرائن نگم، ہندوستانی ادب کے معمار، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، ۱۹۹۹ء ص ۷

۸۵۔ نامی انصاری، منشی دیا نرائن نگم، ہندوستانی ادب کے معمار، ص ۷

۸۶۔ شاد عارفی، نظام رامپوری، مشمولہ نقوش شخصیات نمبر، مرتب محمد طفیل، ادارہ فروغ اردو لاہور، ص ۷۷۶

۸۷۔ مہدی علی خاں، سید، مکاتیب، حصہ اول، شمسی مشین پریس آگرہ با اہتمام منشی محمد بشیر الدین خاں طبع ہوئے، س ن، ص ب

۸۸۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور، ص ۶۳۳

۸۹۔ عبدالرزاق کانپوری، یادِ ایام، عبدالحق اکیڈمی اشاعت منزل کوچہ عبدالحق حیدر آباد دکن، ۱۹۴۶ء، ص ۷۷۔۷۶

۹۰۔ مہر غلام رسول، مولانا، وقارالملک مشمولہ نقوش، شخصیات نمبر ۲، ص ۷۲۲

۹۱۔ عبدالرزاق کانپوری، یادِ ایام، ص ۶۲، ۶۳

۹۲۔ حالی، الطاف حسین، مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، اردو مرکز گنپت روڈ لاہور، سندھ اردو اکیڈمی مشن روڈ کراچی، ۱۹۵۰ء، ص ۱۱۱، ۱۱۲

۹۳۔ وفا راشدی، ڈاکٹر، حیاتِ وحشت، مکتبہ کارواں کچہری روڈ لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۳۰

۹۴۔ مخزن ماہنامہ، لاہور مئی ۱۹۱۵ء

۹۵۔ معیار، رسالہ لکھنؤ مئی ۱۹۱۰ء

۹۶۔ عکسی تحریر مولانا حالی، مشمولہ نقوش مکاتیب نمبر، جلد اول، مرتب محمد طفیل، ادارہ فروغِ اردو لاہور، نومبر ۱۹۵۷ء، ص ۱۳۴، ۱۳۵

بابِ ہفتم

مولانا حالی کے غیر مدون مکاتیب اور تحریریں

ذیل میں حالؔی کے چند مکتوبات اور کچھ تحریریں پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ مکتوبات حالی کے کسی بھی مجموعہ مکتوبات یا مکاتیب میں شامل نہیں ہیں۔ یہ غیر مدون ہیں جن کی دریافت سے مکاتیب حالی کی عددی تعداد میں قابلِ ذکر اضافہ ہو جائے گا۔ حالی کی تحریریں بھی غیر مدون ہیں مناسب سمجھا گیا کہ مکتوبات کے آخر میں انھیں بھی جگہ دی جائے۔ انھیں مکتوبات حالی کا ضمیمہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے حالؔی شناسی کی بعض جہات کی تکمیل ہو جائے گی۔ ان کا درجہ نو دریافت کا ہے ان میں سے بعض خطوط کے عکس حالی کی تحریر سے دستیاب ہوئے ہیں جن سے ان کا متن پورے اطمینان کے ساتھ ملا دیا گیا ہے اور ان کی تصویدی صحت پر صاد کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام خطوط کو زمانی ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کے بعد آخر میں ان کے اوپر اپنی معلومات کے مطابق تحقیقی تبصرے پیش کیے جا رہے ہیں۔

خط نمبر ا

۱۶۔ اگست ۱۸۷۲ء

میرے مخدوم و مکرم ایڈیٹر سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ

سلامت!

میری رائے جو ذیل میں مندرج ہے اور جس میں میرے ساتھ مولوی خواجہ ضیاء الدین صاحب دہلوی اور سبحان بخش صاحب شکارپوری متفق ہیں از راہ عنایت و کرم اپنے اخبار میں درج فرما کر ہم سب کو مرہون منت فرمائیے۔

والتسلیم و تکریم

میں کئی دن سے ارادہ کر رہا تھا کہ شمال و مغرب کے شہروں میں سے جس شہر میں مدرسۃ العلوم کا قائم کرنا میرے نزدیک مصلحت ہے اس کی اولیت کی وجوہ لکھ کر کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم اہل اسلام کی خدمت میں پیش کروں مگر سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے اخبار مورخہ ۲۶ جولائی کو دیکھ کر مجھ کو سبکدوشی حاصل ہو گئی۔ اب مجھ کو اس سے زیادہ لکھنے کی حاجت نہ رہی کہ جناب ایڈیٹر صاحب اور جناب مولوی مشتاق حسین صاحب نے اس باب ہیں جن وجوہ سے علی گڑھ کو اور شہروں پر ترجیح دی ہے ان میں سے اکثر ایسے کافی ہیں جن پر غور کرنے کے بعد اور کسی وجہ کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ خصوصاً یہ وجہ کہ اس مدرسہ سے زیادہ تر ان لوگوں کو فائدہ پہنچانا مقصود ہے جو علوم قدیمہ پر مٹے ہوئے ہیں۔ اور علوم جدیدہ اور مغربی زبانوں سے ایسے بدکتے ہیں جیسے دیہات کے ڈھور ڈنگر اجلے کپڑے والوں سے بدکتے ہیں۔ پس جو تدبیریں ان کی تدبیر اور تسخیر کے لیے کی گئی ہیں ان ہی میں سے ایک بڑی تدبیر یہ بھی ہے کہ یہ مدرسہ جہاں تک ہو سکے ان شہروں اور قصبوں کے قرب میں قائم کیا جائے جہاں علوم قدیمہ کا رواج قدیم سے چلا آتا ہے اور علوم جدیدہ کا پرچھاواں تک ان پر نہیں پڑا۔ میرے نزدیک اس قسم کی بستیاں یا تو لکھنؤ کے مضافات میں پائی جاتی ہیں جیسے خیر باد کوہا منٹو، کاکوری، سندیلہ، سہال، پانسہ، وغیرہ یا دلی اور رام پور کے قرب و جوار میں پائی جاتی ہیں جیسے سہارنپور، کاندھلہ، دیوبند، امیٹھ، پانی پت، سونی پت، فرید باد، خواجہ، شکارپور، مراد آباد، امروہہ، بدایوں، سہوان وغیرہ لیکن اگر لکھنؤ اور مضافاتِ لکھنؤ کے قریب کا لحاظ کیا جائے تو شمال مغرب کے شہروں میں اس کام کے لیے کانپور کے سوا کوئی اور جگہ خیال میں نہیں آتی۔ اور کانپور فی حد ذات ہرگز اس بات کی قابلیت نہیں

رکھتا کہ یہ مدرسہ وہاں قائم کیا جائے۔ قطع نظر اس کے کہ جو وجوہ علی گڑھ کی ترجیح کے لیے بیان کی گئی ہیں۔ ان میں اکثر کانپور کے ساتھ مساعدت نہیں کرتیں اور بھی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو کانپور پر ہرگز جمنے نہیں دیتیں مگر چونکہ ہم کو امید نہیں ہے کہ کانپور پر اس قدر رائیں متفق ہوں جس کا مقابلہ کرنا ضرور ہے اس لیے ہم ان کے بیان کرنے کی کچھ حاجت نہیں رکھتے۔ بس دہلی اور رام پور کے قرب کا لحاظ کرنا واجب ٹھہرا اس غرض کے لیے شہر کی آب و ہوا پر لحاظ کرنا بھی ایک نہایت ضروری امر ہے۔ خصوصاً ہم لوگوں کی نظر میں کہ نہ آجکل ہیضہ اور بخار کے موسم میں وارد ہوا ہیں۔ مجھ کو کبھی علی گڑھ میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا مگر بلند شہر کے ضلع میں جتنی مشہور بستیاں ہیں ان سب کی آب و ہوا میں بسبب اپنی واقفیت کے اپنے تمام دیکھے ہوئے شہروں کی آب و ہوا سے بہتر جانتا ہوں اور علی گڑھ بھی بسبب قرب کے آب ہوا کے اعتبار سے ضلع بلند شہر ہی کے حکم میں ہے اس کے سوا وہاں کی آب ہوا کی تعریف میں نے ایسے لوگوں سے بھی سنی ہے جن کا قول ایسے امور میں نہایت معتبر کہا جاتا ہے۔ دلی اور آگرہ جو ہندوستان کے مشہور اور ممتاز شہر ہیں اور جن کے دیکھنے کو لوگ دور دور سے آتے ہیں اور علی گڑھ کا ان دونوں کے بیچ میں ہونا اور دونوں سے قریب تر ہونا یہ ایک دام ہے جو کہ نوعمر اور زندہ دل لڑکوں کو دور دور سے کھینچ کر اس امید پر لے آئے گا کہ آیا ہم تعطیل میں آگرہ اور دلی کی خوب سیر کریں گے اور یہ بات نہ دہلی میں حاصل ہو سکتی ہے نہ آگرہ میں۔ آگرہ ایک ایسا شہر ہے جس پر اس کام کے لیے بے شک نگاہ پڑتی ہے مگر آب و ہوا کی خوبی اور دلی و رامپور کا قرب اور تمام ٹرینیوں کا مرکز ہونا علی گڑھ کو اس پر بھی ترجیح دیتا ہے۔ الہ آباد کا دلی وغیرہ سے دور ہونا اور وہاں کی آب و ہوا کا اچھا نہ ہونا

اس کے سوا اس کی مرجوعیت کی ایک وہ وجہ ہے جس کو شاید بعض صاحب اس کی ترجیح کے بیان میں پیش کریں گے یعنی گورنمنٹ اور ہائی کورٹ اور صدر بورڈ وغیرہ بڑے بڑے محکموں کا اس شہر میں ہونا اگرچہ بادی النظر میں اس کے رجحان پر دلالت کرتا ہے مگر غور کرنے کے بعد بالکل اس کے برخلاف گواہی دیتا ہے کیونکہ ایسے صدر مقامات میں متوسط درجے کی لیاقت کے بھی معاش اور نوکری کی سبلیں اکثر نکلتی رہتی ہیں اور ظاہر ہے کہ مدرستہ العلوم کے طالب علم بے دستگاہ اور پردیسی اور جویائے معاش بہت سے ہوں گے پھر الہ آباد کی حالت موجودہ اکثر طالب علموں کی ترقی اور روز افزوں میں خلل انداز ہوگی اور پہلے اس سے کہ وہ ہاتھ پیر مار کر ساحلِ مقصود تک پہنچیں غالباً یہ لالچ ان کو بیچ ہی میں لے بیٹھے گا خلاصہ یہ ہے کہ ہم سب کے نزدیک مدرستہ العلوم کے علی گڑھ میں قائم کرنا عین مصلحت ہے۔

راقم الطاف حسین حالؔی (۱)

خط نمبر ۲

بنام مولوی عبدالرحیم خاں صاحب

"مولوی صاحب مخدوم و مکرم دام مجدکم

تسلیم! عنائت نامہ آیا حسبِ ارشاد قطعہ رسید ٹکٹ لگا کر اس نیاز نامہ کے ساتھ خدمت شریف میں ارسال کرتا ہوں۔ جب روپیہ موصول ہونے کا وقت قریب آئے اس رسید کو داخل فرما کر روپیہ وصول کر لیجیے گا۔ایک عرضیہ جناب مولوی سید مہدی علی خان صاحب کی خدمت میں بھی اسی وقت بھیجتا ہوں کہ روپیہ مولوی

عبدالرحیم خاں صاحب کے حوالے کر دیا جائے کیونکہ روپیہ کی رسید میں نے مولوی صاحب موصوف کے پاس بھیج دی ہے۔ آپ کی تحریر کے موافق شکریہ کا خط بھی جناب ممدوح کی خدمت میں بھیج چکا ہوں۔ روپے اگر مناسب ہو تو بذریعہ کرنسی نوٹ کے بھیج دیجیے گا کیونکہ منی آرڈر کی فیس زیادہ لگے گی مگر لفافہ جس میں نوٹ ملفوف ہوں اس کی رجسٹری اور بیمہ کرنا چاہیے آئندہ جیسا آپ مناسب سمجھیں ویسا کیجیے گا۔ زیادہ نیاز۔

خاکسار الطاف حسین حالی از دہلی کوچہ پنڈت

۲۲۔ جون ۱۸۸۶ء' (۲)

خط نمبر ۳

جنابِ مولوی صاحب مخدوم و مکرم و معظم و محترم دام مجدکم۔

بعد تسلیم و نیاز کے التماس یہ ہے کہ وہ مختصر نظمیں جو حال ہی میں لکھ کر شائع کی گئی ہیں ان کی ایک ایک جلد مکرم مولوی عبدالرحیم خان صاحب کی وساطت سے خدمتِ والا میں پہنچیں ہونگی۔ میرا حال یہ ہے کہ اکتوبر ۸۶ء میں حسب الطلب جناب ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب ایچی سن کالج میں مسلمان سردار زادوں کی اتالیقی پر مقرر ہو کر لاہور گیا تھا۔ آٹھ مہینے وہاں رہا آخر کار چند مواقع کے سبب وہاں سے پھر بدستور عربی سکول دہلی میں چلا آیا بعد ایک برس کی لیو طلب کی ہے اگر منظور ہو گئی تو رخصت کا زمانہ کچھ وطن میں اور باقی علی گڑھ میں بسر کرنے کا ارادہ ہے اور بعد انقضاء رخصت نوکری چھوڑ دینے کا قصد ہے کیونکہ اب نوکری کی پابندی نہیں ہو سکتی۔ لیکن چونکہ نوکری پنشنیبل نہیں ہے اس لیے نوکری چھوڑنے

کے بعد کوئی حلۂ معاش کا بظاہر نظر نہیں آتا۔ دیکھیے بیکاری کا زمانہ کیونکر بسر ہو۔

اگر چہ یہاں تصنیفات اس قابل نہیں ہیں کہ ان کے ذریعہ سے حضور مدارالمہام میں مصنف کی تقریب یا اس کے لیے کسی خاص رعایت کی سفارش کی جائے لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ آپ کے توسط سے بہت کچھ ہوسکتا ہے۔

نوکری تو میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اب نہیں ہوسکتی اور اگر آپ کی عنایت سے سرکار عالی میں چند کتابیں خریدلی گئیں یا کچھ زر نقد بطور انعام کے مل گیا تو یہ بات اگر چہ ہر طرح قابلِ شکر ہے لیکن آئندہ زندگی کے لیے جس کی مدت معلوم نہیں۔ اس سے کچھ اطمینان نہیں ہوسکتا۔ میری خواہش یہ ہے کہ جس طرح اطرافِ ہندوستان میں اور بہت سے لوگ گھر بیٹھے سرکار عالی سے وظائف پاتے ہیں۔ میرے لیے بھی کوئی ایسی سبیل نکل آئے۔ میرا ارادہ نوکری ترک کرنے کے بعد باقی زندگی (جس قدر کہ عمر وفا کرے) تصنیف و تالیف میں بسر کرنے کا ہے خواہ کسی کی طرف سے کچھ امداد ہو یا نہو اس کے سوا نہ اور کوئی کام کرنے کو میرا جی چاہتا ہے اور نہ فی الحقیقت مجھے ہوسکتا ہے۔ پس اگر اس ناچیز خدمت جس کے عوض میں جس کا عدم اور وجود برابر ہے اور جس سے سرکار عالی کا کوئی فائدہ متصور نہیں ہے آپ کچھ کر سکیں تو کیجیے میری درخواست تو یہی ہے آئندہ جو کچھ آپ کی توجہ سے ظہور میں آئے گا نہایت صدقِ دل سے اس کا شکریہ ادا کیا جائے گا۔

زیادہ نیاز

نیازمند خاکسار الطاف حسین عفی عنہ از دہلی کوچۂ پنڈت

۱۸۔ ستمبر ۱۸۸۷ء بروز یکشنبہ (۳)

خط نمبر ۴

بنام محمد علی مہمان

''جناب سید صاحب مخدوم و مطاع و مکرم و محترم دام مجد کم۔

تسلیم بصد تحیت و تکریم، مشرفِ نامہ شرف صدور لایا، کلمات شفقت آیات بزرگانہ جو اس میں مندرجہ ہیں ان کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتا ہوں۔ نہائت افسوس اور شرمندگی ہے کہ آپ یہاں تشریف لائے جبکہ بارش ہو رہی تھی اور میں اس سے پہلے بہت بیمار رہ چکا تھا۔ کہیں آنے جانے کا موقع بالکل نہ تھا اسی وجہ سے آپ کی خدمت میں جہاں مہاراجہ صاحب فروکش تھے حاضر نہ ہو سکا اور کسی قسم کی مدارت اور خدمت گذاری نہ کر سکا۔ آپ کے ساتھ سوار ہو کر ایک دو جگہ جانا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی نسبت آپ ممنونیت کا اظہار فرماتے ہیں بلکہ ہم لوگوں کو حد سے زیادہ ممنون ہونا چاہیے کہ آپ نے باوجود محض ناواقفیت کے حالت سفر میں بارش اور کیچڑ وغیرہ کی دقتیں برداشت فرما کر ہم جیسے ناچیز اور بے مقدار لوگوں کے مکان پر قدم رنجہ فرمایا۔ افسوس ہے کہ آپ نے دلی کو اس وقت دیکھا جبکہ جہاں کوئی شخص ملنے کے قابل نہ رہا۔ علم و فضل اور ہنر و کمال کا بالکل خاتمہ ہو گیا ورنہ بیس بائیس برس پہلے تک بھی یہاں کچھ لوگ ایسے موجود تھے جن کا نظیر تمام ہندوستان (میں) نہ تھا اب یہاں مقبروں اور مزاروں کے سوا اور کوئی شے دیکھنے کے قابل نہ رہی۔

نیاز مند کا حال یہ ہے کہ سولہ سترہ برس سے کھانسی اور نزلہ کے مرض میں مبتلا ہے۔ ہمیشہ موسم سرما میں کھانسی وغیرہ کی شدت رہتی تھی اور اب کے سال بھی موسم مذکورہ میں بہت شدت ہوئی تھی مگر اس سال میں نئی بات یہ ہوئی کہ گرمی کے شروع

ہوتے ہی پھر نزلے کی شدت ہوئی چنانچہ اب تک اسی میں مبتلا ہوں، دو مسہل لے چکا ہوں اور تیسرا مسہل کل ہونے والا ہے اس کے بعد ایک مہینے کے لیے پانی پت جاؤں گا بلکہ شعبان اور رمضان سارا وہیں گزرے گا آپ اگر کبھی اس عرصہ میں عنائت نامہ ارسال فرمائیں تو بمقام پانی پت ضلع کرنال محلہ انصاریاں میں خاکسار کے نام ارسال فرمائیں اور جبکہ آخر تک امید ہے کہ دلی میں ہی رہنا ہوگا۔امراض کی شکایت کے سبب کوئی نئی چیز لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اگر کبھی کوئی نئی شے خاکسار کی ناچیز تالیفات میں سے چھپے گی تو ضرور بالضرور بلا طلب خدمت عالی میں ارسال ہوگی۔زیادہ حدِ نیاز۔

خاکسار الطاف حسین حالی غفرلہ از دہلی کوچہ پنڈت

۳۱۔مارچ ۱۸۸۸ء"(۴)

خط نمبر ۵

"عالیجناب

تسلیم بصد تحیت و تکریم۔ میں ایک نہایت ضروری امر کی طرف ملازمانِ والا کی توجہ مائل کرنی چاہتا ہوں۔امید ہے کہ جناب اس پر کامل غور فرمائیں گے۔پچھلے دنوں میں جو چند روز کے لیے دہلی جانے کا اتفاق ہوا تو سنا گیا کہ تین سو یا چار سو روپیہ سرکار عالی سے اولادِ تیمور کی تعلیم کے لیے عطا ہوتا ہے۔اور وہ مرزا ثریا جاہ صاحب کے طور پر خرچ ہوتا ہے۔یہ بھی سنا گیا کہ ایک کمیٹی خاص بادشاہزادوں کی اس مدرسہ کے انتظام کے لیے مقرر ہے مگر معتبر ذریعوں سے دریافت ہوا کہ یہ روپیہ احتیاط کے ساتھ صرف نہیں ہوتا۔اس باب میں اور بھی بہت سی قابل افسوس

باتیں سنی گئی ہیں مگر میں صرف اس قدر گزارش کرتا ہوں کہ اگر اس روپیہ سے فی الواقع بادشاہزادوں کے ساتھ سلوک کرنا منظور ہے اور ان کو کسی لائق بنانا مدنظر ہے تو اس کو نہایت ضرور ہے کہ کسی دیانت دار جماعت کے سپرد کرنا چاہیے۔اول تو بادشاہزادوں کے لیے ایک خاص مدرسہ مقرر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔دلی میں اینگلو عربی سکول خاص مسلمانوں کی تعلیم کے لیے بہت روز سے قائم ہے اور دلی کے تمام گورنمنٹ و مشن سکولوں سے زیادہ نیکنام ہے۔اس میں تمام ٹیچر مسلمان ہیں اور لور سکول سے انٹرنس تک وہاں تعلیم ہوتی ہے اور اکثر بادشاہزادے اس میں اب تک پڑھتے رہے ہیں چنانچہ اسی سال میں مرزا محمد اشرف بادشاہزادہ نے جو اسی مدرسہ کے طالب علم ہیں بی۔اے کا امتحان دیا تھا جو بدقسمتی سے فیل ہو گئے۔پس یہ بہتر ہے کہ سب بادشاہزادے اسی مدرسہ میں پڑھیں اور سرکار عالی کے عطیہ سے ان کے لیے مناسب وظیفے مقرر کیے جائیں۔ اگر زیادہ پرداخت منظور ہو تو ان کے لیے ایک کرایہ کا مکان بطور بورڈنگ ہاؤس کے لے لیا جائے اور ان کو حکماً اس میں رکھا جائے اور اپنی قوم کی سوسائٹیز سے ملنے نہ دیا جائے اور اگر یہ بات ضرور ہے کہ ان کے لیے علیحدہ مدرسہ مقرر ہو تو ایک معتمد کمیٹی مقرر کی جائے جس میں شہر کے تعلیم یافتہ، لائق، دیانت دار اور منتظم آدمی ممبر منتخب ہوں جن میں سے چند آدمیوں کے نام لکھے جاتے ہیں۔مولوی نذیر احمد صاحب، شمس العلماء مولوی محمد ذکا اللہ صاحب، خواجہ شہاب الدین صاحب ہیڈ ماسٹر اینگلو عربی سکول، خواجہ تصدق حسین بی اے سکنڈ ہیڈ ماسٹر مدرسہ مذکور، غلام محمد حسن خاں بی۔اے خلف الصدق، مولوی محمد عنائت الرحمٰن خاں صاحب، منشی محمد کرم اللہ خان صاحب رئیس شہر، مولوی محمد احسان الرحمٰن خان

صاحب رئیس شہر، بخشی محمد اکرام اللہ خان صاحب رئیس شہر، سید سلطان مرزا صاحب رئیس شہر، اس کے علاوہ چند آدمی بادشاہزادوں میں سے بھی منتخب ہو سکتے ہیں۔خصوصاً مرزا ثریا جاہ صاحب جو کہ اب کمیٹی کے پریسٹنڈنٹ ہیں۔اطلاعاً عرض کیا گیا۔زیادہ نیاز۔

خاکسار الطاف حسین حالی از پانی پت ضلع کرنال، ۱۴۔اگست ۱۸۹۰ء"(۵)

خط نمبر ۶

مکتوب الیہ کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا۔

والا جناب!

مکرمی مولوی سید احمد صاحب دہلوی مصنف فرہنگ آصفیہ خدمت والا میں آتے ہیں جو امر کہ ان کو اس سفر دران کرنے کا باعث ہوا ہے۔آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں ان کے لیے کسی سفارش کی ضرورت نہیں، ان کی سفارش خود ان کی واجب ہے جس کا کسی قدر اندازہ آپ مولوی سید علی صاحب بلگرامی کی رپورٹ سے ہے جو ان کے پاس موجود ہے کر سکتے ہیں۔ میں صرف اس لیے لکھتا ہوں کہ حیدر آباد سے چلتے وقت میں نے ان کے باب میں آپ کی خدمت میں کچھ عرض کیا تھا۔ اس جناب نے کسی قدر مجبوری ظاہر فرمائی تھی مگر بایں ہمہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ دل سے ان کی اعانت و امداد کرنے پر آمادہ ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اب آپ ان کی اعانت بوجہ شائستہ فرما سکتے ہیں جو مشکلات ان کو درپیش ہیں ان کے حل ہونے کی توقع سرکارِ عالی کے سوا اور سرکارِ ممدوح میں آپ کے سوا کسی سے نہیں کی جا سکتی پس بجائے اس کہ میں خدمتِ عالی میں ان کی سفارش کروں میری یہ دعا

ہے (نہ محض بمقتضائے فطرتِ انسانی بلکہ بہ امید استجابت) کہ ان کی پچیس سال کی محنت و جانفشانی کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ پیدا ہوا اور آپ کی عنایت و توجہ کی بدولت اسلام کی ایک لازوال نشانی یعنی زبانِ اردو ہندوستان میں ہمیشہ کے لیے جڑ پکڑ جائے۔ یہ احسان صرف مولوی سید احمد پر نہیں بلکہ تمام ہندوستان پر عموماً اور ہندوستان کے مسلمانوں پر خصوصاً سمجھنا چاہیے۔

زیادہ حد ادب

عریضۂ نیاز

خاکسار و نیازمند الطاف حسین حالی از دہلی

۳۱ دسمبر ۱۸۹۲ء

خط نمبر ۷

بنام نواب وقار الملک

۱۵۔ اگست ۱۸۹۴ء

علی گڑھ مدرستہ العلوم

والا جناب! عنائت نامہ مع دو جلد تجویز تعلیم مذہبی کے پہنچا۔ اور میں نے کلی اطمینان کی حالت میں اس کو پڑھا۔ سرکاری مدرسوں یا کالجوں میں تعلیم مذہبی شامل کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ بظاہر خیال میں نہیں آتا جو آپ نے تجویز فرمایا ہے اور جہاں تک کہ میں خیال کر سکتا ہوں گورنمنٹ کو اس کے منظور کرنے میں کچھ عذر نہ ہوگا۔ گورنمنٹ کو میرے نزدیک جب سے کہ نیشنل کانگرس کا غلغلہ ہندوستان میں ہوا ہے ہندوستانیوں کو مذہبی تعلیم دیے جانے کا زیادہ خیال ہو گیا

ہے۔اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو گورنمنٹ ایسی تجویز کو نہایت غنیمت سمجھے گی اور اس کو خوشی سے منظور کرے گی لیکن جیسا کہ خود آپ نے آخر میں لکھا ہے کہ مسلمانوں سے بہت ہی کم توقع ہے کہ وہ یہ دردسر گوارا فرماویں اور مذہبی تعلیم کے انتظام کے لیے کمیٹیاں مقرر کریں اور ہر ایک کمیٹی اپنے فرائض پورے پورے ادا کریں۔ رہی یہ بات کہ اس اقلِ قلیل وقت میں جو مذہبی تعلیم دی جائے گی آیا وہ ان خرابیوں کا انسداد کر سکے گی یا نہیں جو انگریزی سے متصور ہیں۔اس کی مجھ کو ہرگز امید نہیں لیکن بہر حال اگر آپ کے حسن سعی سے یہ تدبیر چل نکلے تو نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے اور تعلیم مذہبی کے ساتھ نماز روزہ کی پابندی کا انتظام کرنا بھی نہایت ضرور ہے بلکہ اگر میرا خیال غلط نہ ہو تو صرف پانچ وقت کی نماز کا التزام اس محدود مذہبی تعلیم سے زیادہ مفید ہے اور محمدن کالج نے بھی اب تک جو کچھ مذہب کے متعلق کوئی عمدہ انتظام کیا ہے وہ صرف یہی ہے کہ یہاں کے طالب علموں کو نماز کی پابندی پر مجبور کیا جاتا ہے۔امید ہے کہ آپ مع متعلقین کے بخیرت ہوں گے۔زیادہ نیاز خاکسار نیاز مند۔

الطاف حسین حالؔی (۲)

خط نمبر ۸

بنام مولوی بشیرالدین

جناب من!

منشی رحمت اللہ رعد مالک مطبع نامی پریس کانپور آپ کی خدمت میں ایک جلد سرسید کی لائف کی آج کل میں بھیجیں گے۔اس کو قبول فرمایئے گا۔امید ہے کہ آپ

اپنے معزز پرچہ میں دو چار بار اس کا اشتہار جو ٹائیٹل پیج کے آخیر صفحے پر چھپا ہے۔شائع فرمائیں گے۔مگر لائف جو تیسرے درجے کے کاغذ پر چھپی ہے اس کی صرف دوسو جلدیں چھپوائی گئی تھیں،سو کتاب کے شائع ہونے سے پہلے ہی اس کی بہت سی درخواستیں آ گئی تھیں۔اب پان سات روز میں وہ دو سو جلدیں ختم ہو جائیں گی اس لیے آپ صرف دو قسم کی کتابیں اشتہار میں درج کرایئے گا یعنی قسم اول وقسم دوم اور قسم سوم کے خانۂ قیمت میں بجائے قیمت کہ یہ لکھوایئے گا کہ اس کی کل جلدیں فروخت ہوگئیں۔آپ کی خدمت میں جو جلد آئے گی وہ بھی غالباً تیسرے درجے کے کاغذ کی ہوگی۔زیادہ نیاز!

خاکسار الطاف حسین حالؔی

۱۶۔اپریل ۱۹۰۱ء‘‘(۷)

خط نمبر ۹

بنام سید حسن علی صاحب

جناب نواب صاحب مخدوم ومکرم!

التسلیم والے بالتقدیم! آپ کی تصنیف جدید ’’فطرۃ الاسلام‘‘ کا ایک نسخہ عطیہ جناب خاکسار کے پاس پہنچا۔اس خاص عنائت کا شکریہ تہہ دل سے ادا کرتا ہوں۔رسید اور شکریہ بھیجنے میں اس وجہ سے تاخیر ہوئی کہ میں ایک عرصہ سے علیل چلا جاتا ہوں اگر چہ اب تک کوئی مرض مہلک عارض نہیں ہوا۔مگر لکھنا پڑھنا بالکل چھوٹ گیا ہے۔میں چاہتا تھا کہ ’’فطرۃ الاسلام‘‘ کے مطالعہ سے مستفید ہونے کے بعد جواب عرض کروں لیکن ضعفِ بصارت اور ضعفِ دماغ نے مجبور کر دیا

ہے۔اکثر احباب و اکابر اپنی تصنیفات بھیج کر ممنون فرماتے ہیں مگر میں ان سے بہت کم ہی مستفیض ہوتا ہوں۔اگر چہ دوسرے شخص سے پڑھوا کر سننا ممکن ہے مگر سننے سے جی خوش نہیں ہوتا خصوصاً عمدہ تصانیف جو خود پڑھ کر لطف آتا ہے سننے سے وہ کیفیت حاصل نہیں ہوتی۔بہر حال موجودہ شکاتیں رفع ہونے کے بعد میں ضرور کوشش کروں گا کہ خود پڑھ کر یا کسی عزیز سے سن کر آپ کی افادات طیبات سے مستفیض ہوں۔

فہرست مضامین دیکھ کر بیحد خوشی ہوئی ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ دہریت اور الحاد وبائے عام کی طرح چاروں طرف پھیلا ہوا ہے ایسی کتابوں کا شائع ہونا نہایت ضروری اور مفید ہے۔آپ نے قوم کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔خدا تعالیٰ اس کا اجر دے گا۔

امید ہے کہ جناب معہ متعلقین و متوسلین کے بہمہ وجوہ خیریت سے ہوں گے۔

زیادہ نیاز

خاکسار دعا گو الطاف حسین حالی از پانی پت

۱۸۔اکتوبر ۱۹۱۰ء(۸)

خط نمبر ۱۰

نقلِ رسید

باعثِ تحریر آنکہ

۱۳۰۹ء فصلی الٰہی میں حسبِ دستور سر رشتۂ تعلیمات سرکارِ عالی میں نیاز مند کی مصنفہ کتابیں خرید کی گئی تھیں۔ان کی قیمت مبلغ دوسو چونسٹھ روپیہ دس آنے سکہ کمپنی معرفت مولوی عبدالحق بی۔اے ایڈیٹر رسالۂ افسر

وصول ہوئے۔اس لیے یہ رسید لکھ دی۔

فقط مرقومہ ۱۴ نومبر ۱۹۰۱ء

وظفیہ کار سرکارِ عالی الطاف حسین حالی بقلم خود(۹)

خط نمبر ۱۱

بنام مولوی بشیر الدین

''جناب من!

کانگرس گذٹ کا بطور ضمیمہ کے البشیر کے ساتھ شائع ہونا بہت مناسب ہوا ہے خدا کرے کہ وہ مفید بھی ہو ایک صاحب نے یہ اصلاح دی ہے کہ ''کانگرس گذٹ'' کے اوپر ذرا خفی قلم سے یہ الفاظ اور لکھنے چاہئیں ''ایم۔اے او ایجوکیشنل'' تا کہ اور قوموں کی کانفرنس اور مسلمانوں کی کانفرنس میں تمیز ہو۔میں بھی اس رائے کو پسند کرتا ہوں۔اطلاعاً عرض کیا گیا۔

خاکسار الطاف حسین حالی از پانی پت

۸۔اگست ۱۹۰۲ء''(۱۰)

خط نمبر ۱۲

''۱۶۔جولائی ۱۹۰۴ء

پانی پت

شمس العلماء کا خطاب ملنے پر جس گرم جوشی اور مسرت کے ساتھ آپ نے خاکسار کو مبارک باد دی ہے اس کا شکریہ تہہ دل سے ادا کرتا ہوں اور اس کو اپنے

لیے ایک دستاویز فخر و امتیاز سمجھتا ہوں۔

جس اعزاز کے ساتھ انجمن نے خاکسار کو مبارک باد دی ہے اس کو میں اس اعزاز سے کم نہیں سمجھتا جو گورنمنٹ کے خطاب سے نیاز مند کو حاصل ہوا ہے۔ امید ہے کہ جناب میرا ناچیز شکریہ انجمن کے معزز ممبران کی خدمت میں پہنچا کر مرہونِ منت بے پایاں فرمائیں گے۔

زیادہ حد ادب

آپ کا نیاز مند

الطاف حسین حالیؔ،(۱۱)

خط نمبر ۱۳

بنام منشی نجم الدین

پانی پت، ۱۸ نومبر ۱۹۰۴ء

عزیز من!

آپ کا خط پہنچا جس کو پڑھ کر بے انتہا رنج اور بڑا افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ میں دل سے اس باب کی کوشش کروں گا مگر آج کل رمضان ہیں اور رمضان المبارک میں اس قسم کا فکر و غور کا ہونا دشوار ہے۔ اور قبر پر کتبہ لگانے کے لیے کچھ زیادہ جلدی کی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کا خط بحفاظت رکھ لیا ہے لیکن بعد رمضان کے آپ ایک دفعہ ضرور مجھے یاد دلوا دیں۔

والسلام

خاکسار الطاف حسین حالیؔ (۱۲)

خط نمبر ۱۴

بنام مولوی قمر علی صاحب

''مہربانی فرما کر عزیزی محمود احمد عباسی کے حال سے مطلع فرمایئے گا وہ بالفعل بریلی میں ہیں یا علی گڑھ میں اور ان کا مزاج کیسا ہے اور حضرت شاہ نظام الدین صاحب کے صاحبزادے یعنی مولانا نیاز احمد قدس سرہ کے پوتے کا پورا نام اور لقب اور جس محلّہ میں وہ تشریف رکھتے ہیں بالتفصیل مجھے لکھ بھیجے گا اور تکلیف دہی کو معاف فرمایئے۔امید ہے کہ آپ بہمہ جہت بخیریت ہوں گے۔زیادہ نیاز۔

خاکسار الطاف حسین حالی از پانی پت

۱۹۔فروری ۱۹۰۹ء''(۱۴)

خط نمبر ۱۵

مکتوب بنام وحشت کلکتوی

پانی پت

۲۹ مئی ۱۹۱۰ء

مولوی صاحب فضائل و کمالات دستگاہ

السلام اول الکلام، دیوانِ وحشت یعنی آپ کے اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ جو آپ نے ازراہِ لطف و کرم بندہ کو بطریقِ ارمغان عنائت فرمایا ہے اولاً اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔اس کے بعد اپنی حالت پر افسوس کرتا ہوں کہ یہ عطیہ میرے حصے میں اس وقت آیا جبکہ میں اس کی قدر کرنے کے لائق نہیں رہا۔

چیدند خوانِ نعمتے چوں از جہاں دل سیر شد
دادند آبِ زندگی اما پس از نزعِ رواں

ہجوم امراض اور ضعف قوہ کے سبب لکھنا پڑھنا مدت سے موقوف ہو گیا ہے۔ با ایں ہمہ یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ دیوان وحشت کے مطالعہ سے میرے دل میں بلا مبالغہ ایک محبت کثیر پیدا ہوئی ہے۔اول تو آپ کا تخلص مرزا اسداللہ خان مرحوم کی صحبت کے ایک اعلیٰ رکن یعنی سید غلام علی خان وحشت کی یاد کو تازہ کرتا ہے جس کی نسبت مرزا صاحب اپنی ایک اردو غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:

ے وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید

مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

دوسرے آپ کے طرز سخن/ سخنی دیکھ کر زمانے کے انقلاب پر ایک حسرت انگیز تعجب کا سماں دل پر چھا جاتا ہے۔خدا کی شان ہے کہ جس بزرگ پر اہلِ کلکتہ کی طرف سے سنینِ ماضیہ میں دوبارحد سے زیادہ اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی تھی اور نکتہ چینی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا تھا۔آج کلکتہ کے ارباب فضل وکمال میں سے ایک یگانہ و برگزیدہ شخص اسی بزرگ کے تتبع پر فخر کرتا ہے غالباً آپ نے اپنے سن رسیدہ ہم وطنوں سے سنا ہو گا کہ جب مرزا غالب مرحوم اپنی موروثی پینشن کے متعلق گورنمنٹ ہند میں استغاثہ کرنے کی غرض سے کلکتہ گئے ہیں اس وقت یہاں کلکتہ میں ان کے فارسی کلام پر کچھ اعتراضات کیے تھے جن پر مرزا صاحب نے ایک مثنوی موسوم بہ بادِمخالف لکھی تھی جو ان کے کلیات میں موجود ہے۔

پھر ایام غدر کے بعد ان کی کتاب قاطع برہان کے خلاف مولوی احمد علی بیگ متخلص بہ احمد رئیس کلکتہ نے ایک مستقل کتاب موسوم بہ "مؤید البرہان" نہایت درشت و تلخ لہجہ میں ترتیب دے کر شائع کی تھی مگر آپ نے مرزا کے تتبع کا پورا پورا حق ادا کر کے ثابت کر دیا کہ سچائی کا مقابلہ کیسی ہی سختی کے ساتھ کیا جائے وہ آخر کار اپنا

نقش لوگوں کے دلوں پر جمائے بغیر نہیں رہتی۔ مولانا اگر انصاف سے دیکھیے تو مرزا کا تتبع کرنا درحقیقت ہم لوگوں کا حق تھا مگر آپ نے ہمارا یہ حق ہم سے چھین لیا ہے۔ سچ ہے، ''دورانِ باخبر در حضور رزدیکان بے خبر دور'' تکلف بر طرف اگر مرزا صاحب کے اُن بلند اور اچھوتے خیالات کو جن میں وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے مستثنےٰ کرلیا جائے تو آپ کے اردو دیوان کو بلا شائبہ تصنع کے کلام کا نمونہ قرار دینا ہرگز داخلِ مبالغہ نہیں ہوسکتا اور چونکہ ایشیا کی قدیم شاعری بظاہر چراغ سحری معلوم ہوتی ہے اور فارسی زبان ہندوستان سے آہستہ آہستہ مفقود ہوتی جاتی ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے آیندہ کیا اردو اور کیا فارسی دونوں زبانوں میں ایسے نئے دیوانوں کے شائع ہونے کی بہت ہی کم امید ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت دے کہ آپ ہمارے قدیم اہلِ کمال کی یادگار اور ان کا نام زندہ کرنے والے ہیں۔ والسلام مع الاکرام

خاکسار دعا گو

الطاف حسین حالی''(۱۴)

خط نمبر ۱۶

بنام سید احمد دہلوی

پانی پت ۲۷ فروری ۱۹۱۲ء

جناب مولوی صاحب مخدوم مکرم۔ تسلیم! اس وقت آپ کا کارڈ موسومہ مولوی سید عبدالعلی صاحب کے کارڈ کے جواب میں میری نظر سے گزرا۔ اسے پڑھ کر جو کیفیت دل پر گزری اس کے ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ مجھے کارڈ اول

سے آخر تک پڑھنا مشکل ہو گیا، لیکن الحمد اللہ آپ کے صبر و استقلال میں کچھ تنزل واقع نہیں ہوا۔ آپ کے اس حادثہ کے قریب قریب انگلستان کے ایک مشہور مصنف ڈاکٹر لین پر جو آپ ہی کی طرح ڈکشنری نویس یعنی عربی کی مبسوط ڈکشنری ''مدالقاموس'' کا جامع تھا۔ یہی آتشزدگی کا واقع گزرا تھا۔ اس کی تقریباً بیس برس کی محنت دم کے دم میں برباد ہو گئی تھی اور کتاب کے شائع ہونے سے پہلے تمام مطبوعہ اور غیر طبع کتابیں جل کر خاکستر ہو گئیں تھی مگر واہ رے استقلال کہ اس کی پیشانی پر بل نہیں آیا، نئے سرے سے پھر مسودہ تیار کیا جو آخر کو دس یا پندرہ ضخیم جلدوں میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ اگر چہ وہ حادثہ آپ کے حادثے سے بہت بڑا تھا مگر اس لحاظ سے کہ آپ کے دوست کی نو دس برس کی لڑکی اس حادثے میں ضائع ہو گئی، یہ حادثہ بھی اس سے کچھ کم نہیں۔ یقین ہے کہ آپ اپنے استقلال پر بدستور جمے رہیں گے اور مصنف ''مدالقاموس'' کی ایک دوسری نظیر ہندوستان میں قائم کریں گے، امید ہے کہ آپ مزید تفصیل سے خاکسار کو مطلع فرمائیں گے، زیادہ نیاز۔

خاکسار الطاف حسین حالی (۱۵)

خط نمبر ۱۷

بنام سید افتخار عالم صاحب

''پانی پت

۱۷۔ ستمبر ۱۹۱۲ء

مخدومی! ''حیات النذیر'' اور آپ کا محبت نامہ پہنچا۔ اس کتاب کے بھیجنے کا دل

سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ باوجودیکہ میں مطالعہ کتب و اخبارات سے قاصر ہوں مگر ''حیات النذیر'' کو بڑے شوق سے سن رہا ہوں اور جب کوئی پڑھنے والا نہیں ہوتا تو خود جہاں تک ہوسکتا ہے پڑھتا ہوں۔ میں ریویو لکھنے کے قابل تو اب نہیں رہا مگر مولانا نذیر احمد مرحوم و مغفور کی جو عظمت میرے دل میں ہے۔ وہ مجبور کرتی ہے کہ اس مہتم بالشان لائف کی ترتیب میں جو سعی بلیغ آپ نے کی ہے اس کا مسلمان پبلک کی طرف سے شکریہ ادا کروں مگر کچھ لکھنے سے پہلے آپ کو یہ تکلیف دیتا ہوں کہ قرآن مجید کے چاروں ترجمے جو مولانا کے ترجمے کے بعد ہوئے انھیں سے ن والقلم کی آیت کا ذیل کا ترجمہ جو چار مترجموں نے کیا ہے اس کو الگ الگ لکھ کے میرے پاس بھیج دیں۔ ترجمہ کے ساتھ آیت کی عبارت عربی لکھنا ضرور نہیں۔ صرف ترجمہ اور ہر ایک مترجم کا نام لکھ دینا کافی ہے اگر تراجم مذکورہ میں سے کوئی ترجمہ آپ کے پاس موجود نہیں تو جہاں تک ممکن ہو اس کو بہم پہنچانا چاہیے۔ آیت مذکورہ یہ ہے۔

ولا تطع کل حلافٍ مھین تا اساطیر الاولین

آپ کا جواب آنے کے بعد انشا اللہ تعالیٰ بہت جلد آپ کا مطلوبہ مضمون لکھ بھیجوں گا۔

اگر چاروں ترجمے موجود نہ ہوں تو جو ترجمہ موجود ہے اس میں سے نقل کر کے بھیج دیجیے۔

والسلام

خاکسار

الطاف حسین حالی''(۱۶)

خط نمبر ۱۸

بنام سید افتخار عالم

''مکرمی سید صاحب دام مجدہم

آپ کا الطاف نامہ مع مطلوبہ ترجموں کے پہنچا میرے سر میں پانچ سات دن سے درد رہتا ہے۔ اس وجہ سے اب تک ریویو نہیں لکھ سکا۔ درد میں تخفیف ہو جائے تو انشا اللہ تعالیٰ بہت جلد اس فرض سے سبکدوش ہوں گا۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ ریویو کے ساتھ ہی ''حیات النذیر'' کی نامکمل جلد جو آپ نے بھیجی ہے وہ بھی بھیج دوں گا اور دوسری مکمل جلد کا منتظر رہوں گا۔ زیادہ نیاز۔

خاکسار الطاف حسین حالی از پانی پت

یکم اکتوبر ۱۹۱۲ء''(۱۷)

خط نمبر ۱۹

بنام نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی

''پانی پت، ضلع کرنال، ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء

والا جناب، التسلیم اولیٰ بالتقدیم۔ تمہیدات لا طائل کو چھوڑ کر اصل مطلب عرض کرتا ہوں۔ مولوی سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگِ آصفیہ کی تباہی و بربادی کا حال غالباً ان کی اور اخبارات کی تحریر سے جناب کو معلوم ہوا ہو گا۔ ان کے گھر میں آگ لگنے کا حادثہ بلا تصنع اس شعر کا مصداق ہے:

ے دل میں شوق وصل و یاد دوست تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

جو درخواست انھوں نے با امیدِ اعانت و ترحم پیش کار عالی میں گزرانی ہے امید ہے کہ وہ جناب کی نظر سے بھی گزری ہو گی۔ چونکہ سرکار عالی میں ان کی تقریب کرنے والے اوران کی تالیف کو فروغ دینے والے آپ ہی کے معزز خاندان کے ایک رکن رکین تھے۔اس لیے ان کو جناب کی دستگیری و بذل توجہات کی بہت کچھ امید ہے، آتشزدگی کے صدمے نے انھیں بے دست و پا کر دیا۔ نہ فرہنگ کی کوئی جلد باقی رہی جسے فروخت کرکے وہ اپنا معمولی گذارہ کریں اور نہ اس قدر سرمایہ کہ فرہنگ کو از سر نو چھپوائیں۔ اس سے زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔

خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

امید ہے کہ جناب ہمہ وجوہ خیریت سے ہوں گے۔فقط

خاکسار حاؔلی (۱۸)

توضیحات

خط نمبر ا

بنام ایڈیٹر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۶ اگست ۱۸۷۲ء سرسید احمد خان برصغیر کے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے علمی اعتبار سے مسلمانان برصغیر کے لیے کوششیں کیں۔

سرسید نے جب مدرستہ العلوم مسلمانانِ قائم کرنے کے لیے کوششیں کر رہے تھے اس وقت اس بات پر بڑی بحثیں ہوئیں کہ کالج کس شہر میں قائم کیا جائے۔ ملک کے مختلف حصوں سے سینکڑوں لوگوں نے بذریعہ خطوط اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مختلف شہروں کے نام تجویز کیے۔کئی دن تک مختلف اخبارات میں یہ سلسلہ چلتا رہا۔

مولانا حالی نے بھی بذریعہ خط اپنے رائے ایڈیٹر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کو ارسال کی۔حالی کے خط میں مولوی ضیاء الدین اور مولوی سبحان بخش کی رائے بھی شامل تھی جو مولانا حالی کی رائے سے متفق تھے اور دونوں کے خطوط دستخط میں شامل تھے۔

خط نمبر۲

مذکورہ خط مولوی عبدالرحیم خاں کے نام ہے خط کے مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب سے مولانا حالی نے اپنی کتابیں منگوائی ہوں گی یا طبع کروائی ہوں گی جس کی رقم مولانا ان کی خدمت میں ارسال کر رہے ہیں اور خط لکھ رہے علاوہ ازیں ایک عرضیہ مولوی سید مہدی علی خاں کی خدمت میں بھی بھیجتے ہیں کہ روپیہ مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کردیں۔یہ خط نقوش کے مکاتیب نمبر سے لیا گیا ہے۔

خط نمبر۳

مولانا حالی کا یہ مکتوب ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی کتاب ''چار موسم ایچی سن کالج میں'' سے لیا گیا ہے جوان کے بیان کے مطابق غیر مدون ہے۔نیز اس خط کو مکتوبات میں تلاش کیا گیا وہاں کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے لہٰذا ڈاکٹر صاحب موصوف کا بیان صداقت پر مبنی ہے۔یہ خط اس لیے بھی اہم ہے کہ اس سے ایچی سن کالج میں مولانا حالی کا زمانہ قیام متعین ہوتا ہے۔مولانا حالی کالج میں اکتوبر ۱۸۸۶ء میں آئے اور جون ۱۸۸۷ء میں دہلی چلے گئے لہٰذا ایچی سن کالج میں ان کا زمانہ قیام آٹھ ماہ بنتا ہے۔

مذکورہ خط مولانا جب لاہور سے دہلی گئے اور کوچہ پنڈت میں مقیم تھے۔وہاں سے ۱۸ستمبر ۱۸۸۷ء میں لکھا۔جبکہ مکتوبات حالی کے مطابق مولانا نے لاہور سے جو آخری خط یکم جون ۱۸۸۷ء کو اپنے فرزندِ اکبر خواجہ سجاد حسین کے نام لکھا جس میں لکھتے ہیں:

''برخوردار میری اسامی کا انتظام ہوگیا ہے۔غالباً ۵ یا ٦ جون تک انشا اللہ تعالیٰ

دہلی کو روانہ ہو جاؤں گا اس وقت فیروز پور میں آنا اور وہاں تمہارے انتظار میں ٹھہرنا دقت سے خالی نہ ہوگا۔اس لیے انشاء اللہ العزیز تم سے ملنے عنقریب وطن سے پھر آؤں گا میرا ارادہ ہے کہ اگر نصف تنخواہ پر مہینے کی رخصت ملنے کی امید ہوئی تو میں اب دہلی پہنچتے ہی درخواست دے دوں گا اور چھ مہینے تک ذرا دم لوں گا ادھر ادھر پھروں گا انشا اللہ تم سے پھر ملونگا ...... نانو خاں کا کارڈ کل میرے پاس پہنچا میری طرف سے اس کو دعا کہنا اور اس کو چاہیے کہ پانی پت میں برابر خط بھیجتا رہے۔زیادہ دعا۔

الطاف حسین حالی از لاہور، یکم جون ۱۸۸۷ء"(۱۹)

خط کے مکتوب الیہ کا پتہ نہیں چل سکا۔خط میں مولانا حالی اپنی تصنیفات کا بھی ذکر کرتے ہیں اور نوکری کے معاملات کا بھی کیونکہ ان کو اینگلو عربک سکول دہلی میں ملازمت مل گئی تھی جس کا ذکر بھی خط میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں خط میں اس خواہش کا اظہار بھی کیا گیا ہے کہ جس طرح ہندوستان میں بہت سے لوگ سرکار سے وظیفہ حاصل کرتے ہیں۔ایسی کوئی صورت نکل آئے تو میرا ارادہ بھی نوکری چھوڑ دینے کا ہے اور تصنیف و تالیف کا کام کرنے کا ہے۔

خط نمبر ۴

یہ خط محمد علی مہمان کے نام ہے جن کا نام محمد علی تھا اور مہمان تخلص کرتے تھے۔بنگلور میں پیدا ہوئے۔ شاعر بھی تھے ان کے مجموعہ کلام کا نام "ہدیہ مہمان" ہے۔

انڈین سول سروسز میں تھے بطور ڈپٹی کمشنر ریٹائرڈ ہوئے۔یہ خط مولانا حالی نے ان کو اس وقت لکھا جب وہ علی گڑھ کے دورے سے واپس گئے۔اس خط میں ان کی آمد کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور جو سفر میں دقتیں ان کو اٹھانا پڑیں ان پر معذرت اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔یہ خط ریاست میسور میں اردو جلد اول سے لیا گیا ہے۔

جس کے مرتبیں ڈاکٹر آمنہ خاتون اور محمد خاں ہیں اور یہ مہارانی کالج میسور کا ادبی مجلہ ہے جو ۱۹۶۰ء میں برق کوثر پریس بنگلور سے چھپا۔

خط نمبر ۵

یہ خط مولانا حالی کے دیوان جو پہلی مرتبہ نامی پریس کان پور سے ۱۸۹۳ء میں منشی رحمت اللہ رعد مالک نامی پریس کی زیر نگرانی چھپا کے ٹائیٹل پیج کی اندرونی طرف چھپا ہوا ہے اور یہ خط ۱۴۔ اگست ۱۸۹۰ء کا تحریر شدہ ہے۔

خط میں مولانا حالی بیان کرتے ہیں اولادِ تیمور کے لیے جو سرکارِ عالی سے روپیہ ملتا ہے اور جو کمیٹی اس کے انتظامات کے لیے مقرر ہے وہ اس پیسے کو احتیاط کے ساتھ خرچ نہیں کرتی اس کے لیے ایک دیانتدار افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو یہ رقم احتیاط اور اسی مقصد کے لیے جس کے لیے یہ مختص ہے صرف کرے اور ان کے لیے کوئی علیحدہ مدرسہ قائم نہ کیا جائے بلکہ اینگلو عربک سکول جس میں تمام مسلمان ٹیچرز ہیں میں تعلیم دلوائی جائے اور اگر الگ مدرسے کا قیام ناگزیر ہے تو اس کے لیے درج ذیل افراد پر مشتمل انتظامی کمیٹی تشکیل دی جائے۔ جن کے نام درج ذیل ہیں:

مولوی نذیر احمد صاحب، شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ صاحب، خواجہ شہاب الدین صاحب ہیڈ ماسٹر اینگلو عربی سکول، خواجہ تصدق حسین بی اے سکنڈ ہیڈ ماسٹر مدرسہ مذکورہ، غلام محمد حسن خان بی۔اے خلف الصدق، مولوی محمد عنائت الرحمٰن خاں صاحب، منشی محمد کرم اللہ خان صاحب رئیس شہر، مولوی محمد احسان الرحیم خان صاحب رئیس شہر، منشی محمد اکرام اللہ خان صاحب رئیس شہر، سید سلطان مرزا صاحب رئیس شہر، اس کے علاوہ چند آدمی بادشاہزادوں میں سے بھی لیے جائیں تاکہ بہتر طریقے سے انتظام چل سکے۔

خط نمبر ٦

مولانا حالی یہ خط نقوش مکاتیب نمبر جلد اول صفحہ ۱۳۸ سے لیا گیا ہے۔مکتوب الیہ کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا۔ خط کے مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی سید احمد دہلوی مصنف فرہنگ آصفیہ کی مالی اعانت کے بارے میں لکھا گیا ہے۔سید احمد دہلوی کے گھر واقع دہلی میں ۱۹۱۲ء میں آگ لگی تھی جس میں ان کا بہت سا سامان اور کتابیں جل گئی تھیں۔ جس میں فرہنگ آصفیہ کے کچھ حصے بھی شامل تھے جو انھوں نے کئی سالوں کی محنت کے بعد لکھے تھے۔مولانا حالی خط میں ان مسائل اور مالی مشکلات کا بھی ذکر کرتے ہیں جو مولوی سید احمد دہلوی کو درپیش ہیں۔علاوہ ازیں اردو زبان کی خدمات جو انھوں نے کیں ہیں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

خط نمبر ۷

یہ خط علی گڑھ مدرستہ العلوم سے ۱۵۔اگست ۱۸۹۴ء میں لکھا گیا ہے۔مکتوب الیہ نواب وقار الملک ہیں۔ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین خاں تحریک علی گڑھ کے ممتاز راہنما سر سید کے رفیق خاص اور علی گڑھ کالج کے سیکرٹری تھے۔وہ صدار المہام عدالت حیدر آباد بھی رہے۔۱۸۸۷ء میں جب نواب سر آسمان جاہ و راہد مقرر ہوئے تو وہ ان کے معتمد مالگذاری مقرر ہوئے۔بعد میں صدار المہام کے پرسنل اسسٹنٹ بھی رہے۔۱۹۱۵ء تک اہم قومی امور میں حصہ لیا۔۱۹۱۶ء میں امروہیہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ یہ خط نقوش خطوط نمبر سے دستیاب ہوا ہے۔ یہ مولانا حالی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ہے جو تجویز تعلیم مذہبی کے بارے میں ہے یعنی سرکاری مدارس یا کالجوں میں مذہبی تعلیم رائج کرنے کے متعلق ہے۔مولانا حالی تجویز تعلیم مذہبی کو پسند کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہ بہترین تجویز ہے اور گورنمنٹ کو اسے منظور کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔کیونکہ اس وقت حالات ایسے ہیں کہ گورنمنٹ خود اس تجویز کی حمایت کرے گی۔سرکاری مدارس میں پانچ وقت کی نماز ضروری ہونی چاہیے جس طرح کہ محمڈن کالج میں طالب علموں کے لیے نماز پنجگانہ کی پابندی لازمی ہے۔

خط نمبر ۸

مولانا حالی کا یہ خط مولوی بشیر الدین کے نام ہے مولوی بشیر الدین کے متعلق احمد الدین مارہروی نقوش شخصیات نمبر میں لکھتے ہیں۔

> ''مولوی بشیر الدین کی شخصیت ہر اس شخص کے لیے جو ان سے پہلی مرتبہ ملتا تھا معمہ بن جاتی تھی۔چھریرا جسم، چھوٹا قد، نا تراشیدہ داڑھی کبھی الجھی ہوئی کبھی ہوا میں لہراتی ہوئی۔گال میں ایک سیاہ مسہ بال کبھی باریک ترشے ہوئے کبھی بہت لمبے ہڈیاں مضبوط رفتار اتنی تیز کہ ساتھ چلنا مشکل ہو جائے کشیف کھدر کا لباس کرتے کے سب بٹن کھلے ہوئے یا ٹوٹے ہوئے ایک ہاتھ میں تسبیح دوسرے میں دیسی ٹین کا بنا ہوا آلۂ سماعت ایسے تھے وہ مولوی بشیر الدین جن کی علمیت اور صحافت کی ایک دنیا قائل تھی۔''(۲۰)

وہ ایک علمی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ صحافی اور مصنف تھے ان کی مشہور تصنیف ''واقعات دار الحکومت'' بہت اہم سمجھی جاتی ہے لیکن اپنی وضع قطع اور لباس کے معاملے میں انتہائی سادہ اور لاپرواہ تھے۔ظفر عمر (مصنف نیلی چھتری) ان کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ سناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جب میں بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہوا تو چونکہ باہر جانے کی اجازت نہ تھی اس لیے لڑکے بیروں سے چیزیں منگوایا کرتے تھے مولوی صاحب کو دیکھ کر میں نے سمجھا کہ یہ بھی ملازم ہیں اور ان سے سگرٹ لانے کے لیے کہا جب ثقل سماعت کی وجہ سے سن نہ سکے تو میں نے دو پیسے ان کے ہاتھ پر رکھ کر سگرٹ کا اشارہ کیا جس کے جواب میں اس زناٹے کا تھپڑ رسید کیا کہ چودہ طبق روشن ہو گئے۔بھونچکا رہ گیا مولوی صاحب نے فوراً سپرنٹنڈنٹ کو حکم دیا کہ یہ لڑکا سگرٹ پینے کا عادی ہے اسے سگرٹ نہ پینے دینا۔''(۲۱)

مولوی بشیر الدین چونکہ ایک صحافی اور البشیر کے ایڈیٹر تھے مولانا حالی نے جب ''حیات جاوید'' تو اس کی کچھ کاپیاں منشی رحمت اللہ رعد مالک نامی پریس کانپور کی خدمت میں پیش کیں۔ یہ خط اسی سلسلہ میں لکھا گیا تھا کہ منشی رحمت اللہ رعد صاحب آپ کی خدمت میں ''حیات جاوید'' بھیجیں گے انھیں قبول فرما کر اشتہار شائع فرمائے گا۔ یہ خط نقوش مکاتیب جلد اول سے لیا گیا ہے۔

منشی رحمت اللہ رعد ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۱ء میں وفات پائی۔ آپ اخبار عالم تصویر کے ایڈیٹر تھے اور حیات جاوید کے ناشر تھے۔ انھوں نے البرامکہ، نظام الملک طوسی بھی شائع کیں۔ وہ سرسید کے خاص دوستوں میں سے تھے۔

خط نمبر ۹

نواب سید علی حسن صاحب نے اپنی مشہور تصنیف ''فطرۃ الاسلام'' مولانا حالی کی خدمت میں ارسال کی اور اس پر تبصرہ کے لیے مولانا کو لکھا۔ مولانا حالی ان دنوں علیل تھے اور لکھنے پڑھنے سے قاصر تھے۔ مولانا حالی اس کے جواب میں سید علی حسن صاحب کو خط لکھتے ہیں اوو راپنی بیماری کا عذر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کتاب پر ابھی لکھنے سے معذرت خواہ ہوں۔ طبیعت سنبھلنے کے بعد لکھنے کی کوشش کروں گا نیز اس کے مندرجات کو دیکھ کر خوشی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

خط نمبر ۱۰

سررشتہ تعلیمات نے مولانا حالی کی لکھی ہوئی کتب خریدی تھیں۔ رقم وصولی کی رسید مولانا نے مولوی عبدالحق وساطت لکھ دی تھی۔

خط نمبر ۱۱

یہ خط مولوی بشیر الدین کے نام سے مولوی بشیر الدین ایک رسالہ البشیر شائع کرتے تھے۔ ایک شمارہ

میں انھوں نے کانگرس گزٹ کو بطور ضمیمہ اس کے ساتھ شامل کیا تھا۔خط میں کسی سے مشورہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کانگرس گزٹ کے اوپر جلی الفاظ میں ایم۔اے او ایجوکیشنل لکھا جائے تا کہ قوموں کی کانفرنس اور مسلمانوں کی کانفرنس میں فرق ظاہر ہو جائے۔یہ خط ۸۔اگست ۱۹۰۲ء کا تحریر شدہ ہے اور نقوش مکاتیب نمبر جلد اول سے لیا گیا ہے۔

خط نمبر ۱۲

۱۹۰۴ء میں جب مولانا الطاف حسین حالی کو حکومتِ برطانیہ ہند کی جانب سے ان کی علمی و ادبی خدمات کے عوض شمس العلماء کا خطاب ملا تو انھیں ملک کے مختلف حصوں سے مبارک باد کے خطوط موصول ہوئے مذکورہ خط انجمن اسلامیہ پنجاب کی جانب سے شکریہ کے خط کے جواب میں لکھا گیا۔یہ خط مجلس ترقی ادب لاہور کے مجلّہ ''صحیفہ'' سے دستیاب ہوا۔جو ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا اور شمارہ نمبر پچاس ہے۔

انجمن اسلامیہ پنجاب نے جو شکریہ کا خط مولانا حالی کو لکھا وہ درج ذیل ہے:

''جناب شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالیؔ زاد عنائتکم جناب سلام مسنون و تمنائے ملاقات محبت آیات کے بعد ملتمس ہوں کہ انجمن پنجاب لاہور کا ایک عام جلسہ ۳۔جولائی ۱۹۰۴ء منعقد ہوا اور اس جلسے میں باتفاق رائے یہ رزولیوشن پاس ہوا کہ جناب کو جو خطاب شمس العلماء گورنمنٹ عالیہ کی طرف سے بتقریب سالگرہ حضور قیصرِ ہند عطا ہوا ہے میں اس کی مبارک باد جناب کی خدمت میں انجمن کی طرف سے عرض کروں۔انجمن کو جناب کے اس اعزاز حاصل کرنے پر جس کے آپ پورے طور پر مستحق ہیں نہایت خوشی حاصل ہوئی ہے۔

یہ انجمن گورنمنٹ کی ازحد مشکور ہے کہ اس نے جناب کو اس خطاب سے ممتاز فرمایا۔

یہ انجمن گورنمنٹ کی اس عنائت کا صدقِ صدل سے شکریہ ادا کرتی ہے۔دعا ہے کہ

خدا پاک ذات بابرکات آں حضرت کو تا دیر قوم کے سر پر سایہ گستر رکھے۔ آمین۔

والسلام

آپ کا نیاز مند

خان بہادر محمد برکت علی خان

آنزیری سیکرٹری انجمن اسلامیہ پنجاب

۳۔جون ۱۹۰۴ء"(۲۲)

خط نمبر ۱۳

منشی نجم الدین علی گڑھ کالج میں کلرک تھے انھیں سرسید کے ساتھ کام کرنے کا بھی موقع ملا اس کے علاوہ جب سرسید کے انتقال کے بعد نواب محسن الملک کالج کے سیکرٹری بنے تو منشی صاحب ان کے دفتری عملے میں شامل تھے۔ ۱۲۷ اگست ۱۸۹۷ء کو ان کے ہاں ایک بچی کی ولادت ہوئی۔ منشی صاحب نے بچی کا نام تاجدار بیگم رکھا جب اس کی عمر سات برس کی تھی تو اس پر دیوار گر گئی اور وہ جاں بحق ہوگئی۔ جولائی ۱۹۰۴ء میں منشی نجم الدین نے مولانا حالی کو خط لکھ کر قطعہ تاریخ کی درخواست کی تاکہ قبر پر کتبہ لگایا جائے۔

خط نمبر ۱۴

یہ خط مولوی قمر علی صاحب کے نام ہے خط میں مولانا حالی نے محمود احمد عباسی صاحب کا ذکر کیا ہے اور احوال دریافت کیے ہیں۔ محمود احمد عباسی صاحب آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے سپرنٹنڈنٹ تھے یہ بھی پوچھا گیا کہ وہ علی گڑھ میں ہیں یا دہلی میں ہیں علاوہ ازیں حضرت شاہ نظام الدین کے صاحب زادے کا نام اور لقب اور رہائش کے متعلق معلومات فراہم کرنے کو کہا گیا ہے۔ یہ خط بھی نقوش مکاتیب نمبر حصہ اول سے دستیاب ہوا ہے۔

خط نمبر ۱۵

وحشت کلکتوی کے نام ہے۔سید رضا علی نام تھا اور وحشت تخلص کرتے تھے۔طوطی بنگال کے لقب سے مشہور تھے۔۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء کڑو یہ روڈ کلکتہ میں پیدا ہوئے۔والد کا نام مولوی شمشاد علی تھا۔وحشت کلکتوی اردو، فارسی، عربی اور انگریزی ادب سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔شاعری میں ترانہ وحشت، دیوان وحشت اور نقوش و آثار یادگار شعری تخلیقات ہیں نہایت اچھے عادات واخلاق کے مالک تھے۔وہ مولانا حالی کے زمانے کے شاعر تھے۔بقول ڈاکٹر وفا راشدی:

> ''وحشت مولانا حالؔی کے ہم عصر تھے۔اگر حالی وحشت سے ملتے تو یقیناً وحشت کے اخلاق کے بارے میں وہی رائے قائم کرتے جو انھوں نے سر سید کے بارے میں کی۔''(۲۳)

یہ خط ۲۹ مئی ۱۹۱۰ء کا لکھا ہوا ہے۔یہ مولانا حالی کی ذاتی تحریر کا عکسی خط ہے جو نقوش مکاتیب نمبر حصہ اول میں مرقوم ہے۔خط میں مولانا حالی وحشت کو دیوانِ وحشت عنائت فرمانے پر شکریہ ادا کرتے ہیں اور ان کے ساتھ اس بات پر تاسف کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ ہجوم امراض اور ضعفِ قوی کی وجہ سے مطالعہ سے قاصر ہوں لیکن آپ کے لیے دل میں محبت کثیر ہے۔علاوہ ازیں مرزا غالب کے جب کلکتہ پنشن کے سلسلے میں گئے اس وقت وہاں ان کے فارسی کلام پر اعتراضات کیے گئے تھے۔جس پر مرزا نے مثنوی بادِ مخالف اسی سلسلہ میں لکھی تھی جو ان کے کلیات میں موجود ہے۔اس کے علاوہ عذر کے بعد قاطع برہان کے خلاف مولوی احمد علی بیگ جن کا تخلص احمد تھا اور وہ رئیس کلکتہ میں سے تھے نے ایک کتاب ''مویدِ برہان'' نہایت تلخ لہجے میں لکھی تھی مگر آپ نے مرزا کی تائید میں لکھ کر سچائی کا ساتھ دیا۔حالی نے مرزا غالب کی شاعری کی تعریف کی ہے اور کہتے ہیں ایسی شاعری اردو اور فارسی میں مفقود ہے۔اور مرزا کے کلام میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے آپ نے مرزا کے کلام کا تتبع کر کے عہدِ قدیم کی یاد تازہ کر دی ہے اور جن لوگوں نے مرزا غالب کی مخالفت میں لکھا ہے۔آپ نے ان پر ثابت کیا ہے کہ مرزا کا تتبع ان کا حق ہے۔آخر میں مولانا حالی نے ان کے لیے دعا کی ہے۔

خط نمبر ۱۶

یہ خط مولانا حالی نے سید احمد دہلوی مولف فرہنگِ آصفیہ کے نام لکھا ہے۔سید احمد دہلوی کے گھر واقع دہلی میں ۱۹۱۲ء میں آگ لگ گئی تھی جس میں گھر کا بہت سارا سامان اور کتابیں مطبوعہ و غیر مطبوعہ جل کر راکھ ہو گئیں تھیں۔اس آگ میں ایک بچی بھی جو سات آٹھ سال کی تھی جل کر ہلاک ہوگئی تھی جس کا ذکر کرتے ہوئے سید احمد دہلوی لکھتے ہیں:

> ''برابر کے کمرے میں ہمارا دفتر تھا ہم بھی نظام الدین اولیاء قدس سرہ کی زیارت سے فارغ ہو کر دن بھر کے تھکے ماندے گھوڑے بیچ کر سوئے تھے۔اول ہمسائی کی آنکھ کھلی،انھوں نے اپنا لحاف سنبھالا او رہفت سالہ بیٹی کو جگا کر کہا کہ باہر نکل وہ باہر کے بھڑکتے ہوئے شعلے دیکھ کر الٹی اندر چلی گئی اور وہیں بھسم ہو کر رہ گئی......

مزید آگے لکھتے ہیں:

> اس آتش زدگی میں ہماری مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف، تمام عمر کا سرمایہ، قدیم و جدید ذخیرہ کتب، پہننے اوڑھنے کے کپڑے، برتن بھانڈے اور تمام اثاث البیت گرداباد ہو گیا۔اس سامان کا اتنا صدمہ نہیں تھا جس قدر اس معصومہ کی جان کا افسوس اور رنج تھا۔''(۲۴)

سید احمد دہلوی نے اس آتشزدگی کی اطلاع بذریعہ کارڈ اپنے دوست سید عبدالعلی کو دی جب سید عبدالعلی کو یہ کارڈ ملا تو مولانا حالؔی اس وقت ان کے پاس بیٹھے تھے۔انھوں نے مولانا حالؔی کو وہ خط دکھایا۔مولانا حالی چونکہ ہمدرد اور غم گسار شخص تھے کارڈ پڑھ کر انھوں نے ازراہ ہمدردی یہ خط لکھا۔یہ خط فرہنگ آصفیہ جلد اول سے لیا گیا ہے۔خط میں مولانا حالی نے انگلستان کے مشہور ڈکشنری نویس ڈاکٹر لین کا ذکر بھی کیا ہے جن کے ساتھ بھی اسی طرح کا واقعہ پیش آیا تھا علاوہ ازیں لڑکی کی حادثاتی موت پر اظہار افسوس کے ساتھ ساتھ سید احمد دہلوی کو استقلال کی تاکید کی ہے۔

خط نمبر ۱۷

مولانا حالی کا یہ خط سید افتخار عالم مارہروی کے نام ہے۔سید افتخار عالم نے مولوی نذیر احمد کی سوانح عمری ''حیات النذیر'' کے نام سے لکھی اور اس کی ایک کاپی مولانا حالی کو تبصرہ کے لیے بھیجی۔ یہ ۱۹۱۲ء میں شمسی پریس دہلی سے چھپی۔آج کل ناپید ہے لیکن اس کا ایک نسخہ جو تین رنگوں کے کاغذوں پر چھپا ہوا ہے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے کتب خانہ میں موجود ہے جسے میں نے خود دیکھا ہے۔مولانا حالی ان دن علیل تھے۔یہ خط انھوں نے اس کتاب کے موصول ہونے کے بعد لکھا جس میں وہ سب سے پہلے شکریہ ادا کرتے ہیں اس کے بعد لکھتے ہیں کہ میں اگرچہ مطالعہ کتب سے قاصر ہوں لیکن کسی سے سن لیتا ہوں اور جب کوئی نہیں ہوتا تو جہاں تک ہوسکتا ہے خود پڑھتا ہوں اور آپ کی کاوش کا شکریہ اپنی طرف سے مسلمان پبلک کی طرف سے ادا کرتا ہوں۔علاوہ ازیں وہ یہ لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کے چار ترجمے جو مولانا کے ترجموں کے بعد ہوئے ہیں وہ بھی انھیں ارسال کیے جائیں اس کے بعد وہ اس پر مضمون لکھ کر روانہ کردیں گے یہ خط گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کی لائبریری سے دستیاب ہوا۔

خط نمبر ۱۸

یہ خط بھی سید افتخار عالم کے نام ہے۔گویا پہلے خط کا تسلسل ہے۔ پہلے خط میں جو مولانا حالی قرآن مجید کے چار ترجموں کی فراہمی کا ذکر کیا تھا ان کے موصول ہونے کے بعد لکھا ہے۔سید افتخار عالم نے وہ چاروں ترجمے مولانا حالی کو بھیج دیے تھے جس کے جواب میں یہ خط لکھا گیا ہے۔اس خط میں وہ دردسر کی شکایت بھی کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ درد میں کچھ تخفیف ہوجائے تو اس خط کا جواب مع مطلوبہ مضمون ارسال کردیں گے نیز حیات النذیر کی مکمل جلد بھی واپس بھیج دوں گا۔

مولانا حالی ''حیات النذیر'' کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ کتاب نہایت لیاقت اور خوش سلیقگی سے لکھی گئی ہے۔

باوجودیکہ راقم کی حالت مدت سے مطالعے کی اجازت نہیں دیتی، پھر بھی کتاب کی دلچسپی اور ہیرو کی عظمت نے مجبور کر دیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس معزز لائف کو خود پڑھوں یا اوروں سے پڑھوا کر سنوں۔"(۲۵)

آگے مزید لکھتے ہیں:

"حیات النذیر" میں مصنف نے مولانا نذیر احمد کی زندگی، ان کے طرز ماندو بود ان کے اخلاق و عادات، ان کے اوقات و مشاغل، ان کے اعتقادات، ان کی رایوں کا جو صحیح نقشہ خود ان کی تصنیفات و تعریحات کی بنا پر کھینچا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات مذکورہ کے تفحص اور جستجو میں سعی و کوشش کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔"(۲۶)

یہ خط نقوش مکاتیب نمبر حصہ اول سے لیا گیا ہے۔

خط نمبر ۱۹

آتشزدگی کے واقعہ کی تفصیل بہت سے اخبارات کے مدیروں نے اپنے اخبارات میں لکھی اظہار افسوس کے خطوط بھی لکھے جن میں "پیسہ اخبار" لاہور، اخبار مسلمان امرتسر، علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ، مشیر دکن راجپوتانہ گزٹ شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں خواجہ الطاف حسین حالی نے نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی کے نام یہ خط لکھا جس میں انھوں نے نواب صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ اس واقعہ نے سید احمد دہلوی صاحب کو بے دست و پا کر دیا ہے لہٰذا ان کی اعانت کی جائے تا کہ وہ دوبارہ اپنا کام شروع کر سکیں۔ یہ خط بھی فرہنگ آصفیہ صفحہ ن سے لیا گیا ہے۔

حالی کی غیر مدوّن تحریریں

تحریر نمبر:۱

مولانا حالی نے یہ مضمون مدرسہ طبیہ دہلی کے چودھویں سالانہ جلسے میں جو یکم اپریل ۱۹۰۳ء کو منعقد ہوا پڑھا تھا۔ اس جلسہ میں نواب امیر الدین والیٔ ریاست لوہارو، شمس العلماء مولوی نذیر احمد، شمس العلماء منشی محمد ذکا اللہ، حکیم محمد واصل خاں سیکرٹری مدرسہ طبیہ اور مولانا الطاف حسین حالی نے شرکت کی۔

حکیم محمد واصل خاں سیکرٹری مدرسہ نے سالانہ رپورٹ پیش کی مولوی نذیر احمد نے لیکچر دیا اور الطاف حسین حالی نے درج ذیل مضمون پڑھا اس سالانہ جلسے کی روداد مطبوعہ افضل المطابع دہلی میں درج ہیں۔

مولانا حالی نے اپنے مضمون میں طب یونانی کی اہمیت و افادیت پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی یہ ان کا نہایت اہم مضمون ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہر دم قدم زمانہ آگے بڑھا رہا ہے
جو ست رو ہیں ان کو پیچھے ہٹا رہا ہے
جو لوگ آج کل ہیں پستی یہ اپنی قانع
دور سپہر ان کو آنکھیں دکھا رہا ہے

ابتدائے آفرینش سے آج تک جو کرشمے نوع انسانی کی کوشش سے ظہور میں آئے ہیں اور خاص کر زمانہ حال میں جو غیر معمولی ترقیات علوم وفنون وایجادو اختراع میں ہوئی ہیں۔وہ سب اس حد سے گزر گئی ہیں کہ ان کا یقین دلانے کے لیے کسی دلیل و برہان پیش کرنے کی ضرورت ہو۔ فی الواقع انسان نے اپنی کوششوں سے ثابت کر دیا ہے کہ خلافتِ الٰہی کے منصبِ جلیل کا استحقاق تمام مخلوقات میں صرف اسی کے لیے سزاوار تھا۔لیکن سب سے زیادہ گراں بہا اور بیش قیمت وہ کوششیں ہیں جو قدیم زمانے میں اہل ہند اور اہل یونان نے اور زمانہ حال میں

اہل یورپ نے علم طب کی ترقی میں کی ہیں۔ کیونکہ طب کے سوا جتنے علوم وفنون ہیں اور جس قدر عجیب و غریب ایجاد و اختراع اور نئے انکشافات اب تک دنیا میں ہو رہے ہیں ان سب کا مقصد انسان کی جسمانی یا روحانی خوشی کو ترقی دینا ہے اور طب کا مقصد خود اس کی زندگی کو بقدرِ امکان ہر ایک خطرے سے محفوظ رکھنا اور جہاں تک ہو سکے اس کے لیے ایسے اسباب پیدا کرنا ہے جس سے اس کو اپنے منصبِ جلیل یعنی خلافتِ الٰہی کے فرائض بہت دیر تک ادا کرنے کی مہلت مل سکے۔ اگرچہ علمِ طب کو عموماً ایک ظنی علم کہا گیا ہے مگر جس قدر زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے رفتہ رفتہ اس کے اصول و فروغ ظن اور گمان کی حد سے نکل کر یقین کے درجے تک پہنچتے جاتے ہیں۔ ایک موت کا انسداد نہ اب تک ہوا ہے اور نہ آیندہ ہونے کی امید ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ جن ملکوں میں قواعد حفظِ صحت کی پوری پابندی کی جاتی ہے وہاں اموات کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے اور پیدائش بڑھتی جاتی ہے۔ بچے برخلاف غیر تربیت یافتہ ملکوں کے کم تلف ہوتے ہیں اور جیسا کہ قدم کا خیال تھا کہ وہاں انسان کی عمر کا پہلا عشرہ اب عشرۂ قتالہ نہیں سمجھا جاتا۔ سرجری وہ کرشمے ظاہر کر رہی جواب سے سو برس پہلے خرق عادت سمجھے جاتے تھے۔ سال گذشتہ میں جو عمل جراحی حضور قیصرِ ہند کی آنت پر کیا گیا تھا اور جیسی کامیابی وہاں ہوئی تھی میں نے معتبر ذرائع سے سنا ہے کہ انہی دنوں میں بعینہٖ ویسا ہی حیدرآباد میں ڈاکٹر لاری کے ایک ہندوستانی پیش دست سرجن نے ایک مریض پر کیا اور ویسی کامیابی اس کو ہوئی جیسی حضور قیصرِ ہند کے سرجن کو ہوئی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سرجری کا کمال ایسا عام ہوتا جاتا ہے کہ جو بڑے بڑے نازک عمل بادشاہوں اور شہنشاہوں کے سرجن کر سکتے ہیں ویسے ہی عمل معمولی جراح جو غریبوں کا علاج کرتے ہیں کر گزرتے ہیں بہت سے امراض جو پہلے لاعلاج سمجھے جاتے تھے ان کے حکیمی اور قطعی علاج دریافت ہوئے اس جیسے چیچک کا ٹیکہ اور کتے کے کاٹنے کا علاج شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ ایسے حکیمی علاج صرف ڈاکٹری میں پائے جاتے ہیں اور یونانی یا بیدک (ویدک) میں ان کا وجود نہیں ہے مگر اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں صدہا بیماریوں کے علاج خاص خاص لوگوں کے پاس ایسے حکیمی اور تیر بہدف موجود تھے اور موجود ہیں جو کبھی خطا نہیں کرتے۔ میں نے اپنی آنکھ سے ایک جوان عمر جاٹ کو ۱۸۵۷ء سے پہلے دیکھا تھا جو قصبہ سری ضلع رہتک میں رہتا تھا اور جس کو تپ دق کا

مرض تھا ایک بید (وید) نے اس کو اپنے پاس سے کچھ دوا دے رکھی تھی اور بکری کے دودھ کے سوا ہمیشہ کے لیے ہر ایک غذا سے منع کر دیا تھا جس وقت میں نے اس دیکھا ہے اس کو وقت تک اس کو گیارہ برس بکری کا دودھ پیتے گزر چکے تھے اور وہ اگر چہ کسی قدر ربلا تھا مگر کھیت کیاری کا کام اور دنیا کے کاروبار مثل تندرستوں کے کرتا تھا۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں دیکھی اور سنی گئی ہیں۔ انہی دنوں میں میری ایک عزیز بچی تین برس سے سبل کی بیماری میں مبتلا تھی۔ پانی پت اور میرٹھ میں اس کا ڈاکٹری علاج کیا گیا اور میرٹھ میں جو ڈاکٹر معالج تھا وہ نہایت شفقت اور محبت سے اس کا علاج کرتا تھا مگر روز بروز مرض بڑھتا جاتا تھا آخر مایوس ہو کر علاج چھوڑ دیا گیا۔ مگر چند روز بعد ایک پنڈت برہمن کا علاج شروع کیا گیا دو ہی تین دن میں فائدہ معلوم ہونے لگا اور دس بارہ روز میں آنکھیں بالکل اچھی ہو گئیں۔ ہاں مگر اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ایسے حکیمی نسخے ہندوستان میں خاص خاص شخصوں کے پاس پائے جاتے ہیں۔ مثل یورپ کی ان کی اشاعت عام طور پر نہیں ہوتی اس لیے اس قسم کے ہزاروں نسخے دنیا میں نا پید ہو گئے اور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے سوا ہم جس طرح اکثر بیماریوں کو دیکھتے ہیں کہ یونانی یا بیدک (ویدک) سے اچھے نہیں ہوتے اور ڈاکٹری علاج سے ان کو فائدہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہم بہت سے ایسے بیمار بھی دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹری علاج سے ان کو مطلق فائدہ نہیں ہوتا اور یونانی یا بیدک (ویدک) سے بہت جلد اچھے ہو جاتے ہیں۔ پس جس طرح یونانیوں اور بیدک (ویدک) والوں کو تعصب ڈاکٹری علاج سے صحیح نہیں ہے اسی طرح ڈاکٹروں کا یونانی اور بیدک (ویدک) والوں کو نظر حقارت سے دیکھنا محض بے جا ہے۔ ڈاکٹری کا رواج ہندوستان میں تقریباً سو برس سے پایا جاتا ہے۔ اس کی باقاعدہ تعلیم اس کی روز افزوں ترقی اس کے شفا خانوں کا حسنِ انتظام اس کی دواؤں کی لطافت اور پاکیزگی اس کے آلات کی صفائی اور عمدگی اور سب سے بڑھ کر اس کا گورنمنٹ کے سایۂ حمایت میں نشو نما پانا اس بات کا مقتضی تھا کہ یونانی طب کا ہندوستان میں نام و نشان تک باقی نہ رہتا کیونکہ نہ اس کے لیے باقاعدہ تعلیم کا کوئی انتظام تھا اور نہ ایسے اسباب موجود تھے جن سے اس کو تقویت پہنچتی۔ اس کی ترقی متعدد صدیوں سے رکی ہوئی تھی اور برٹش گورنمنٹ نے کبھی علمی طور پر اس کی حمایت نہیں کی۔ باوجود اس کے کہ اب تک اس نے ڈاکٹری کا بڑی پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے اور اگر میرا

قیاس غلط نہ ہو تو اس کے معتقدوں کی تعداد ملک میں اب بھی ڈاکٹری کے ماننے والوں سے کئی خطے زیادہ ہے اور اس بات کا یقین کرنے کی وجہ ہیں کہ لوگوں کو اس کی طرف مائل ہونا محض اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ ڈاکٹری سے تعصب رکھتے ہیں بلکہ اکثر صورتوں میں وہ اس کو ڈاکٹری کی نسبت زیادہ مفید اور زیادہ بے خطر پاتے ہیں۔

میری غرض اس موقع پر یونانی بیدک (ویدک) کو ڈاکٹری پر ترجیح دینے سے نہیں ہے بلکہ میرا مطلب اس تمام تمہید سے صرف اس قدر رہے کہ طب یونانی یا بیدک (ویدک) جیسا کہ بعض سریع الاعتقاد آدمی خیال کرتے ہیں محض ایک ڈھکوسلا نہیں ہے بلکہ دونوں طبابتوں میں بے شمار صداقتیں موجود ہیں اور اس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ جس اصول پر مدرسہ طبیہ قائم کیا گیا ہے وہ اصول کس قدر ادب اور تعظیم کے لائق ہے۔ اس مدرسے کے مرحوم بانی کا صرف یہی مقصد نہ تھا کہ علم طب میں جو ترقیات زمانہ حال میں ہوئیں ہیں ان کو بھی اس میں شامل کیا جائے۔ اگرچہ نہایت افسوس ہے کہ ملک کی بے توجہی اور ناقدردانی سے محروم بانی کا جو اصل مقصد تھا اس کا ایک سواں حصہ بھی اب تک پورا نہیں ہوسکا۔ یہ نہایت تعجب کی بات ہے کہ تمام ہندوستان میں جس قدر دہلی اور نواح دہلی کے ہندو مسلمان یونانی کے معتقد ہیں۔ ایسے شاید ملک کے کسی حصے میں نہیں پائے جائیں گے اور اس کا بدیہی ثبوت حکیم واصل خاں صاحب سیکرٹری مدرسہ طبیہ کا مطب ہے جہاں صبح سے شام تک دیسی اور پردیسی بیماروں یا بیمار داروں کا ہجوم رہتا ہے۔ اس ہجوم کو میں جب دیکھتا ہوں مجھے مومن خاں مومن مرحوم کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے:

رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام
آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

اس سے زیادہ ہندوستان کی مردہ دلی کا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ جس طریقہ علاج پر لوگ اس قدر شیفتہ اور مفتون ہیں اس کو قائم رکھنے کے لیے جو مدرسہ جاری کیا گیا ہے اس طرف لوگوں کو مطلق توجہ نہیں اہل مغرب مشرق کے لٹریچر اور اس کی مردہ زبانوں کو زندہ کر رہے ہیں۔ ہندوستان اور ایران کی قدیم زبانوں کی جس قدر تعلیم و تعلم، جرمنی، فرانس اور انگلینڈ میں آج کل پائی جاتی ہے۔ خود ہندوستان اور ایران میں اس قدر نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے وہاں کے کسی نہ کسی ملک میں ہر سال یورپ کے بڑے بڑے اور ٹیلنٹ

کانگرس منعقد کرتے ہیں اور مشرقی لٹریچر اور مشرقی زبانوں کے متعلق نئی تحقیقات میں کانگرس کے جلسوں میں پیش کرتے ہیں۔مگر ہمارے ہم وطنوں کی مردہ دلی اور بے پروائی کا یہ حال ہے کہ جس طبابت کی طرف وہ اس قدر گرویدہ ہیں اور جو روز بروز تنزل کرتی جاتی ہے اس کے قائم رکھنے کا کسی کو خیال نہیں ۔ نہ ہمارے دولت مندوں کو یہ توفیق ہے کہ یونانی اور بیدک (ویدک) کی ترقی کے لیے کچھ مالی امداد کریں اور نہ ہمارے طبیبوں اور بیدوں (ویدوں) میں یہ ہمت ہے کہ مدرسہ طبیہ کے مہتموں کی کوششوں میں شریک ہو کر اپنی اصلاح ومشورہ سے ان کے ارادوں کو تقویت دیں ۔ ہندوستان میں عموماً یہ خرابی ہر جگہ دیکھی جاتی ہے کہ اگر حسن اتفاق سے کسی اولعلعزم آدمی کے دل میں رفاہ عامہ کا خیال پیدا ہوتا ہے تو اس کا سارا بوجھ اسی کو اٹھانا پڑتا ہے۔اگرچہ چند آدمی اس کی وجاہت کے سبب اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں مگر دل و جاں سے کوئی شخص اس کے نیک کام میں شریک نہیں ہوتا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس کے مہتموں اور کار پردازوں کا جی چھوٹ جاتا ہے ۔

مدرسہ طبیہ کے مرحوم بانی کا جو اصل مقصد تھا وہ کوئی ایسا معمولی کام نہیں ہے کہ ایک یا دو شخصوں کی کوشش اور توجہ سے پورا ہو جائے اس کے لیے بے انتہا معاونوں اور مدبروں کی ضرورت ہے اس کے مصارف کے لیے زرخطیر درکار ہے اور میرے نزدیک اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر وہ اسی چال سے چلتا رہا تو اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔اگرچہ گورنمنٹ کی سرپرستی سے بھی ایسے کاموں میں بہت کچھ تقویت پہنچ سکتی ہے۔مگر جب تک خود ہمارے ہم وطنوں میں اس کو ترقی دینے کا خیال پیدا نہ ہوگا صرف گورنمنٹ کی سرپرستی سے کچھ کام نہیں چل سکتا۔

تحریر نمبر ۲

مولانا عبیداللہ سہروردی کی بیگم اختر بانو سہروردیہ جو حسین شہید سہروردی کی والدہ تھیں نے اپنے بھائی سر عبداللہ المامون سہروردی کی فرمائش پر کتاب ''میلاد النبی موسوم بہ کوکب دری'' کے عنوان سے کتاب لکھی جو ۱۹۰۰ء میں چھپی اس کتاب کی اشاعت پر برصغیر کے نامور اور جید علماء وا کابرین نے تقریظیں لکھیں جو اس کی طبع ثانی ۱۹۳۵ء میں شامل کر دی گئیں تھیں ۔مولانا حالی نے جو تقریظ لکھی وہ درج ذیل ہے:

"کتاب میلاد النبیؐ موسوم بہ کوکب دری مرسلہ جناب میرے پاس پہنچی اور میں نے اسی وقت اس کو قریب ایک نصف کے دیکھا نہایت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے اہل علم زمانے کی ضرورتوں کو محسوس کرنے لگے۔ فی الواقع جس مقصد کے لیے آپ نے ذکر میلاد خیر العباد (صلعم) کے لیے یہ طرز اختیار فرمائی وہ نہایت اہم اور مسوہ بالشان ہے۔ امید ہے کہ جو لوگ زمانہ حال کی ضرورتوں سے خبردار ہیں وہ اسی طرز میں ضرور آپ کی تقلید کریں گے۔ میرا مدت سے یہ ارادہ ہے کہ آج کل کی حالت کے موافق ایک رسالہ میلاد شریف میں لکھوں میرے اکثر دوستوں نے بارہا اس کی فرمائش کی ہے اور خاص کر تعلیم یافتہ نوجوان اس کے زیادہ خواہش مند ہیں مگر مجھے اب تک اس کے لکھنے کا موقع نہیں ملا الحمد اللہ کے آپ نے اس بات میں سبقت کی ہے اور اسلام کی ایک ایسی خدمت کی ہے جس کا وہ سخت حاجت مند ہے۔ جس بنیاد پر بعض اہل اسلام ذکر میلاد کو بدعت قرار دیتے ہیں اگر اس بنیاد کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس قاعدے کے موافق کہ الضرورۃ تبیح المحظورات آج کل یہ ذکر شریف میرے نزدیک واجبات سے ہے مگر جیسا کہ آپ نے دیباچے میں تحریر فرمایا ہے کہ اس زمانے میں ذکر میلاد کی قدیم کتابیں اور رسالے بجائے مفید ہونے کے سخت مضر معلوم ہوتے ہیں۔ اب معجزات اور خوارق عادات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق و عادات اور آپ کی تعلیمات کی خوبیاں بیان کرنے کا وقت ہے۔ شاید آپ کو یاد ہو گا کہ اول اول مشنری لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر یہ اعتراض کرتے کہ قرآن میں کوئی معجزہ آپ کا مذکور نہیں ہے مگر جب سے مغربی تعلیم مسلمانوں میں پھیلنے لگ گئی ہے اور تعلیم یافتہ مسلمان

نوجوان خرق عادات کو محال سمجھنے لگے ہیں اس وقت سے پادریوں نے یہ اعتراض کرنا چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ تعلیم یافتہ لوگ حوارق عادات کے قرآن میں مذکور نہ ہونے کو اور عندالطلب معجزہ لانے سے عجز ظاہر کرنے کو بجائے اس کے کہ نبی کی نبوت کے منافی سمجھیں اس کو نبی برحق ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں۔ پس آپ نے درحقیقت ایک کتاب کے لکھنے سے اسلام کی نہایت عمدہ خدمت کی ہے۔ خدا کرے اور لوگ بھی اس کی اتباع کریں اور مولودنویسی اور مولودہ خوانی کا طریقہ بالکل بدل ڈالیں۔"

تحریر نمبر ۳

حکیم محمد شریف خاں جو برصغیر پاک و ہند کے مشہور حکیم تھے اور جن کا تعلق حکیموں کے مشہور خاندان ''خاندانِ شریفی'' سے تھا کی تصنیف ''علاج الامراض'' جو ۱۳۰۳ھ میں پہلی بار اکل المطابع دہلی سے شائع ہوئی کے خاتمے پر مولانا حالی کی تقریظ چھپی تھی جو درج ذیل ہے:

تقریظ خاتمہ کتاب ''علاج الامراض'' ریختہ کلک گوہر سلک جناب مولوی الطاف حسین صاحب المتخلص بہ حالی مدظلہم العالی حامدو مصلیاً۔

بر ماہرانِ صناعت طب کہ درین فنِ شریف علَم امتیاز برافراشتہ و یا درعلاج و مداوا دستے داشتہ اند مخفی و مستتر نیست کہ کتاب علاج الامراض کہ از غایت اشتہار محتاج بیان نیست، امروز دراکثرے از بلاد ہندوستان مستند و محکاے اساطین رین فن و معول علیہا ساتیدِ این صاعت ست، تااین مجموعۂ نافعہ دراقطار ممالک ہند اشہار یافت سائر مؤلفات پیشیناں را کہ درخصوص حکمۂ عملیہ دستورالعمل اطبائے روزگار بود برطاق نسیاں گذاشتند وایں نامۂ نامی را مناطِ عمل و مدارتدبیر انگاشتند۔ وچگونہ چنین نباشد کہ از افادات جلیلۂ بقراطِ وقت و جالینوس زماں اشرف الحکماء حکیم شریف خاں است رحمۃ اللہ (کذا) کہ درمراتب علم ونظر و مدارجِ عمل وتدبیر سرآمد حکمائے نامدار و سرد

فخرِ اطبائے روزگار بود۔ ہم در حکمت عملیہ و ہم در حکمۃ نظریہ تصانیف سدیدہ از متون و شروح و تعلیقات مفیدہ از آنجناب یادگار و بر جلالت شان وے گواہ ست و در اواخرِ سلطنت گورگانیہ سکۂ شکور حذاقت بنام دے بود۔ او اول کسے است کہ طب یونانی را با طبِ ہندی امتزاج دادہ معجونے غریب احداث فرمودہ است و بر محققاں این صناعت حالی و مبرہن ساختہ کہ طب یونانی بے طبِ ہندی طعامے است بے نمک و طب ہندی بے طب یونانی نمک بے طعام۔ از ینجا است کہ از عہدِ حضرت مصنف الی یومنا ہذا حکمائے جلیل القدر و اطبائے عظیم الشان در ہر طبقہ ازیں سلسلہ علیہ، برمے خاستہ اند و امروز کہ بتقاضائے وقت در چار سوے ہندوستان طب یونانی طبا طب ہندی چوں سائر علوم مشرقیہ اندک اندک رو بہ زوال نہادہ است و طب جدید مغربی ترقی روز بہ دارد کہ مدارس بے شمار در تمامی کشور محض ترویج آں مفتوح ساختہ اند و در سائر بلاد و قریٰ دار الشفاہا کشادہ اند مع ذلک صیت جمیل و آوازۂ بلند ایں خانوادۂ بزرگ در اطراف ممالک ہند ہمچناں یوماً فیوماً در تزاید و حیناً فحیناً در ترقی است صحاب امراض مذمنہ اسقام ہائلہ از بلادِ دور دست در پنجاے آیند و اکثر آنہا دالا ماشاء اللہ در اندک فرصت شفایافتہ بخانہ خودشاں معاودت نے کنند۔ القصہ فضائل و محامد ایں دودمانِ گرامی زیادہ از آنست کہ در ظرفِ بیاں تواند گنجید لاجرم باز بر سخن میرود۔

کتاب ''علاج المراض'' کہ شمۂ از محاسن آن شمردہ آمد اگرچہ از جمیع مصنفات قوم کہ در فن معالجات نوشتہ اند بمزیت و امتیاز اختصاص داشت فاما در مطاولی عبارتش بوجوہ عدیدہ چنانکہ عمدۃ الحکماء حکیم مرتضٰی خاں مغفور نبیرۂ اصغر حضرت مصنف و کہین برادر مسیح الزمانی حکیم محمود خاں وقاہ اللہ حدثانِ لادہر و شرور الذمان در دیباچہ کتاب تصریح کردہ اند خللے عظیم راہ یافتہ بود کہ بحکم اہل لبیت ادری بمافی البیت ہیچ کس غیر از اولاد و احفاد مصنف عالیمقام بر آن اطلاع نداشت واحدے را غیر ازیں دودمانِ سترگ یارائے آں نبود کہ تدارکِ این خلل و جبرایں نقصان تواند کرد۔ بناء علی ذلک خانِ مبرور بر حسبِ وصیت پدر بزرگوار خود تشمیر ذیل نمودہ بر تلافی مافات و تصحیح اغلاط این نامۂ گرامی ہمت گماشتند و تا مدتِ بست و اند سال در ایں امر خطیر اشتغال داشتند، نسخہ ہائے ہر مرض را از مواضع شتّی التقاط کردہ در یکجا فراہم آوردند و ترکیب ہائے کہ نہ بر محل خود مرقوم بود ہمہ را بمحل مناسب وضع فرمودند و

زغتشا شے کہ از سہو نسّاخ درعبارت حضرت مصنف راہ یافتہ بود بتدارک آں پرداختند و بسارے از نسخ مجربہ کہ دراصلِ کتاب مندرج بود ولا کن از قلتِ مبالات کاتبان از میان رفتہ اثر ازاں یافت نمی شد در جستجوئے آنہا غائت سعی و منتہائے جہد بکار بردہ در سفینہ ہا و بیاض ہا کاوشے ہر چہ تمام تر مبذول فرمودندہ و ہر قدر کہ بپایۂ ثبوت رسیدہ آنرا جزو کتاب ساختند و درآنچہ شائبہ شبہت و شک یافتند از میان انداختند و چیز ہائے کہ مکرر در کتاب موصوف اندراج یافتہ بود از صفحاتِ آن پاک زدودند۔

بالجملہ کارے بود از حوصلہ وسع ابنائے زمان بیرون و مشکلے بود از طاقتِ ایں و آں فزوں۔ وضرورتِ آن نیز غیر ازین دودمان والا بر ہیچ کس ظاہر نبود۔ چہ ہر کس از طبیب و متطبب بے خبر از ماہیت کتاب بر ہمان نسخہ مغشوشہ قناعت داشت و تمی دانست کہ ادنیٰ تغیر یا تفاوتِ یسیرے درآں تواند گنجید۔

الحاصل از میامن توفیقات الٰہی و مساعی جمیلۂ خاں غفران مآب این مرحلۂ دشوار گذار بپایاں رسید و کتاب موصوف کہ تحقیقی شاہد رعنائی از حلی و حلل عاری بود بہ پیرایہ صحت آراستہ و کسوتِ انتقاء پیراستہ شد و شارعے از خس و خاشاکِ شکوک مصفا و از گرد غبار شبہات منزہ برائے سالکانِ مسلک تدبیر و تجربت روشن و کشادہ گشت۔ خان مغفور را غایت مامول آں بود کہ این نسخہ مصححہ ہم در زمانِ حیات ایشان کسوتِ انطباع پوشیدہ در بلاد و امصار شائع کردد اما از جہد موانع ناگزیر آرزوئے ایشاں از قوۃ بفعلِ نیامد و بعد از وفاتِ ایشان نیز تا مدتِ یازدہ سال آں خریدہ حسنا ہمچنان در جلباب مستوری مختفی و متواری بود تا آنکہ جارحہ توفیق ربانی سنگہا از سر راہ برداشت و حواجزِ و موانع از میان برطرف شد۔ برادر زادگاں خان مرحوم فضیلت پناہ حکیم واصل خان و رشادت دستگاہ حکیم اجمل خاں کہ در عین شباب و ریعانِ جوانی بہ زیور فضل و ہنر آراستہ و حلیہ صلاح و رُشد پیراستہ بودہ اند در ظل اعانت مہین برادر خویش فخر اماجد و اماثل و مرجع اکابر و افاضل سباق غایات علم و عمل زبدۃ الحکماء حکیم عبدالمجید خاں بعزم آنکہ مساعی جمیلۂ عم بزرگوار را در چشم ابنائے زمان بروز دہند و تشنہ لبان وادی طلب را بدیں چشمہ زندگانی رہبری کنند از جاے برخاستند و نسخہ مصححہ از کتاب خانہ نخبۃ الحکماء و صفوۃ الاطبا متخلق با اخلاق کریمہ حکیم غلام رضا خاں خلف الصدق جناب خان مبرور بدست آوردہ، بعد از دستوری و اجازت ایشاں کارپردازان مطبع را بہ طبع ایں عجالۂ نافعہ

براشتند وتصحیح و مقابلہ کاپی و پروف و دیگر مراتب تہذیب درتی کتاب بر ذمّتِ ہمت خود ہا واجب دانستہ دقیقہ از حقائق جدوجہد فرو نہ گزاشتند ۔

للہ الحمد کہ کوشش و اجتہاد ایشاں بفور ونجاح انجامید و آن نسخۂ نادرۃ الوجود بوجہِ خوب وصورتِ دلخواہ در قالب طبع ریختہ شد و حلق نفیسی کہ بجانش خریدار بود کارش بجاے رسید کہ بدرہم و دینار متیوان خرید و الحمد اللہ علی ذلک اولاً و آخراً و ظاہراً و باطناً و صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و آلہ واصحبہ اجمعین ۔فقط

تحریر نمبر ۴

مولانا حالی نے علم جیولوجی پر ایک رسالہ جیولوجی کے نام سے لکھا تھا یہ مولانا کی ابتدائی تصانیف میں سے تھا ۔ یہ ایک فرانسیسی کتاب کا عربی ترجمہ تھا جسے مولانا حالی نے اردو میں منتقل کیا۔ اصل رسالہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرہ کیفی میں موجود ہے ۔اس پر حالی کی تصنیف سن بھی درج ہے اور عربی مصنف کا کے بارے میں بھی معلومات ملتی ہیں ۔عکس یہ ہے:

FinalThesis 2012\Pict\Ask.tif not found.

حوالہ جات

۱۔ حالی الطاف حسین، مکتوب بنام ایڈیٹر سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ، محررہ ۱۶، اگست ۱۸۷۲ء

۲۔ حالی، الطاف حسین، مکتوب بنام مولوی عبدالرحیم، محررہ ۲۲ جون ۱۸۸۶ء، مطبوعہ نقوش، مکاتیب نمبر، جلد اول، ص ۱۳۸

۳۔ حالی الطاف حسین، مکتوب بنام (نامعلوم) محررہ ۱۸ ستمبر ۱۸۸۷ء، مطبوعہ چار موسم ایچی سن کالج میں ڈاکٹر زاہد منیر عامر ملک اینڈ کمپنی رحمان مارکیٹ اردو بازار لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۵۱، ۵۲

۴۔ حالی الطاف حسین، مکتوب بنام محمد علی مہمان، محررہ ۳۱ مارچ ۱۸۸۸ء، مطبوعہ ریاست میسور میں اردو، جلد اول، مرتب ڈاکٹر آمنہ خاتون، برقِ کوثر پریس بنگلور، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۲۸۸، ۲۸۹

۵۔ حالی الطاف حسین، مکتوب بنام (نامعلوم) محررہ ۱۴ اگست ۱۸۹۰ء، دیوانِ حالی، اندرونی ورق، ٹائٹل پیج، نامی پریس کانپور، ۱۸۹۳ء

۶۔ حالی الطاف حسین، مکتوب بنام وقار الملک مولوی مشتاق حسین، محررہ ۱۵ اگست ۱۸۹۴ء، مطبوعہ نقوش، مکاتیب نمبر، جلد اول، ص ۴۱، ۴۲

۷۔ حالی، الطاف حسین، مکتوب بنام مولوی بشر الدین، محررہ ۶ اپریل ۱۹۰۱ء، مطبوعہ نقوش، مکاتیب نمبر، جلد اول، ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۱۴۳

۸۔ حالی، الطاف حسین، مکتوب بنام سید حسن علی محررہ ۱۸۔ اکتوبر ۱۹۱۰ء، ایضاً، ص ۱۴۸

۹۔ حالی الطاف حسین، نقلِ رسید، بنام سررشتہ تعلیم محررہ ۱۴ نومبر ۱۹۰۱ء، مطبوعہ نقوش، مکاتیب نمبر، ص ۱۴۵

۱۰۔ حالی الطاف حسین، مکتوب بنام مولوی بشیر الدین، محررہ ۱۸ اگست ۱۹۰۲ء، مطبوعہ نقوش، مکاتیب نمبر، جلد اول، ص ۱۴۶

۱۱۔ حالی، الطاف حسین، خط بنام انجمنِ پنجاب مشمولہ صحیفہ، پچاسواں شمارہ مجلس ترقی ادب لاہور، ص ۶۷

۱۲۔ حالی الطاف حسین، مکتوب بنام منشی نجم الدین، محررہ ۱۸ نومبر ۱۹۰۴ء، بحوالہ مقالہ حالی کی مکتوب نگاری (غیر

مطبوعہ)،مسرت طاہرہ مخذونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور،۱۹۷۲ء

۱۳۔ حالی، الطاف حسین، مکتوب بنام مولوی قمر علی محررہ ۱۹۔فروری ۱۹۰۹ء، ایضاً،ص ۱۴۸

۱۴۔ حالی الطاف حسین، مکتوب بنام وحشت کلکتوی (عکس تحریر) مطبوعہ نقوش، مکاتیب نمبر، جلد اول،ص ۱۳۵، ۱۳۶

۱۵۔ حالی، الطاف حسین، مکتوب بنام مولوی سید احمد دہلوی، محررہ ۲۷ فروری ۱۹۱۲ء، مطبوعہ فرہنگ آصفیہ، جلد اول، گلزارِ محمدی سٹیم پریس لاہور، دفتر فرہنگ آصفیہ دہلی واقع گلی شاہ تارا سے شائع ہوئی، ۱۹۱۸ء، ص م

۱۶۔ حالی، الطاف حسین، (غیر مطبوعہ خط)، بنام سید افتخار عالم مارہروی، محررہ ۷ استمبر ۱۹۱۲ء، مخذونہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لائبریری لاہور، گوشہ مکتوبات عطیہ جناب عبدالوحید چیف لائبریرین

۱۷۔ حالی، الطاف حسین، مکتوب بنام سید افتخار عالم مارہروی، محررہ یکم اکتوبر ۱۹۱۲ء، مطبوعہ نقوش، مکاتیب نمبر، جلد اول، ص ۱۴۸

۱۸۔ حالی، الطاف حسین، مکتوب بنام نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی، محررہ ۱۱۴ کتوبر ۱۹۱۲ء، مطبوعہ فرہنگ آصفیہ جلد اول، ص ن

۱۹۔ حالی الطاف حسین، مکتوبات حالی، حصہ دوم، مرتب خواجہ سجاد حسین حالی، پریس پانی پت، ۱۹۲۵ء، ص ۱۰۱

۲۰۔ احمد الدین مارہروی، مولوی بشیر الدین مشمولہ نقوش، شخصیات نمبر، ادارہ فروغ اردو لاہور، جنوری ۱۹۵۵ء، ص ۵۹، ۶۰

۲۱۔ ایضاً، ص ۵۹، ۶۰

۲۲۔ محمد برکت علی خاں، خان بہادر، مکتوب بنام مولانا الطاف حسین حالی محررہ ۳ جون ۱۹۰۴ء، مطبوعہ صحیفہ پچاسواں شمارہ، مجلس ترقی ادب لاہور، ص ۶۶، ۶۷

۲۳۔ وفا راشدی، ڈاکٹر، حیاتِ وحشت، مکتبہ کارواں لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۳۰

۲۴۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد اول، ص ل۔م

۲۵۔ حالی، الطاف حسین، کلیات نثر حالی، جلد دوم، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۳۲۱

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۲۳

غیر مدوں تحریریں

مولانا حالی کی غیر مدون تحریریں جن میں دو اردو اور ایک فارسی تحریر ہے۔ صحیفہ حالی نمبر شمارہ ۵۸ جنوری ۱۹۷۲ء سے لی گئی ہیں۔ یہ تحریریں پروفیسر محمد افضل قرشی کے مضمون "حالی کی غیر مدون تحریریں" میں شامل ہیں۔ جبکہ چوتھی تحریر صحیفہ پچاسواں شمارہ سے لی گئی ہیں۔ حوالہ درج ذیل ہے:

۱۔ حالی، الطاف حسین، غیر مدون تحریریں، بحوالہ افضل حق قریشی، مطبوعہ صحیفہ حالی نمبر، شمارہ ۵۸، مجلس ترقی ادب لاہور، ۲، ۱۹۷۲ء، ص ۲۲۔۳۰

۲۔ حالی، الطاف حسین، غیر مدون تحریر، حالی اور شبلی کی غیر مدون تحریر بحوالہ ملک احمد نواز مشمولہ صحیفہ پچاسواں شمارہ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۶۵

باب ہشتم

مجموعی جائزہ

مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) اردوادب کی وہ شخصیت ہیں جنھوں نے اردو کے نثری وشعری ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ وہ اردو کے پہلے نقاد ہیں جو عالمی سطح پر روشناس ہوئے۔ پہلے سوانح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر اور ادبی مکتوب نگار کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ اردو تحقیق میں بھی ان کا حوالہ بڑا اہم ہے حالی کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں اردوادب میں تحقیق کی بہترین روایت ہیں۔ حیات سعدی ۱۸۹۰ء یادگار غالب ۱۸۹۶ء حیات جاوید ۱۹۰۱ء اور تنقید میں مقدمہ شعروشاعری اس سلسلہ کی یادگار کتابیں ہیں۔

مولانا حالی کو بحیثیت نقاد، سوانح نگار اور شاعر اردوادب میں جو مقام حاصل ہے اس سے سب واقف ہیں۔لیکن بحیثیت مکتوب نگار نا آشنا ہیں۔ زیرنظر مقالے میں مکتوب نگار کی حیثیت سے تاریخ ادب میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان خطوط کے ذریعے سوانح حالی بزبان حالی اور اس سوانح کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔مولانا حالی نے اپنے خودنوشت حالات نواب عمادالملک بہادر کی فرمائش پر لکھے تھے۔ نواب صاحب کے ایک دوست جو لندن میں رہتے تھے نے بذریعہ خط ان سے فرمائش کی تھی کہ مولانا حالی کے سوانحی حالات فراہم کیے جائیں۔ چنانچہ نواب عمادالملک نے حالی کے دوست مولوی عبدالحق کی وساطت سے حالی سے گزارش کی کہ وہ اپنے سوانحی حالات لکھ کر ارسال کریں۔ اس سلسلے میں حالی کا وہ خط نہایت اہم ہے جو انھوں نے ۷ مئی ۱۹۰۱ء کو مولوی عبدالحق کو لکھا جو مکتوبات حالی حصہ اول صفحہ ۱۴۱ میں درج ہے جس سے یہ تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہ سوانحی حالات حالی نے خود لکھے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''نواب عماد الملک بہادر کی فرمائش جو بہت دن سے ہو رہی تھی میں نے اس کی تعمیل کر دی ہے اور اپنا مختصر حال اور جو امور انھوں نے استفسار فرمائے تھے بقدر ضرورت لکھ کر آج چار روز ہوئے ان کی خدمت میں بھیج چکا ہوں اگر آپ سے کبھی ملاقات ہو تو اس کا ذکر کر دیجیے گا اور یہ بھی پوچھیے گا کہ جو امور آپ دریافت فرمانا چاہتے تھے وہ سب اس تحریر میں بیان ہو گئے ہیں یا نہیں۔''

یہ تحریر ان کے دیوان کے ذاتی نسخہ پر لکھ دی گئی۔ازاں بعد جب ان کے مقالات انجمن ترقی اردو سے شائع ہوئے تو اس کو تحریر کو ان مقالات میں شامل کر دیا گیا۔ان خطوط کے ذریعے سے ان کے معاصرین کے سوانحی حالات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کے علمی وادبی کارناموں کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔

مولانا حالی کے عہد کے ادبی منظر نامے کی عکاسی اس مقالے میں موجود ہے۔اور ان مکاتیب کی وساطت سے ان کی اصل حثیت کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ان کے وہ نظریات جو مقالات حالی میں مبہم ہیں واضح ہو گئے ہیں۔حالی کے اردو مقالات اور دیگر تصانیف میں ان کی شخصیت اور سوانح اس طرح سامنے نہیں آئے جس طرح مکتوبات میں آتے ہیں۔ان کے ذریعے ان کی زندگی کے سربستہ راز وا ہو جاتے ہیں۔اور یہ خطوط ان کی زندگی میں جھانکنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔یہ معلومات کا بہترین خزانہ ہیں۔جن میں حالی ایک نئے انداز سے سامنے آتے ہیں۔حالی کے یہ مکاتیب ان کے افکار ونظریات اور گردوپیش کے حالات کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتے ہیں اور بہترین تحقیقی ماخذ ہیں۔

مقالے کے آغاز میں خطوط کی اہمیت،انفرادیت اور مشاہیر ادب کی رائے میں ان کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ''عہد حالی تک مکتوب نگاری'' کو موضوع بنایا گیا ہے۔اردو کے اہم مکتوب نگاروں جن میں مرزا

غالب، سرسید محمد حسین آزاد، نذیر احمد، شبلی، امیر مینائی، محمد علی اودلوی وغیرہ شامل ہیں کے خطوط کی خصوصیت اور ان کی علمی و ادبی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ مرزا غالب سے پہلے فارسی کا رنگ اور پرتو اردو مکتوب نگاری میں نظر آتا ہے کو بھی مقالے میں پیش کیا گیا ہے۔ نیز مرزا غالب نے جس طرح خطوں میں نئے اسلوب پیدا کیے اور اپنی ذات کو بے تکلفی کے ساتھ پیش کرنے کے علاوہ مراسلہ کو مکالمہ کا سا انداز عطا کیا کو بھی احاطہ تحریر میں لایا گیا ہے۔ سرسید کے خطوط میں ان کی عام تحریروں کی طرح جو مقصدیت اور مدعا نگاری نظر آتی ہے کو بیان کیا گیا ہے۔

شبلی کے خطوط کی علمیت اور نذیز احمد کے مکاتیب کا ناصحانہ انداز جو موعظہ حسنہ میں نظر آتا ہے کو بھی مقالہ میں جگہ دی گئی ہے۔

حالی کی مکتوب نگاری جو اس مقالہ کا موضوع ہے پر تفصیلی اظہار خیال کے علاوہ ان کے مجموعہ ہائے مکتوبات کی تفصیل وضاحت ان کی اہمیت قدر و قیمت اور خصوصیت اہل علم و ادب کے اظہار کے ساتھ کہ وہ کس طرح عام آدمی کے ذوق کی چیز بن جاتے ہیں مقالے میں موجود ہے۔ خطوط غالب اور حالی کے خطوط کا موازنہ جو محترمہ صالح عابد حسین نے کیا ہے کے علاوہ دونوں کے خطوط کا مجموعی تاثر اختصار کے ساتھ درج ہے۔ مرزا کے خطوط میں جو شکوہ ہائے روزگار، زمانے کی ناقدری، بڑھاپے کا رونا، بادشاہوں کے دربار تک رسائی، بے تکلفی وغیرہ ہے۔ اس کو اور مولانا حالی کے خطوط میں جو سادگی، قناعت پسندی، روانی و سلاست اور درد دل ہے کو بیان کرنے کے علاوہ مختلف حوالوں سے بحث کی گئی ہے۔ ان مکتوبات کی جمع آوری مطالعہ حالی کے لیے اہم اور نئے در کھولنے کا سبب بنے گی۔

زیر نظر مقالے میں حالی کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جو ان کو ہم عصر ادباء اور شعراء سے نمایاں کرتے ہیں۔ وہ نقاد، ادیب اور شاعر ہونے کے باوجود اپنی علمی ادبی اور سماجی زندگی جذباتی نہیں تھے بلکہ حقیقت پسندانہ طرز فکر کے حامل سنجیدہ اور بہترین انسانی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے احوال و آثار، اساتذہ، اولاد کے تذکروں کے علاوہ ان کے معمولات زندگی تعلم شاعری نواب محمد مصطفےٰ

خان شیفتہ کے ہاں قیام اور ان کے بچوں کی اتالیقی کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ بیان حالی کے مطابق ان کی ولادت وطن تعلیم وتربیت دہلی کے قیام کا زمانہ غالب کی شاگردی پھر مولانا حالی کا لاہور آنا پنجاب بک ڈپو میں ملازمت لاہور میں محمد حسین آزاد کے ساتھ مل کر نئی طرز کے مشاعروں کی بنیاد جس میں طرح مصرع کی بجائے نظم کا عنوان دیا جاتا تھا اور مولانا کی اس زمانے کی نظم نگاری اور نیچرل شاعری پر اظہار خیال بھی اس مقالے میں کیا گیا ہے۔

ان خطوط سے حالی کا اینگلو عربک سکول دہلی میں ملازمت کی پیشکش اور لاہور سے دہلی روانگی کی تفصیلات کے علاوہ ان کے وہ اشعار جو انہوں نے قیام لاہور کے دوران اکتاہٹ کے عالم میں لکھے تھے کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

حالی کی سادگی اور انسان دوستی جو ان کی ذات کا خاصہ تھی کو ان کی ہم عصر شخصیات اور اہل علم و ادب کی رائے کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ جس سے ان کی ذات کا مجموعی تاثر سامنے آتا ہے۔ علاوہ ازیں ان مکتوبات کے ذریعے جو ان کی شخصیت ابھرتی ہے کو سامنے لانے کی کاوش کی گئی ہے۔ جس سے ان کی مکمل سوانح مرتب کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

تصانیف حالی کی تفصیلات جن میں رسائل، مذہبی اور اخلاقی نوعیت کی کتابیں اور تراجم شامل ہیں کی فہرست پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تنقید، شاعری، نظم ونثر، سوانح نگاری اور مکتوب نگاری کے حوالے سے ان مطبوعات کے زمانۂ اشاعت اور مقام اشاعت کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ مولانا حالی مذہبی خیالات وافکار کے حامل شخص تھے۔ جن کی عکاسی ان کی ابتدائی تصانیف مذہبی رسائل و کتب سے بھی ہوتی ہے۔ اور شخصی کوائف سے بھی۔ ان کے بارے میں اس مقالے میں تفصیل دی گئی ہے۔ مولانا کو فارسی، عربی زبان پر بھی دسترس حاصل تھی۔ جس کا اندازہ ان کی تحریروں سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً وہ خطوط جو انھوں نے حضرت شاہ عبدالغنی قدس سرہ کی خدمت میں عربی قصیدہ کے ساتھ مدینہ منورہ بھیجے یہ ان کی

عربی دانی کی واضح دلیل ہیں۔ مکاتیب حالی میں سات عربی اور آٹھ فارسی خطوط ہیں جو علمی و ادبی نوعیت کے ہیں۔ اس کے علاوہ کلیاتِ نظم حالی میں ان کا فارسی کلام بھی قابلِ توجہ ہے۔

ان کی تصانیف میں وہ رسالہ بھی شامل ہے جو مبادی علم جیولوجی کے نام سے ہے۔ جو فرانسیسی سے عربی میں ترجمہ ہوا تھا اور جس کو مولانا حالی نے اردو زبان میں ترجمہ کیا یہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ جس کا سن اشاعت (۱۸۸۲ء) ہے۔

حالی کے بارے عموماً کہا جاتا ہے کہ وہ منطق سے خالی ہیں۔ ان کے خطوط کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ شاعر اور نثر نگار کے علاوہ ایک دانشور کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ جو تقریبات، مٹنگیز میں شرکت کے علاوہ وہ مختلف شعرا ادبا علمی اور صحافتی شخصیات کی راہنمائی کے علاوہ ان کو مشورہ اور رائے دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ علی گڑھ کالج کے ٹرسیٹاں میں بھی شامل رہے ہیں۔ وہ آل انڈیا تعلیمی کانفرنس منعقدہ کراچی ۱۹۰۷ء میں کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ حالی علی گڑھ کالج کے اس وفد میں بھی شامل تھے جو سرسید کے ہمراہ نظام حیدر آباد سے ملاقات کے لیے گیا۔ علی گڑھ کالج کے قیام کے وقت جب یہ بحث چل رہی تھی کہ یہ کالج کس شہر میں قائم کیا جائے۔ تو اس وقت مولانا حالی نے رائے دی کہ جغرافیائی اور موسمی اعتبار سے علی گڑھ اس کالج کے قیام کے لیے موزوں ترین جگہ ہے۔ خواجہ ضیا الدین دہلوی اور سبحان بخش شکار پوری بھی ان کی رائے کے ساتھ متفق تھے۔ حالی کی نثر ان کے دیگر ہم عصروں سے کئی اعتبار سے مختلف ہے۔ حالی کی نثر کا سرسید شبلی نذیر احمد کی نثر کے ساتھ موازنہ کرنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ حالی ہی وہ ادیب ہیں جن کا نثری اسلوب اگلی نسل کے لیے نمونہ قرار پایا۔ اس لیے کہ جو آسانی اور روانی اس میں تھی وہ سرسید، شبلی، آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد میں نسبتاً کم تھی۔

حالی اپنی شخصیت کے اعتبار سے منکسر المزاج تھے۔ ان کے مکاتیب میں یہ انکسار ایک خاص لطف دیتا ہے۔ مکاتیب میں وہ ایک باوقار اور متین شخص کے طور پر متعارف ہوتے ہیں۔

حالی اردو نیچرل شاعری کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے روایتی اور غیر آفادی شاعری کے برعکس اردو میں نیچرل اور قومی شاعری کی طرف توجہ دی اور نظم نگاری کو فروغ دیا۔ وہ قدیم طرزِ سخن کے حصار سے نکل کر جدید شاعری کی طرف گامزن ہوئے اور مبالغہ سے پاک سیدھی سادی زبان کو فروغ دیا۔ زیرِ نظر مقالے میں حالی کے شعری نظریات وافکار کو ان کے خطوط کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اور مکاتیب سے مثالیں دی گئیں ہیں۔ حالی نے معاشرتی اصلاح اور ترقی کے لیے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا۔ وہ تقلید کے قائل نہ تھے۔ وہ ادب میں اپنی الگ پہچان اور فکر رکھتے تھے۔ مقدمہ میں انہوں نے شعر کی ماہیت اور نیچرل شاعری پر اظہارِ خیال کے علاوہ یہ بتایا کہ وہ کون سی خوبیاں ہیں جو ایک شاعر کو عام آدمی سے ممتاز کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے مغربی ادب سے کئی مثالیں دیں ہیں جن سے ان کے گہرے مشاہدے اور مطالعہ کی عکاسی ہوتی ہے۔ ان کو اصلاحی اور قومی شاعری کے تناظر میں بھی دیکھا گیا ہے۔

اس مقالہ میں خاندانِ حالی کی تفصیل کے علاوہ ان کا ''شجرہ نسب'' بھی موجود ہے جو خاندان حالی کے ایک اہم رکن خواجہ شاہد حسین (جو سرگودھا میں مقیم ہیں) کی وساطت سے مرتب کیا گیا۔ اس کے علاوہ خاندان حالی کی پاکستان میں نشاندہی کی گئی ہے۔ جو اب لاہور، اسلام آباد، سرگودھا، ساہیوال اور کراچی میں مقیم ہے اس کی تفصیل شجرہ مذکورہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا حالی کی پڑپوتی مسماۃ صفری خاتون (مقیم اسلام آباد) کے ساتھ راقم کی ملاقات خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس سے انٹرویو ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

مقالے کا سب سے اہم باب حالی کے غیر مدون/غیر مطبوعہ خطوط اور تحریریں ہیں۔ اس مقالہ میں ۱۹ غیر مدون جن میں دو غیر مطبوعہ خطوط بھی ہیں شامل ہیں۔ چار غیر مدون تحریریں مقالہ کا حصہ بنا کر مطالعہ حالی میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ اہم مکاتیب آئندہ کے محقق کے لیے نئے امکانات پیدا کرنے کا سبب بنیں گے۔ ان خطوط سے مکاتیب حالی کی عددی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا ہے۔ جن

شخصیات کے نام یہ خطوط لکھے گئے ہیں ان میں رضاعلی وحشت کلکتوی، سید افتخار عالم ماہروی مولف ''حیات النذیر'' مولوی سید احمد دہلوی مولف ''فرہنگ آصفیہ'' حبیب الرحمٰن خان شروانی، وقار الملک مولوی مشتاق حسین، نواب عماد الملک، سید حسین بلگرامی، مولوی قمر علی اور منشی نجم الدین ہیں۔ ایک خط انجمن پنجاب کے نام ہے۔

غیر مدون تحریروں میں پہلی ان کا وہ مضمون بھی ہے جو انہوں نے مدرسہ طبیہ دہلی کے سالانہ اجلاس ۱۹۰۳ء میں پڑھا تھا۔ یہ طویل مضمون ہے جو فن طبابت اور اس کی اہمیت پر مولانا نے لکھا۔ اس میں طب مشرق کی افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مغربی اور مشرقی طب کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔

دوسری تحریر بیگم اختر بانو سہروردیہ والدہ حسین شہید سہروردی کی کتاب ''میلاد النبی سوم بہ کوکب دری'' پر تقریظ ہے۔ یہ کتاب میلاد النبیؐ کی اہمیت پر لکھی ہے۔ بیگم صاحبہ کے اس کام کو مولانا نے سہراہا ہے۔

تیسری تحریر مولانا کی اس تقریظ پر مشتمل ہے۔ جو حکیم محمد شریف کی کتاب ''علاج الامراض'' پر مولانا حالی نے لکھی تھی حکیم محمد شریف حکیموں کے مشہور خاندان ''خاندان شریفی'' کے نامور حکیم تھے جو فن طبابت کے حوالے سے برصغیر میں نامور سمجھا جاتا تھا۔ یہ فارسی زبان میں ہے۔ اور اس میں فن طبابت کی اہمیت بیان کی ہے۔

۱۸۸۲ء میں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، حالی نے مبادی علم جیولوی کے نام سے ایک عربی رسالے کا اردو ترجمہ کیا یہ پہلے رسالہ فرانسیسی سے عربی میں منتقل کیا گیا تھا۔ حالی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا یہ مولانا حالی کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے۔

جن اہم معاصرین حالی کے سوانحی حالات، ان کی اہم تصانیف اور علمی وادبی کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں منشی رحمت اللہ رعد، مالک نامی پریس کانپور، محمد عبدالرزاق کانپوری مولف البرامکہ، مولوی وحید الدین سلیم، امیر مینائی، داغ دہلوی، سرسید احمد خان، مرزا غالب، مولوی بشیر الدین، مولوی محمد عزیز

مرزا، منشی محبوب عالم، عبدالحلیم شرر، مولانا ظفر علی خان، مولوی سید امتیاز علی، مولوی ذکا اللہ، سید سلمان ندی، سید احمد دہلوی، حبیب الرحمٰن شروانی، آغا شاعر دہلوی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور وحشت کلکتوی شامل ہیں۔ ان اشخاص کی علمی وادبی حیثیت پر اظہار خیال کے علاوہ ان کے کارناموں کی تفصیل بھی درج کی گئی ہے۔ آخر میں مقالے میں مذکور شخصیات، کتب اور مقامات کا اشاریہ ہے۔

نتائج تحقیق

میری رائے میں حالی کے مکاتیب کو اس زاویہ سے دیکھا جائے کہ ان میں حالی کا عہد نمایاں ہو۔ ان خطوط میں بہت سے نکات پوشیدہ ہیں۔ جن میں سے ہر موضوع پر کام ہونا چاہیے۔ اس طرح یہ مکتوبات نئے امکانات پیدا کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔

سفارشات

۱۔ حالی کے مکاتیب کو جدید عہد کی تحقیقی ضرورتوں کے مطابق نئے سرے سے پرکھنا چاہیے۔

۲۔ میں نے حالی کی شخصیت ان کے مکتوبات کے حوالے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس سلسلہ میں ایک جداگانہ مقالہ تفویض کیا جانا چاہیے اس کا عنوان حالی مکتوبات کی روشنی میں بھی ہوسکتا۔

۳۔ حالی کے تمام سوانح نگاروں اور نقادوں پر محققین کی آرا پر مشتمل ایک جامع کام کی ضرورت ہے۔

۴۔ حالی کے حیات جاوید اور دیگر سوانح عمریوں میں جو تحقیقی اور تنقیدی معیار اپنایا ہے اس کی روشنی میں حالی کی سوانح عمری مرتب کی جانی چاہیے۔

۵۔ تصانیف حالؔی کی اولین اشاعتوں پر ایک سیر حاصل کام سامنے آنا چاہیے۔ میرے مقالے کا موضوع اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔

۶۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں حالؔی کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر سیمینار منعقد کرنے چاہیں اور ان میں حالی کو جدید نسل سے متعارف کرانے کی کوشش کی جائے۔

کتابیات

الف) بنیادی مآخذ

☆ اسماعیل پانی پتی، شیخ، تذکرہ حالی، حالی بکڈپو پانی پت، ۱۹۲۵ء

☆ اصول فارسی، فارسی قواعد پر محکمہ تعلیم پنجاب کے لیے۱۸۷۲ء میں لکھی

☆ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۵۳ء

☆ الطاف حسین، مولوی، مبادی علم جیولوجی، انجمن پنجاب نظام الدین پرنٹرز پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۸۸۳ء

☆ تذکرہ رحمانیہ، اس کتاب میں حالیؔ نے اپنے استاد عبدالرحمٰن کے سوانحی حالات لکھے

☆ تریاق مسموم پادری عمادالدین کی کتاب تحقیق الایمان کے جواب میں ۱۸۶۸ء میں لکھی

☆ جواہر حالی (مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی)، لاہور کاروانِ ادب، ۱۹۸۹ء

☆ جواہرات حالی (مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی)، حالی بک ڈپو پانی پت، ۱۹۳۵ء

☆ حالی الطاف حسین، یادگارِ غالب، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۸ء

☆ حالی، الطاف حسین، تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے، یہ بھی پادری عمادالدین کی کتاب تاریخ محمدی کے جواب میں لکھی

☆ حالی، الطاف حسین، دیوان حالی، خزینہ علم و ادب اردو بازار لاہور، ۲۰۰۱ء

☆ حالی، الطاف حسین، مثنویات حالی، مرتبہ مرتضیٰ حسین فاصل شیخ مبارک علی، تاجر کتب لاہور، ۱۹۶۶ء

☆ حالی، الطاف حسین، مسدس حالی، تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور کراچی، سن ندارد

☆ حیات جاوید، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۰۱ء

☆ حیات سعدی، لاہور مجتبائی پریس طبع ثالث، ۱۸۸۸ء

☆ دیوان حالی (معہ مقدمہ شعر و شاعری) نامی پریس کانپور پریس، ۱۸۹۳ء

☆ سوانح حکیم ناصر خسرو، مکتبہ خیر خواہ ہند دہلی سے ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی

☆ شواہد الہام، رسالہ ۱۸۸۵ء

☆ عربی رسالہ، یہ رسالہ ۱۸۵۶ء میں لکھا گیا (غالباً)

☆ کلیات نثر حالی، جلد اول، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۸ء

☆ کلیات نثر حالی، جلد دوم، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۸ء

☆ کلیات نظم حالی (مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی)، جلد دوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۰ء

☆ کلیات نظم حالی، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، جلد اول و دوم، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء

☆ کلیات نظم حالی، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۸ء

☆ مبادی علم جیالوجی، انجمن پنجاب، نظام الدین پرنٹرز لاہور، ۱۸۸۳ء

☆ مجالس النساء (دو حصے)، ڈائریکٹر تعلیمات پنجاب، کرنل ہالرائیڈ کی سفارش پر ۱۸۷۴ء میں لکھی گئی

☆ مقالات حالی (حصہ اول و دوم)، انجمن ترقی اردو ہند پاکستان، ۱۹۳۴ء

☆ مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، اردو مرکز گنپت روڈ لاہور، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۰ء

☆ مکتوبات حالی (حصہ اول و دوم) مرتبہ خواجہ سجاد حسین، پانی پت حالی پریس، ۱۹۲۵ء

☆ مکتوبات حالی، جلد دوم، مرتبہ خواجہ سجاد حسین، حالی پریس پانی پت، ۱۹۲۵ء

☆ مولود شریف، حالی پریس پانی پت، ۱۹۳۲ء

☆ وارث علوی، حالی مقدمہ اور ہم، سٹی بک سٹال صدر بازار کراچی، ۲۰۰۰ء

☆ یادگار غالب، علی گڑھ مطبع یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ، ۱۸۹۷ء

☆ یادگارِ غالب، الطاف حسین حالی، شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور

☆ یادگارِ غالب، مرتبہ، الطاف حسین حالی، کشمیر کتاب گھر اردو بازار لاہور،

ب) ثانوی مآخذ

☆ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، تذکرہ حالی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۳۸ء

☆ احسن فاروقی، ڈاکٹر، مقدمہ شعر و شاعری تنقید و تبصرہ، لاہور پاپولر پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۸۴ء

☆ اختر انصاری دہلوی، حالی اور نیا تنقیدی شعور، کراچی اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۲ء

☆ الطاف حسین حالی (تحقیقی و تنقیدی جائزے)، مرتب پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ۲۰۰۱ء

☆ جذبی معین احسن، حالی کا سیاسی شعور، لکھنؤ، ۱۹۵۹ء

☆ حمید احمد خان، پروفیسر، ارمغانِ حالی، لاہور ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۱ء

☆ خطوط مشاہیر (مولانا محمد علی، مولانا اکبر، مولانا شبلی) مرتبہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی، تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور، نومبر ۱۹۴۴ء

☆ خلیل احمد دادی، مقدمہ یادگارِ غالب، مجلس ترقی ادب لاہور

☆ ذاکر حسین، ڈاکٹر، حالی محب وطن، جمال پریس دہلی، ۱۹۴۳ء

☆ سعید انصاری، موجِ حالی، شعبہ اردو انسائیکلوپیڈیا پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۵۶ء

☆ شجاعت علی سندیلوی، ڈاکٹر، حالی بحیثیت شاعر، سرفراز پریس لکھنؤ، ۱۹۶۰ء

☆ صادق قریشی، ذکرِ حالی، اردو مرکز گنپت روڈ لاہور، ۱۹۴۹ء

☆ صالح عابد حسین، یادگارِ حالی، ارسلان بکس علامہ اقبال روڈ میر پور آزاد کشمیر، سن ندارد

☆ صالح عابد حسین، یادگارِ حالی، انجمن ترقی اردو علی گڑھ، ۱۹۵۰ء

☆ ظفر حسین، ڈاکٹر، سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت، لاہور ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۰ء

☆ عبدالحق، ڈاکٹر، مولوی، افکارِ حالی، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۶ء

☆ عبدالقیوم، ڈاکٹر، حالی کی اردو نثر نگاری، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۴ء

☆ علوی، تنور الدین، مقدمہ شعر وشاعری تبصرہ، علی گڑھ مسلم ایجوکیشن پریس، س ن

☆ غلام مصطفےٰ خاں، ڈاکٹر، حالی کا ذہنی ارتقا، لاہور مکتبہ کارواں، ۱۹۶۶ء

☆ کشمیری لال ذاکر، مرتب، حالی اور سر زمین حالی، ہریانہ، اردو اکیڈمی ۱۹۹۲ء

☆ محمد امین زبیری، تذکرہ شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی، آگرہ شمس مشن پریس، ۱۹۲۵ء

☆ مقالاتِ یوم حالی، مرتبہ ناصح زاہدی، انجمن احیائے ادب پاکستان لاہور، ۱۹۵۰ء

☆ ممتاز حسین، پروفیسر، حالی کے شعری نظریات (ایک تنقیدی مطالعہ)، سعد پبلی کیشنز ناظم آباد کراچی، ۱۹۸۸ء

☆ ناظرہ کاکوروی، حالی کا نظریہ شعری، الہ آباد ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۶ء

☆ ناظرہ کاکوروی، مطالعہ حالی لکھنؤ ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۶ء

☆ وحید قریشی، ڈاکٹر، مطالعہ حالی، اردو بک سٹال لاہوری دروازہ لاہور، ۱۹۶۱ء

☆ وحید قریشی، ڈاکٹر، مقدمہ شعر وشاعری، مرید مکتبہ لاہور، ۱۹۵۳ء

ج) عمومی مآخذ

☆ ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی سماجی پس منظر، کراچی، س ن

☆ ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر، مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت، نئی دہلی، س ن

☆ اثر امداد امام، کاشف الحقائق (جلد اول و دوم)، لاہور مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۶ء

☆ احتشام حسین، سید، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، نئی دہلی ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۸ء

☆ احتشام حسین، سید، تنقیدی جائزے، حیدر آباد دکن، ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۴۴ء

☆ احسن فاروقی، ڈاکٹر، اردو میں تنقید، لکھنؤ ادارہ فروغ اردو، س ن

☆ احمد شمیم، ہوا نامہ میرے (خطوط)، عکس پبلشرز مکان نمبر ۳۵۔ آئی ۹، اسلام آباد، ۱۹۵۵ء

☆ ارم حسین، اردو میں مقدمہ نگاری کی روایت، لاہور، سنگ میل، ۱۹۸۸ء

☆ اسلوب احمد انصاری، ادب اور تنقید، الہ آباد سنگم پبلشرز، ۱۹۶۸ء

☆ اصغر علی شاہ، مرتب، شعور تنقید، لاہور، سنگ میل، ۱۹۶۸ء

☆ اعجاز حسین، ڈاکٹر، سید، مختصر تاریخ ادب اردو، کراچی، باب الاسلام پریس، ۱۹۸۶ء

☆ افتخار احمد صدیقی، پروفیسر، مقدمہ، موعظہ حسنہ شمس العلماء، ڈپٹی نذیر احمد مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء

☆ افتخار عالم مارہروی، مولوی، حیات النذیر، شمسی پریس دہلی، ۱۹۱۲ء

☆ الطاف فاطمہ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا، دہلی، ۱۹۷۴ء

☆ امیر مینائی، خطوطِ میر مینائی، مرتبہ احسن اللہ خان ثاقب باہتمام دائرہ ادبیہ لکھنؤ، ۱۹۲۲ء

☆ امیر مینائی، مکاتیب امیر مینائی، مرتبہ مولوی احسن اللہ خان صاحب ثاقب، نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۲۴ء

☆ انتخاب افادات مہدی (تذکرہ وتنقید)، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۶۰ء

☆ انور سعید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۵ء

☆ اینڈریوز، سی۔ ایف۔ تذکرہ مولوی ذکااللہ دہلوی، کراچی، ۲ مئی ۱۹۵۲ء

☆ اے۔ ایچ۔ کوثر، ڈاکٹر، اردو کی علمی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقاء کا حصہ، لائبریری پرموش بیورو کراچی، ۱۹۸۴ء

☆ آزاد محمد حسین، مکتوبات آزاد، مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد، کریمی پریس لاہور، سن ندارد

☆ آزاد، ابوالکلام، خطوطِ ابوالکلام آزاد، جلد اول، مرتب مالک رام، الفیصل ناشران و تاجر کتب اردو بازار لاہور، جون ۱۹۹۹ء

☆ آزاد، محمد حسین، مکاتیب آزاد، مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء

☆ آغا شاعر دہلوی، حیات وشاعری، مرتبہ مجتبیٰ حسین، مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبر کراچی، ۱۹۷۰ء

☆ تذکرہ غوثیہ (ملفوظات وحالات)، سید غوث علی شاہ قلندر پانی پتی، تالیف شاہ گل حسن، تزئین وترتیب مولانا محمد اسماعیل میرٹھی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

☆ تنقیدِ غالب کے سو سال، مرتبہ گروپ کیپٹن محمد فیاض، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء

☆ تنہا محمد یحییٰ، مرآۃ الشعراء، جلد اول، عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور، ۳۰ دسمبر ۱۹۴۵ء

☆ تنہا محمد یحییٰ، مرآۃ الشعراء، جلد دوم، تعلیمی پریس لاہور، ۳۰ مارچ ۱۹۵۰ء

☆ جمیل جالبی، ڈاکٹر، نئی تنقید، رائل بک کمپنی صدر کراچی، ۱۹۷۵ء

☆ جیلانی کامران، تنقید کا نیا پس منظر، لاہور، مکتبہ عالیہ، س ن

☆ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، آگرہ عزیزی پریس، ۱۹۵۷ء

☆ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخ اردو، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۴۱ء

☆ حبیب خان، ایم، اردو تنقید کے معمار، علی گڑھ نذیر بک ہاؤس، ۱۹۲۵ء

☆ حسن اختر ملک، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، لاہور، یونیورسٹی بک ایجنسی، ۱۹۷۹ء

☆ حسن وقار گل، ڈاکٹر، اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد، کراچی، جامعہ کراچی، ۱۹۹۹ء

☆ خورشید الاسلام، ڈاکٹر، تنقیدیں، علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۷ء

☆ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے خطوط، پروفیسر سید احتشام حسین کے نام، ادارہ ادب و تنقید لاہور، ۱۹۶۴ء

☆ رشید احمد صدیقی، جدید اردو غزل، علی گڑھ، سرسید بک ڈپو، ۱۹۶۷ء

☆ رضیہ سلطانہ، ڈاکٹر، ڈاکٹر عبدالحق کے تحقیقی کارنامے، ماہنامہ مجلس حیدرآباد دکن، ۱۹۹۰ء

☆ روہیلہ سعود الحسن، رام پور تاریخ و ادب، ابلاغ پبلشرز مین مارکیٹ لاہور

☆ زاہد منیر عامر، ڈاکٹر، چار موسم ایچی سن کالج میں، ملک اینڈ کمپنی اردو بازار لاہور، ۲۰۰۴ء

☆ زور، محی الدین قادری، روح تنقید، لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۵ء

☆ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، معروضات، لاہور، پولیمر پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء

☆ سرسید احمد خان، مکتوبات سرسید، جلد اول، مرتب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۴ء

☆ سروری، عبدالقادر، پروفیسر، جدید اردو شاعری، لاہور، کتاب منزل، ۱۹۴۶ء

☆ سکینہ رام بابو، تاریخ ادب اردو، عشرت پبلشنگ ہاؤس ہسپتال روڈ لاہور، سن ندارد

☆ سلمان ندوی، مکتوباتِ سلیمانی (جلد اول)، سلمان ندوی کے خطوط از عبدالماجد دریا آباد، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۶۳ء

☆ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور، سنگ میل، ۱۹۷۱ء

☆ سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ، دفتر فرہنگ آصفیہ دہلی گلی شاہ تارا دہلی سے شائع ہوئی

☆ سید عبداللہ، ڈاکٹر، چند نئے اور پرانے شاعر، اردو مرکز گپت روڈ لاہور، سن ندارد

☆ سید عبداللہ، ڈاکٹر، سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فکری وفنی جائزہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۰ء

☆ سید عبداللہ، ڈاکٹر، میر امن سے عبدالحق تک، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۵۶ء

☆ سید عبداللہ، ڈاکٹر، شعرائے اردو کے تذکرے، مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۵۲ء

☆ شاہ علی، سید، ڈاکٹر، اردو میں سوانح نگاری، گلڈ پبلشنگ ہاؤس کراچی، ۱۹۶۱ء

☆ شبلی، مکاتیب شبلی، حصہ اول، مرتبہ سید سلمان ندوی، استقلال پریس لاہور، ۱۹۸۹ء

☆ شبلی، مکاتیب شبلی، حصہ اول، مرتبہ سید سلمان ندوی، مطبوعہ معارف اعظم گڑھ، طبع دوم، ۱۹۲۸ء

☆ شبلی، مکاتیب شبلی، حصہ دوم، مرتبہ سید سلمان ندوی، استقلال پریس لاہور، ۱۹۸۹ء

☆ شمس الرحمٰن، اردو خطوط (ادبی حیثیت، تاریخ، تنقید اور تبصرہ)، کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی، ۱۹۴۷ء

☆ صحرانورد کے خطوط، مکتبہ اردو لاہور، جولائی ۱۹۴۰ء

☆ صفیہ اختر، زیر لب (خطوط)، نیا ادارہ سرکلر روڈ لاہور، ۱۹۴۹ء

☆ طیف نثر، مرتبہ ڈاکٹر ممتاز منگلوری، لاہور اکیڈمی لاہور

☆ ظفر علی خان، مکاتیب ظفر علی خان مرتبہ زاہد منیر عامر، سنی پبلی کیشنز اردو بازار لاہور، ۱۹۸۶ء

☆ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جدید شاعری، اردو دنیا کراچی لاہور، ۱۹۶۴ء

☆ عبدالاحد خان، وکیل، ڈاکٹر، اردو غزل کے پچاس سال (حالی تا اکبر) لکھنؤ، ۱۹۶۱ء

☆ عبدالحق، ڈاکٹر، مولوی، چند ہم عصر، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۶ء

☆ عبدالحق، ڈاکٹر، مولوی، مقدمات عبدالحق، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۴ء

☆ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر، افکارِ حالی، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۸۴ء

☆ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر، خطبات عبدالحق، انجمنِ ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۵۲ء

☆ عبداللطیف اعظمی، مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، شبلی اکادمی نزول باغ دہلی، ۱۹۴۵ء

☆ عبداللہ، ڈاکٹر، سید، وجہی سے عبدالحق تک، لاہور، مکتبہ خیابانِ ادب، ۱۹۷۷ء

☆ علی صفدر جعفری، ڈاکٹر، نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ، عذرا پبلی کیشنز ملتان، جنوری ۱۹۹۹ء

☆ عنوان چشتی، ڈاکٹر، اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت، دہلی، ۱۹۷۷ء

☆ فیاض محمود (مدیر خصوصی)، تاریخ ادبیات مسلمان پاکستان وہند، جلد ۸، ۱۹۷۱ء

☆ فیاض محمود (مدیر خصوصی)، تاریخ ادبیات مسلمان پاکستان وہند، (جلد ۱۹۔۷۲۔۱۹) لاہور پنجاب یونیورسٹی

☆ کلیات مولانا ظفر علی خان، ترتیب زاہد علی خان، الفصیل ناشران اردو بازار لاہور، ۲۰۰۷ء

☆ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، امتیاز علی تاج شخصیت وفن، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، ۱۹۹۹ء

☆ گویا دبستان کھل گیا، مرتبہ ہما بیگم، اکادمی پنجاب لاہور، گست ۱۹۵۶ء

☆ گیان چند، ڈاکٹر، مقدمے اور تبصرے، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۰ء

☆ مالک رام دہلوی، تلامذہ غالب، گلوب پبلشرز اردو بازار لاہور

☆ مجیب الاسلام، ڈاکٹر، (دارالترجمہ عثمانیہ کی علمی وادبی خدمات) ناشر مجیب الاسلام، ۱۴۴ کیابیاں سٹریٹ جامع مسجد دہلی

☆ محمد اقبال، کلیات اقبال اردو، اقبال اکادمی لاہور، ۲۰۰۱ء

☆ محمد اکرام شیخ، حیات غالب، فیروز سنز لاہور

☆ محمد اکرام شیخ، موجِ کوثر، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور، ۱۹۷۵ء

☆ محمد اکرم ساہنوی پروفیسر، حالی واکبر شاعری کا خصوصی مطالعہ، علمی کتب خانہ لاہور، سن ندارد

☆ محمد باقر آغا، تاریخ نظم ونثر اردو، آزاد بک ڈپو امرتسر، ۱۹۳۳ء

☆ محمد مصطفےٰ شیفتہ، کلیات شیفتہ، مرتب کلب علی ان فائق مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۵ء

☆ محمد میاں سید، مولانا، پانی پت اور بزرگانِ پانی پت، جمعیتہ پبلشرز وحدت روڈ لاہور، ۲۰۰۰ء

☆ محمود شیرانی، حافظ، پنجاب میں اردو، جلد اول، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۸ء

☆ مسعود حسن رضوی، ادیب، مقدمہ تاریخ زبان اردو، دہلی، طبع اول، ۱۹۴۵ء

☆ معین الدین احمد انصاری، شبلی مکاتیب کی روشنی میں، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، طبع اول، ۱۹۶۵ء

☆ مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد سوم، مظہر محمود شیرانی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۹ء

☆ مقالات عبدالقادر مرتبہ، محمد حنیف شاہد، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۶ء

☆ مقالاتِ یوم حالی، مرتبہ ناصح زاہدی، انجمن احیائے ادب پاکستان لاہور، ۱۹۵۰ء

☆ مکاتیب، حصہ اول، نواب محسن الملک، سید مہدی علی خان بنام وقار الملک مولوی مشتاق حسین، شمسی مشین پریس آگرہ باہتمام بشیر الدین احمد

☆ ممتاز فاخرہ، ڈاکٹر، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء (۷۵۔۱۹۱۴)، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء

☆ نامی انصاری، منشی دیا نرائن نگم، ہندوستانی ادب کے معمار، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، ۱۹۹۹ء

☆ نذیر احمد، مولوی، مجموعہ لیکچرز، مفید عام سٹیم پریس آگرہ

☆ نسیم، عنایت اللہ سوہدروی، ظفر علی خان اور ان کا عہد، اسلامک پبلشنگ ہاؤس لاہور،

☆ وحید قریشی، ڈاکٹر، اردو کا بہترین انشائی ادب، میری لائبریری چوک انارکلی، لاہور، بار اول، ۱۹۶۴ء

☆ وفا راشدی، ڈاکٹر، حیاتِ وحشت، مکتبہ کارواں کچہری روڈ لاہور، ۱۹۸۲ء

رسائل/ جرائد

☆ اردو حالی نمبر، کراچی، اپریل ۱۹۵۲ء

☆ ایشیاء روح مکاتیب، حصہ اول، مرتبہ ساغر نظامی مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ، ۱۹۴۱ء

☆ تہذیب وتحریر، مجتبیٰ حسین، مکتبہ افکار رابن روڈ کراچی، جون ۱۹۵۹ء

☆ رسالہ معیار لکھنؤ، مئی ۱۹۱۰ء

☆ ریاست میسور میں اردو، جلد اول، حصہ (اول ودوم)، مرتبہ ڈاکٹر آمنہ خاتون، مہارانی کالج میسور، ۱۹۶۱ء

☆ زمانہ، کان پور، دسمبر ۱۹۳۵ء، (حالی نمبر)

☆ سویرا ۲۲، حنیف رامے، سیدہ شاہین سویرا آرٹ پریس لاہور

☆ صحیفہ، چونسواں شمارہ، مدیر سید عابد علی عابد، مجلسِ ترقی ادب لاہور، جنوری ۱۹۶۶ء

☆ صحیفہ حالی نمبر، شمارہ ۵۱، مدیر اعلیٰ ڈاکٹر وحید قریشی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۲ء

☆ صحیفہ، لاہور، جنوری ۱۹۷۲ء، (حالی نمبر)

☆ فروغِ اردو، لکھنؤ، فروری ۱۹۵۹ء، (حالی نمبر)

☆ کریسنٹ حالی نمبر، اسلامیہ کالج لاہور، ۱۹۶۹ء

☆ ماہ نو، لاہور، جنوری ۱۹۵۱ء، ۱۹۰۵ء، ۱۹۶۳ء

☆ مخزن، ماہنامہ، لاہور، مئی ۱۹۱۵ء

☆ معارف، علی گڑھ، اپریل ۱۹۳۳ء

☆ نقوش، خطوط نمبر، محمد طفیل، ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۶۸ء

☆ نقوش، شخصیات نمبر ۱، مدیر محمد طفیل، اراہ فروغ اردو مال روڈ لاہور

☆ نقوش، شخصیات نمبر ۲، مدیر محمد طفیل، اراہ فروغ اردو مال روڈ لاہور

☆ نقوش، لاہور، نومبر ۱۹۸۵ء، ستمبر ۱۹۸۱ء

☆ نقوش، مکاتیب نمبر، جلد اول، ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۶۸ء

مقالہ جات (ایم فل/ پی ایچ ڈی سطح)

☆ بدر منیر الدین، ڈاکٹر، اردو تنقید میں حالی شناسی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۰ء

☆ تحریم ظفر، اردو تنقید کی روایت (حالی سے فراق تک)، مقالہ ایم فل، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ۱۹۹۸ء، (غیر مطبوعہ)

☆ تصدیق حسین خالد، ڈاکٹر، حالی بحیثیت شاعر، نقاد سوانح نگار اور اردو ادب پر حالی اثرات، یونیورسٹی آف لندن، ۱۹۳۳ء

☆ حزبی معین احسن، ڈاکٹر، حالی کا سیاسی شعور، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۵۶ء

☆ شجاعت علی سندیلوی، ڈاکٹر، حالی بحیثیت شاعر، لکھنؤ یونیورسٹی، ۱۹۴۰ء

☆ ظفر حسین، ڈاکٹر، سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور، ۱۹۹۰ء

☆ عبدالقیوم، ڈاکٹر، حالی کی اردو نثر نگاری، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۶۴ء

☆ غلام مصطفےٰ خان، ڈاکٹر، حالی کا ذہنی ارتقاء

☆ نذیر بیگم، مقدمہ شعر و شاعری کے انتقاد کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ ایم فل، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ۱۹۹۵ء، (غیر مطبوعہ)

انگریزی کتب

☆ Abdul Latif, Syyed, The Influence of English Literature on Urdu Literature, London, Forstorgroon and Co. Limited, 1924

☆ Abdul Qadir Sheekh, The new school of Urdu literature, Punjab observer press, 1899

☆ Malk Ram, Hali (Makes of Indian Literature) Shalya Acedemi New Delhi, 1982

☆ Muhammad Sadiq, Doctor, A Hisotry of Urdu Literature, Lahore, Oxford University Press, 1964

انٹرویو

محترمہ صغریٰ خاتون بنت خواجہ اخلاق حسین، خواجہ اخلاق حسین مولانا حالؔی کے پوتے تھے۔(خواجہ اخلاق حسین کے نام تین خطوط مکتوباتِ حالؔی حصہ اول میں موجود ہیں۔)

سوال: محترمہ آپ کا مولانا حالؔی کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔

جواب: میں مولانا حالؔی کی پڑپوتی ہوں۔

سوال: محترمہ مولانا حالی ہمہ جہت شخصیت تھے، شاعر، نثر نگار، نقاد، سوانح نگار، مکتوب نگار وغیرہ۔ آپ ان کی کس جہت سے متاثر ہیں؟

جواب: مولانا حالی کی مسدس سے بہت متاثر ہوں جو تاریخ ادب کی منظوم داستان ہے۔ جس میں روانی، شستگی اور اثر آفرینی موجود ہے۔

سوال: مولانا حالی منکسر المزاج، شریف اور خلوص انسان تھے۔ کیا یہ خاندان حالؔی کی امتیازی خصوصیات تھیں؟

جواب: جی ہاں، شرافت، خلوص و محبت اس خاندان کی اہم خوبیاں ہیں۔

سوال: مولانا حالؔی کا کوئی خط، تحریر یا تصویر آپ کے پاس موجود ہے۔

جواب: شیخ اسماعیل پانی پتی کی لکھی ہوئی کتاب "جواہرات حالؔی" ہمارے پاس موجود تھی جو میری عزیزہ پڑھنے لاہور لے گئی ہے۔ کوئی خط یا تحریر نہیں ہے۔

سوال: خاندان حالؔی پاکستان میں کہاں کہاں مقیم ہے؟

جواب: سرگودھا، اسلام آباد، لاہور، ساہیوال اور کراچی میں خاندان حالؔی کے افراد مقیم ہیں۔

آپ کا بہت شکریہ۔(انٹرویو ۱۱ مئی ۲۰۱۱ء کو اسلام آباد میں لیا گیا۔)

ملاقاتیں

☆ ڈاکٹر صدیق جاوید گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، ۱۰ فروری ۲۰۱۰ء

☆ خواجہ شاہد حسین/محترمہ عذرا افضال ایڈوکیٹ مقیم سرگودھا (خاندانِ حالی) ۶ مارچ ۲۰۱۱ء

☆ ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، متعدد بار

☆ جناب عمیر عثمانی صاحب، اسلام آباد، ۱ مئی ۲۰۱۱ء

☆ ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا (جون ۲۰۱۲ء، نمل یونیورسٹی اسلام آباد تشریف لائے تھے)

ٹیلیفونک گفتگو

☆ ڈاکٹر جمیل جالبی، کراچی، ۳۔ جون ۲۰۱۰ء

☆ ڈاکٹر زاہد منیر عامر، لاہور، جنوری ۲۰۱۱ء

☆ ڈاکٹر طارق ہاشمی، جون ۲۰۱۱ء

☆ ڈاکٹر معین الدین عقیل، کراچی، اگست ۲۰۱۰ء

اشاریہ

شخصیات

اجمل خان، حکیم: ۷۹
احسن اللہ ثاقب، حکیم: ۴۷، ۹۷
احمد بابا مخدومی: ۱۸۴
اسلام النساء: ۴۷، ۴۸، ۵۵
اسلم سیفی: ۸۳
اسماعیل میرٹھی: ۸۳
افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر: ۷۰
افتخار عالم مارہروی، سید: ۲۶۸، ۲۷۰، ۲۸۱
اقبال: ۹۳، ۱۰۶، ۱۹۱
اکبر علی اکبر آبادی، سید: ۱۷۲
امام بخش صہبائی: ۱۰۲
امام محمد تقی: ۸۹
امام موسیٰ رضا: ۸۹
امتیاز علی تاج: ۲۰۰
امیر خسرو: ۸۴
امیر مینائی: ۷، ۱۷، ۱۰۶، ۱۸۴، ۱۸۹، ۲۳۲
امین زبیری: ۱۴
اچ آر تیموری، ڈاکٹر: ۲۰۹
اینڈ رو یوز، سی ایف: ۱۹۵، ۱۹۸
اے ایچ کوثر، ڈاکٹر: ۱۹۷
آرنلڈ: ۹۵
آزاد، ابوالکلام: ۷
آزاد، ابوالکلام: ۲۲۹
آزاد، محمد حسین: ۷، ۱۲، ۱۳، ۲۹، ۴۳، ۴۴، ۴۸، ۸۲، ۱۰۱، ۱۰۲، ۲۱۱
آزردہ: ۵۴
آسمان جاہ: ۴۸، ۵۲
آق خواجہ ملک محمود شاہ: ۴۰
برق، غلام جیلانی: ۷
برکت علی خان بہادر: ۵۹
بشیر الدین، مولوی: ۲۶۰، ۲۶۳، ۲۷۶، ۲۷۷
بشیر حیدر: ۹۲
بلبن، عنایت الدین: ۴۰
بہادر شاہ ظفر: ۱۰۵
بیدل، عبدالرحیم: ۲۰۶
پریم چند: ۲۱۹، ۲۳۱
پیارے لال: ۹۵، ۲۲۸
تاثیر، محمد دین: ۷
تصدق حسین: ۵۰، ۱۶۶
تنہا، محمد یحیٰ: ۸۴، ۱۰۸، ۱۷۲، ۲۱۸، ۲۱۹

ثناءاللہ:۹۴
جاوید اقبال، سید:۱۷
جعفر علی، سید:۴۰
جمیل الدین صدیقی:۱۸۰، ۱۸۴
جمیل جالبی، ڈاکٹر:۱۴۳، ۱۶۱
جنرل عظیم الدین:۱۱۰
جوش ملیسانی:۱۰۶
چراغ علی:۸۴، ۸۶، ۸۷
حافظ بقااللہ:۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶
حالی، الطاف حسین: ۷، ۸، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۳۰، ۳۲، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۴، ۴۵، ۴۷، ۵۰، ۵۱، ۵۳، ۵۷، ۶۰، ۶۴، ۶۶، ۸۰، ۸۳، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۱، ۹۲، ۹۷، ۱۰۴، ۱۰۸، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۴، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۷، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۵۱، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۶، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۸۲، ۱۸۵، ۱۸۸، ۱۹۴، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۳، ۲۲۷، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۴، ۲۳۸، ۲۴۱، ۲۵۳، ۲۵۶، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰
حامد حسن، قادری:۲۴، ۲۳۴
حامدی کشمیری: ڈاکٹر:۱۵۵
حبیب الرحمٰن شروانی:۳۰، ۱۳۲، ۱۷۲، ۱۸۷، ۱۸۸
حسرت موہانی:۲۲۹
حسن بلگرامی سید، مولوی:۲۷۰
حسن رضا:۹۵
حسن علی، سید:۲۶۱
حسن نظامی:۱۸۲
حضرت ابوایوب انصاری:۴۰
حفیظ جالندھری:۶۳
حفیظ جونپوری:۱۸۷
حکیم محمود خان:۲۲۴
حمید احمد خان، پروفیسر:۶۳، ۱۲۴، ۱۳۴، ۱۳۹، ۱۴۱
حمید الدین:۱۷۳
خلیق انجم، ڈاکٹر:۱۱۷
خلیل الرحمٰن داؤدی:۴۵، ۶۸
خواجہ امداد حسین:۳۸، ۴۲، ۴۴
خواجہ ایزد بخش:۳۷، ۳۹، ۴۰، ۴۱

خواجہ سجاد حسین: ۱۹، ۲۰، ۵۱، ۵۵، ۵۶، ۵۸، ۹۱،
۲۷۲،۱۶۷
خواجہ عبداللہ انصاری، شیخ الاسلام: ۴۰
خواجہ عبدالولی: ۶۱
خواجہ غلام الثقلین: ۴۲، ۶۰، ۲۱۸
خواجہ غلام السبطین: ۶۰
خواجہ غلام السیدین: ۴۲
خواجہ لطیف احمد: ۹۵
خواجہ محمد علی، حکیم: ۴۲
خواجہ ملک علی: ۴۰
خوشی محمد ناظر: ۱۹۴
داغ دہلوی: ۵۴، ۱۰۵، ۱۰۸، ۱۷۹، ۱۸۱، ۲۰۳، ۲۰۶،
۲۳۲
دبیر سلامت علی: ۹۵
ذوق، محمد ابراہیم: ۵۴
راجہ ارجن: ۳۹
رحمت اللہ رعد: ۹۹، ۱۰۱
رشید احمد صدیقی: ۷
رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر: ۲۰۴
رفیق خاور: ۱۲۶
روہیلہ سعود الحسن: ۱۸۵
زاہد منیر عامر، ڈاکٹر: ۲۰۱
زین الدین: ۸۹
سبحان بخش شکارپوری: ۲۴۹
سجاد دہلوی سید: ۱۹۶، ۲۱۹
سجاد ظہیر: ۷
سراج الدین مولوی، ۱۲
سراج الدین، مولوی: ۲۰۹
سرسید: ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۵، ۲۱، ۲۲، ۳۰، ۳۱، ۳۸، ۵۳،
۵۵، ۵۹، ۶۹، ۸۶، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۱۱۰،
۱۳۱، ۱۳۲، ۱۴۱، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۹، ۱۶۲،
۱۶۷، ۱۷۱، ۱۹۹، ۲۰۷، ۲۳۲
سرور رجب علی بیگ: ۹۵
سری رام، لالہ: ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۲۰۶
سعد اکبر عثمانی: ۱۲۴
سکسینہ، رام بابو: ۸۴، ۹۵، ۱۹۰
سلمان ندوی: ۱۹۰، ۱۹۱
سلمان ندوی: ۴، ۷
سلیم وحید الدین: ۶۹، ۱۹۷
سید احمد دہلوی: ۱۰۶، ۱۸۹

سید امام الدین: ۱۷۳
سید حسن، میجر: ۶۰
سید میر حسن: ۹۲
سیوطی، جلال الدین: ۱۲۴
شاعر، دہلوی، آغا: ۴۷، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۲
شاہ علی سید، ڈاکٹر: ۱۵۶
شاہد احمد دہلوی: ۱۷۹
شبلی نعمانی: ۷، ۱۰، ۱۴، ۲۲، ۲۵، ۶۲، ۹۱، ۱۵۶، ۱۷۱،
۱۷۲، ۲۱۹، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۶، ۲۰۷، ۲۰۵
شجاعت علی سندیلوی: ۲۱، ۱۱۶، ۱۲۸، ۱۴۴، ۱۵۲
شرر، عبدالحلیم: ۱۳۳، ۱۳۴، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۷
شیخ سعدی: ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۵۲
شیفتہ، محمد مصطفےٰ: ۲۰، ۲۱، ۳۷، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۵۴،
۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۳
شیلے: ۸، ۹
شین قاف، نظام: ۱۳۵
صادق قریشی: ۱۱۷
صالحہ عابد حسین: ۲۰، ۲۴، ۲۶، ۱۲۵، ۱۲۸، ۱۲۹
صباالدین عبدالرحمٰن، سید: ۱۹۲
صدرالدین، مفتی: ۱۰۲
صغریٰ ہمایوں مرزا: ۵۹، ۶۰
صفیہ اختر: ۷، ۸
صہبائی: ۵۴
ضیاءالدین دہلوی: ۲۴۹
طاہر نبیرہ آزاد: ۲۱۳
ظفر علی خان: ۴۸، ۷۲، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۳۷
عابد حسین، ڈاکٹر: ۳۲
عبادت بریلوی، ڈاکٹر: ۸، ۱۳۲، ۱۸۰، ۱۸۱
عبدالحق مولوی: ۲، ۵، ۱۱، ۲۰، ۳۹، ۴۷، ۸۶، ۹۴،
۹۸، ۹۹، ۱۰۱، ۱۱۰، ۱۶۲، ۱۷۲، ۱۷۴، ۱۸۱، ۱۹۴،
۲۰۳، ۲۶۲
عبدالرحمٰن پانی پتی: ۶۸
عبدالرحیم بیگ: ۸۱، ۸۲
عبدالرحیم، مولوی: ۲۵۲
عبدالرزاق کانپوری: ۲۶، ۶۱، ۱۰۰، ۱۰۳، ۱۵۳،
۱۹۸، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۱۴، ۲۳۴
عبدالغفار قاضی: ۷
عبدالغفور: ۹۳
عبدالغنی: ۱۸۷
عبدالغنی، شاہ: ۲۳

عبدالقادر شیخ: ۹۲، ۹۴، ۱۸۱، ۱۳۰

عبدالقدیر بدایونی: ۱۸۲

عبدالقیوم، ڈاکٹر: ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۱۴۰، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۳، ۱۶۱، ۱۷۰، ۱۷۱

عبداللہ سید، ڈاکٹر: ۴، ۱۸، ۲۵، ۶۹، ۱۳۱، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۵، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۹۰

عبدالماجد دریا آبادی: ۷

عبدالماجد: ۱۵

عبدالمغنی، پروفیسر: ۱۲۰

عرشی، امتیاز علی: ۱۷

عزیز مرزا: ۷۰، ۹۸، ۹۹، ۱۹۴

علوی: ۵۴

علی سردار جعفری: ۷

عمادالدین، پادری: ۶۳

عنایت اللہ: ۱۹۷

عنایت اللہ، مولوی: ۱۱، ۱۹

غالب اسداللہ خان: ۲، ۵، ۶، ۷، ۱۸، ۲۱، ۲۹، ۳۱، ۳۷، ۴۵، ۴۷، ۵۴، ۸۰، ۸۲، ۹۵، ۱۰۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۱، ۱۲۳، ۱۵۴، ۱۸۱، ۲۲۴، ۲۲۷، ۲۶۶

غلام پنجتن: ۸۴

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر: ۱۲۸

غوث علی پانی پتی: ۸۳

فضل الٰہی شیخ: ۹۵

فیض الحسن سہانپوری: ۴۴

قاری ممتاز علی: ۴۰

قلندر علی: ۹۵

قلندر علی، مولوی: ۴۵

قلندر، بوعلی شاہ: ۳۹، ۶۲

قمر علی مولوی: ۲۶۰، ۲۷۹

کرنل ہالرائیڈ: ۶۷

کریم بخش: ۴۳

کلب علی خان: ۲۳۲

گل حسن شاہ: ۱۸۳

گوہر نوشاہی، ڈاکٹر: ۱۹۹، ۲۰۰

لیفٹیننٹ گورنر میور، ۱۰۳

ماسٹر رام چندر: ۱۰۲، ۱۹۰

مالک رام: ۱۶، ۶۷، ۱۸۷، ۱۸۹، ۲۲۳

مجدد الف ثانی: ۲، ۲۱۷

مجروح: ۵۴

مجیب الرحمان شامی: ۲۰۲

محبّ اللہ: ۴۵
محبوب علی: ۸۷
محسن الملک: ۹۱، ۲۰۱، ۱۰۸، ۲۳۳
محسن کاکوروی: ۱۸۶
محمد اسماعیل شیخ پانی پتی: ۱۸، ۱۹، ۴۱، ۷۰، ۸۹، ۲۱۷، ۲۲۷
محمد اکرام شیخ: ۲۲۵
محمد باقر آغا: ۹۴، ۲۱۱
محمد باقر، مولوی: ۲۱۱
محمد بخش: ۸۵
محمد تقی بیگ: ۹۵
محمد شریف، حکیم: ۲۹۰
محمد صدیق خان، سید: ۶۳
محمد علی جناح، قائداعظم: ۳۰۲
محمد علی جوہر: ۲۱۴، ۲۱۵
محمد علی جوہر: ۷
محمد علی رولوی: ۷
محمد علی مہمان: ۲۱۶، ۲۵۵، ۲۷۳
محمد علی نقی، مولوی: ۹۵
محمد متقی، سید: ۸۹، ۹۲
محمد یعقوب مجددی: ۱۸، ۹۲، ۲۱۷
مرتضی حسین فاضل: ۴۱
مرزا سلطان: ۱۰۵
مسٹر سموئیل: ۱۸۸
ممتاز حسین، پروفیسر: ۱۲۵، ۱۵۴
ممتاز علی سید، مولوی: ۱۹۹، ۲۰۰
مملوک علی، مولانا: ۱۰۲
ممنون: ۵۴
منٹو، سعادت حسن: ۸
منشی محبوب عالم: ۲۶، ۱۷۲، ۲۰۹
منشی محمود احمد عباسی: ۱۵۹
منشی مظفر علی سید: ۱۸۵
منشی نجم الدین: ۲۶۴
مومن خان مومن: ۵۴
مہدی آفادی: ۷، ۱۵، ۱۹۱، ۲۰۸
مہدی حسن: ۱۵
میر انیس: ۹۵
میر محبوب علی: ۳۸، ۵۹
میر باقر علی: ۳۷، ۴۲
مینائی، کرم محمد: ۱۸۴

ناسخ امام بخش:۹۵
ناصر علی میر دہلوی:۱۶
نامی، انصاری:۲۳۱
نذیر احمد: ۷، ۱۰، ۱۳، ۱۳، ۴۳، ۹۱، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۶۱، ۱۶۷، ۱۹۵، ۱۹۷، ۲۳۵، ۲۶۹
نذیر احمد، پروفیسر:۱۳۵
نصیرالدین حیدر:۹۵
نظیر صدیقی:۷
نقش بند:۲۷
نواب اسحاق خان:۹۵
نواب ضیاءالدین:۴۷
نوازش علی مولوی:۴۳، ۴۴
نیر رخشاں:۴۷، ۵۴
نیرنگ، غلام بھیک:۹۵
نگم، دیا نرائن:۲۸، ۵۹، ۹۶، ۲۲۹، ۲۳۰
وجاہت حسین جھنجھانوی:۲۳۹
وجیہہ النساء:۴۲
وحشت کلکتوی:۱۲۱، ۱۲۷، ۲۳۵، ۲۶۵، ۲۸۰
وحید قریشی، ڈاکٹر:۵۱، ۹۳
وفا راشدی:۲۲۷
وقار الملک: ۹۱، ۲۰۵، ۱۶۰، ۱۸۴، ۲۳۵، ۲۵۹، ۲۷۵
ولائت صفی پوری:۱۶۹
ہمایوں مرزا:۵۹
یحییٰ منیری:۲
یلدرم سجاد حیدر:۱۹۴
ذکا اللہ، مولوی: ۱۱، ۴۳، ۱۰۲، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۸، ۲۱۹، ۲۷۱، ۲۸۴

کتب

اتالیق پنجاب:۲۷
اردو خطوط:۱۰، ۱۲
اردو معلےٰ:۲، ۷۹
ارشاد السلطان:۱۸۵
ارمان:۱۸۲
ارمغانِ حالی:۳۱، ۶۳
اصولِ فارسی:۵۰
افکارِ حالی:۱۶۳
البرامکہ:۷۹، ۱۹۸، ۲۰۷
العصر:۷۹، ۲۱۹

الفاروق ۲۷،۱۹۳
المامون:۹۷
انتخاب یادگار:۱۸٦
انشائے ہنر افروز:۲
انشائے سرور:۲
آیاتِ بینات:۲۳۴
بہارستان:۲۰۲
پنجاب ایویو:۹۸
تاریخ امروہیہ:۲۲۳
تاریخ خلافت:۲۰٦
تاریخ علم الکلام:۷۹
تاریخ فرشتہ:۷۹
تاریخ محمدی:٦٦
تحقیق الایمان:٦٦
تحقیق انساب:۲۲۳
تذکرہ رحمانیہ:٦۸
تذکرہ غوثیہ:۸۳
تذکرۃ الانبیاء:۲۰۰
تذکرۃ الحفاظ:۷۹
ترانہ وحشت:۲۳۹
تریاقِ مسموم:٦۳
تزک جہانگیری:۷۹
تصویر عالم:۱۰۰
تلامذہ غالب:۳۹، ۴۷
تہذیب الاخلاق: ۸۷
تہذیب نسواں:۱۹۹
تیرنگ خیال:۲۱۳
تیرونشتر:۱۸۲
جوہرِ انتخاب:۱۸٦
چند ہم عصر:۸٦،۹۹
حقوقِ نسواں:۲۰۰
حورِ جنت:۱۸۲
حیات النذیر:۱۰۱،۱۰۴،۲۸۱،۲۸۳
حیات جاوید:۳۸،۵۵،٦۹،۹۱،۱۴۱
حیات سعدی:٦۷،۱۵۲،۱۵۳،۱۵۹
خطوط عبدالحق:۲۰۴
خطوط ماجدی،۷
خم خانہ جاوید:۹۵،۹۴
خیالستان:۲۰۲
دربارِ اکبری:۲۱۳

دستہ گل:۲۲،۲۷

دیوانِ حالی:۷۰

دیوانِ ذوق:۲۱۳

دیوانِ نشاط:۷۹

دیوانِ وحشت:۲۳۹،۲۶۵

ذکر شاہ:۱۱

ذوالقرنین:۷۹

رسالہ اتحاد:۷۹،۲۰۵

رسالہ آفتاب:۷۹

رقعات عنائت علی:۲

رقعاتِ عبدالحق:۲۰۴

زمانہ:۸،۲۹،۵۹،۸۲،۸۹،۲۰۵

زوال بغداد:۲۰۶

زیر لب:۸

سفر نامہ روم و شام و مصر:۷۹

سوانح حکیم ناصر خسرو:۶۷

سوانح مولانا روم ۲۷،۱۹۳

سیاحت نامہ یورپ:۹۴

سیرالمصنفین:۲۲۰

سیرت النعمان ۲۷،۱۹۳

شاعرانہ خیالات:۲۲۰،۷۹

شواہد الالہام:۶۷

علاج الامراض:۲۹۰

علماء سلف:۱۸۸

عود ہندی:۲

فردوس بریں:۲۰۶

فرہنگِ آصفیہ:۱۸۹،۲۷۰،۲۷۵

فریادِ داغ:۱۰۸،۱۰۹

قتل بے نظیر:۱۸۲

قرآن السعدین:۸۱،۸۴

قرآن مجید:۱۸۲

کامریڈ:۲۱۴

کلیات نثر حالی،جلد اول دوم:۷۰

کلیات نظم حالی،جلد اول و دوم:۷۱

گویا دبستاں کھل گیا:۷

مبادی علم جیالوجی:۵۰،۶۵

مجالس النساء:۶۶

مخزن:۹۳،۹۴،۹۷

مسدس حالی: ۳۸، ۸۹، ۹۰، ۱۱٦، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۸، ۱۳۹

مشاہیر کے خطوط: ۸

مضامین حالی: ٦۹

معارف: ۱۱۰

معراۃ الشعر: ۷۹، ۲۱۹

معرکہ مذہب و سائنس، ۷۹، ۲۰۲

معین الدین چشتی: ۲۰٦

مقام خلافت: ۹۵

مقدماتِ عبدالحق: ۲۰۴

مقدمہ دیوانِ حالی: ٦۸، ۱۳۰، ۱۴۴

مکاتیب جمیل: ۷

مکاتیب حالی: ۲۲، ۲۳، ۷۰، ۱۷۲

مکاتیب ظفر علی خان: ۷

مکاتیبِ شبلی: ۱۴

مکاتیبِ مہدی: ۱٦

مکتوبات حالی (حصہ دوم) ۲۵

مکتوبات حالی (حصہ اول): ۱۸، ۷۵

مکتوبات سعد الدین: ۷

مکتوباتِ سرسید ۸۸

موازنہ انیس و دبیر: ۹۷

موعظہ حسنہ: ۱۳

مولودِ شریف: ٦۴

مہتاب داغ: ۱۰۸

ناسخ التواریخ: ۷۹

نقوش زنداں، ۷

نگارستان: ۲۰۲

نور تجلی: ۱۱

ہدایت السلطان: ۱۸۵

ہدیہ مہمان: ۲۱۷

ہمدرد: ۲۱۵

یاد ایام: ۱۰۰، ۲۰۷

یادگارِ داغ: ۹۵، ۱۰۸

یادگارِ غالب: ۳۸، ٦۸، ۱۲۸، ۱٦۹

مقامات

اعظم گڑھ: ۱۹۱

امرتسر: ۱۸۴

امروہہ: ۲۲۱، ۲۴۹

انگلستان: ۱۲

ایران: ۲، ۶۱

آگرہ: ۲۲۴، ۲۵۱

بجنور: ۱۰۱، ۲۱۴

بریلی: ۲۲۱

بو پھال: ۱۰۵

بہاولپور: ۱۷

بیت المقدس: ۲۱۹

پانی پت: ۱۹، ۳۷، ۳۸، ۴۸، ۴۹، ۵۲، ۶۰، ۱۰۹، ۲۵۰

پٹنہ: ۵۹، ۱۰۴، ۱۹۰

پٹیالہ: ۲۰۱

ترکی: ۶۱

جہانگیر آباد: ۲۱، ۴۶، ۱۰۹

حصار: ۳۸، ۴۵

حیدر آباد دکن: ۳۸، ۴۸، ۵۵، ۱۱۱، ۱۸۶، ۲۰۵، ۲۰۷، ۲۰۸،

دہلی: ۳۸، ۳۹، ۴۲، ۴۵، ۱۰۲، ۱۹۰، ۲۱۱، ۱۲۸

رام پور: ۱۸۵

راولپنڈی: ۱۱، ۶۸

سیالکوٹ: ۹۲، ۲۱۱

شملہ: ۱۹۰، ۲۳۴

علی گڑھ: ۱۴، ۱۹، ۲۲، ۳۷، ۵۵، ۶۱، ۸۴، ۸۶، ۹۰، ۹۱، ۱۰۴، ۱۳۳، ۱۸۷، ۱۹۳، ۲۰۰، ۲۱۳، ۲۱۹، ۲۵۱، ۲۵۲

قصور: ۹۲

کانپور: ۲۸، ۱۰۵، ۱۲۹

کراچی: ۲۸، ۶۰، ۲۲۲

کرنال: ۳۹

کلکتہ: ۱۰۴، ۱۸۰، ۲۲۷، ۲۳۸

گجرات: ۱۰۳

گوجرانوالہ: ۲۰۹

لاہور: ۱۹، ۳۷، ۳۸، ۴۹، ۶۶، ۶۸، ۷۰، ۹۲، ۱۲۶، ۱۳۲، ۱۴۳، ۱۹۰، ۱۹۹، ۲۱۰، ۲۱۲، ۲۱۸، ۲۳۹، ۲۷۳، ۲۸۲، ۲۹۹

لکھنؤ: ۱۰۶، ۱۸۴، ۱۸۵، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۲۱، ۲۲۴، ۲۵۵

لندن:۹۴

مظفر گڑھ:۲۳۹

میرٹھ:۸۲،۸۳،۲۰۳،۲۳۵

وزیر آباد:۲۰۱